WWW.PAKSOCIETY.COM
کوئی جگنو ہو
انجم انصار
SCANNED BY WAQAR AZEEM PAKISTANIPOINT

انتساب

اپنے پیارے بھائیوں کے نام

- احمد ندیم صدیقی (اسلام آباد)
- احمد نعیم صدیقی (کینیڈا)
- سہیل انصار (اسلام آباد)
- سلیم انصار (آسٹریلیا)

معیاری اور خوبصورت کتابیں

بااہتمام...... محمد علی قریشی

باراول ——— 2004ء
مطبع ——— نیر اسد پریس
سرورق ——— ذاکر
کمپوزنگ ——— وسیم احمد قریشی
قیمت ——— -/200روپے

احوالِ واقعی!

عزیز قارئین کرام...... السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

اپنی دسویں کتاب کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ میرے بکھرے ہوئے افسانوں کو میرے قارئین نے سمیٹ کر مجھ تک پہنچایا اور اصرار کیا کہ اسے کتابی صورت میں لایا جائے۔ اس ضمن میں شہلا نواز، چاند بی بی، ارم پروین اور ملیحہ نیازی کی خاص طور پر ممنون ہوں۔

میرے یہ افسانے کیسے ہیں......؟ مجھے میاں مٹھو بننے سے سخت چڑ ہے اس لئے اپنے افسانوں کے بارے میں کیا رائے دوں۔ آپ پڑھیں گے تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔

میں نے ہمیشہ کی طرح اپنی اس کتاب میں بھی نامی گرامی افسانہ نگاروں کی بھاری بھرکم تعریفی آراء کے پوسٹر نہیں سجائے ہیں۔ میرا یہ یقین ہے کہ اچھی یا بری تحریر اپنا آپ از خود کہہ دیتی ہے اور یوں بھی میرے اصلی ناقد تو میرے اپنے قارئین ہیں۔

برادرم محمد علی قریشی اس کتاب کے پبلشر ہیں۔ آپ میری دیگر کتابیں بھی انشاء اللہ اسی ادارے سے حاصل کرتے رہیں گے۔ پبلشر کی معرفت اپنی رائے پہلی فرصت میں ارسال کیجئے گا۔

والسلام
خلوصِ کار
آپ کی اپنی بہن
انجم انصار

فہرست

اک ذراسی بات پر

رات گہری اور تاریک تھی۔

دو نقاب پوش باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر آئے۔

ان کے قدم آہستہ آہستہ ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھے۔ گرل کا دروازہ ایک چابی کے گھمانے سے ہی کھل گیا۔

سارا گھر بے خبر سو رہا تھا۔

وہ چوکنا انداز میں بڑھے...... الماری' سامان یا تجوری کی جانب انھوں نے قدم بھی نہیں بڑھایا۔ وہ ہر کمرے میں یوں دیکھ رہے تھے جیسے کسی خاص چیز کی تلاش میں آئے ہوں۔

''مل گئی۔'' ایک نقاب پوش آہستگی سے بڑبڑایا۔

''مگر کہاں؟'' دوسرے نے تجسس سے پوچھا۔

''سائیڈ روم میں ہے۔'' پہلے کے لہجے سے خوشی کا عنصر کھلا پڑ رہا تھا۔

''وہاں اور کون ہے؟'' دوسرے نقاب پوش کا انداز احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

''ایک بڑھیا ہے' شاید اس کی نانی ہوگی یا دادی۔''

''تم نے دیکھ لیا نا کہ وہ...... وہی ہے۔''

''ہاں' وہ...... وہی ہے۔''

''مگر دیکھو' کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے' یہ ہدایات صاحب نے چلتے وقت بھی دی تھیں۔''

''آپ گاڑی میں جا کر بیٹھیے' میں اسے لاتا ہوں۔''

پھر نقاب پوش کے قدم آہستگی سے کمرے کی طرف بڑھے۔ کلورو فارم والا رومال سوئی ہوئی لڑکی کی ناک پر رکھا۔ وہ کسمسائی۔ مگر اس نے اپنا ہاتھ دبائے رکھا۔ چند ہی منٹ میں وہ بے ہوش ہوگئی۔ وہ اسے آہستگی سے کمر پر لاد کر کھلے گیٹ سے گاڑی تک آگیا۔

دوسرے نقاب پوش نے لڑکی کو پچھلی سیٹ پر لٹانے کے بعد گیٹ کا دروازہ یوں برابر کر دیا' جیسے وہاں کوئی آیا ہی نہ تھا۔

رات بدستور گہری تھی۔ اس کارروائی میں بہ مشکل بیس منٹ صرف ہوئے تھے۔

مزید پچیس منٹ کے بعد ان کی ہنڈا اکارڈ ایک عالیشان مکان میں داخل ہو چکی تھی۔

''کام ہو گیا صاب۔'' پہلا نقاب پوش فون پر کامیابی کی اطلاع دے رہا تھا۔

''لڑکی پریشان تو نہیں ہوئی؟'' لہجے میں خاصی فکر مندی تھی۔

''نہیں صاب' اسے تو پتہ بھی نہیں چلا' وہ بے ہوش ہے۔''

''ٹھیک ہے' اسے بستر پر لٹا دو۔ اور تم لوگ جاؤ۔ چوکیدار سے کہنا کہ بدستور گیٹ پر رہے......اور فردوسی بُوا' لڑکی کے پاس لیٹ جائیں۔''

''جو حکم سرکار کا۔'' نقاب پوش نے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھا اور جلدی جلدی باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی پریشان کن تھی۔ زہبی نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک عالیشان کمرے میں پایا۔ محرابی دروازے' آبنوسی سنگھار میز...... چھت پر بیش قیمت فانوس' کھڑکیوں پر جھالردار پردے۔

'اُف خدایا! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔' اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

مگر پھر وہی منظر تھا۔ صبح ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ ایک کھڑکی سے پردہ ہٹ گیا تھا۔ وہاں سے دھوپ خوب چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

''یا اللہ' میں کہاں ہوں'۔ زہبی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

خوب صورت مسہری جس پر وہ رات بھر سوئی تھی' وہ بڑی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

'میں تو نانی اماں کے کمرے میں سوئی تھی' پھر یہاں کیسے آ گئی'۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ 'مجھے یہاں کون لے آیا؟'

یہ سوال ایک خوف بن کر اس کے خون میں گردش کر رہا تھا۔ ابھی' وہ سوچوں کے سمندر میں گم تھی کہ دروازہ ایک چرچراہٹ سے کھلا۔

مارے خوف کے' اس کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ آنے والی فردوسی بُوا تھیں۔

''بیٹی تم منہ ہاتھ دھو لو' میں تمہارے لیے ناشتہ لے آؤں۔''

''مگر میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' یکبارگی کے آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی

بہہ نکلے۔

''یہ تو میں خود نہیں جانتی۔'' فردوسی بُوا نے سادگی سے بتایا۔ ''ہاں' مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ تم اپنوں میں سے ہو۔''

''یہ کیسے میرے اپنے ہیں' جو رات کی تاریکی میں میرے گھر سے مجھے اُٹھا لائے۔'' وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں' ابھی صاحب آنے والے ہیں۔ آپ ان کے آنے سے پہلے ناشتا کر لیں۔''

''تمہارے صاحب کون ہیں؟'' مارے خوف کے زہبی کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا۔

''میرے خیال سے آپ انھیں جانتی ہیں۔'' فردوسی بُوا کے جھرّیوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میں کسی کو نہیں جانتی' میرا کسی سے کوئی ناتا نہیں ہے۔ یہ بہتان ہے سراسر۔'' آنسوؤں کا ریلا اس کی آنکھوں سے اُمڈ پڑا۔

''بیٹی تم ناشتا تو کر لو' خواہ مخواہ رو رہی ہو۔ صاحب کو دیکھو گی تو سب رونا بھول جاؤ گی۔'' فردوسی بُوا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ مر جاؤں گی مگر اپنے پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

''صاحب بھی شریف آدمی ہے' ایسا ویسا آدمی نہیں ہے۔ تم بے فکر رہو۔''

''لچا' لفنگا' بدمعاش...... اسے تم شریف آدمی کہتی ہو' جو رات کی تاریکی میں لڑکیاں اٹھاتا پھرتا ہے۔ ایسے مرد دھرتی پر بھی بوجھ ہوتے ہیں۔ ایسے کام کرتے ہوئے نہ جانے وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایسا ناروا سلوک قدرت ان کی ماں' بہن اور بیٹی کے ساتھ بھی کر سکتی ہے۔''

''بیٹی! تم ناشتا کر لو...... صاحب آنے ہی والے ہوں گے۔'' فردوسی بُوا نے اس کی باتوں سے اکتا کر وہی رٹا رٹایا جملہ دُہرایا۔

''اچھا صرف ایک کپ چائے دے دو۔''

سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا اور ابھی صاحب کو بھی دیکھنا تھا جن کی آمد کا سنتے ہی زہبی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

'خدایا' زمین پھٹ جائے' اور میں اس میں سما جاؤں۔ یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا' چائے کا کپ' صرف اپنے آپ میں ہمت پیدا کرنے کے لیے پیا تھا۔ ورنہ سوائے زہر

کے کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"بیٹی! انڈا' توس' پراٹھے کچھ تو لے لو۔" فردوسی بُوا لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی اس کے پاس دھکیلتے ہوئے لائیں۔

"آپ یقین کیجیے' میرا دل' کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا۔"

"صاحب کو معلوم ہوگا' تو وہ مجھ پر ناراض ہوں گے۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔

"تم کہہ دینا...... کہ لڑکی اچھی نہیں ہے' آپ اسے گولی مار دیں۔" زیبی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"خدا نہ کرے بی بی...... خدا آپ کو سلامت رکھے۔"

"مت کوسو مجھے...... ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔" وہ اپنا نچلا لب کاٹ کر بولی۔

تب ہی گاڑی کی آواز لگاتار ہارن کے ساتھ سنائی دی۔

زیبی کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

فردوسی بُوا باہر لپکیں۔

زیبی دوپٹہ اپنے گرد لپیٹ کر سر جھکا کر بیٹھ گئی...... دل میں درود شریف پڑھ رہی تھی مگر دانت خوف سے بج رہے تھے اور انجانے اندیشوں سے ہونٹوں کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔

تب ہی سلیمان کمرے میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم!" ایک بھاری مگر شوخ سی آواز گونجی۔

زیبی سر نہوڑائے بیٹھی رہی...... ہونٹوں کے ساتھ اب ٹانگیں بھی لرزنا شروع ہوگئی تھیں۔

"بُرا مت مانیے گا' بھابی جان' مگر مجھے ایسا کرنا پڑا۔"

"بھابی جان!" زیبی نے دُہرایا اور حیرت سے آنے والے کو پہلی دفعہ سر اٹھا کر دیکھا۔

چھ فٹ کا انتہائی خوب صورت شخص' آف وہائٹ شلوار قمیض پہنے کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔

"ہاں' میں آپ کا دیور ہوں' سلیمان۔ اجنبی نہیں ہوں۔ رحمان بھائی جان کو بے وقوف بنا کر آپ نے خوب لوٹا۔ کورٹ سے نکاح کے باوجود اپنے گھر بیٹھی رہیں۔ جب دیکھا کہ بھائی جان کی خاصی دولت ٹھکانے لگا دی ہے تو رخصتی سے انکار کر دیا کہ آپ کا عیار باپ رحمان کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" زیبی غصے سے چیخ پڑی۔

"جھوٹ سچ کی قلعی تو ابھی کھل جائے گی۔ میرے پیارے بھائی جان آپ کے عشق

میں بیمار پڑ گئے مگر آپ انھیں دیکھنے تک نہیں آئیں۔ کیسی بیوی ہیں آپ...... آپ شاید اُن بے غیرت عورتوں میں سے ہیں جو اپنے حسن کو ساری زندگی کیش کرنے کے سوا کوئی کام نہیں کرتیں۔"

خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔' زیبی اپنے ہاتھوں سے سر تھام کر چیخ پڑی۔

"حسین جادوگرنی...... اب تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں۔" سلیمان اس کے سر پر آ گئے۔" مانا کہ تم بہت خوب صورت ہو...... مگر اب تمھیں میرے بھائی کے ساتھ اسی گھر میں رہنا ہوگا...... شریف بیوی بن کر۔ اور شریف بننے کے لیے تمہارے پر کاٹ دیے جائیں گے۔ تم زندگی بھر یہاں سے قدم باہر نہیں نکال سکو گی۔

"میری بات تو سنو۔" زیبی نے سلیمان کے پیر پکڑ لیے۔ "تم سب غلط کہہ رہے۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو' دیکھو میرا باپ مر جائے گا۔ میری ماں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔"

"مر جانے دو ان سب کو' مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میرا بھائی کس حال میں ہے' یہ بھی تم نے سوچا۔ اپنی محبت اور حسن کے جال میں پھنسا کر' تم نے میرے بھائی کا کیا حشر کیا ہے؟ اب تمھیں اس کے زخموں پر مرہم رکھنا ہوگا۔ میں صرف اس بات کو جانتا ہوں۔ دوسری کسی بات کو سمجھنے کے لیے' نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ مجھے ضرورت' اگر تمہارا لالچی باپ مرتا ہے تو مر جانے دو۔" سلیمان نے بے رحمی سے قہقہہ لگایا۔

تب دوسرے ہی لمحے زیبی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

"مکار جادوگرنی۔ ادائیں تو دیکھو...... کیا دل پکڑ کر زمین پر گری ہے جیسے اے ون اداکارہ ہو۔" سلیمان اسے دیکھ کر بڑبڑائے۔ "اور کم بخت میں حسن کس قدر معصوم انداز لیے ہوئے ہے کہ شکل دیکھ کر یقین بھی نہیں آتا کہ اس کے یہ سفّاکانہ انداز بھی ہوں گے۔ بھائی جان بے وجہ مرغِ بسمل کی طرح نہیں تڑپ رہے۔ اس جادوگرنی میں' یہ وصف ہے کہ دوسرے کو اپنی جانب مائل کر لے۔"

"صاحب جی! یہ تو بے ہوش ہوگئیں۔" فردوسی بُوا نے گھبرا کر کہا۔

"منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالو' ابھی ہوش میں آ جائیں گی۔"

"صبح سے روئے جا رہی تھی' باؤلی نے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

"رحمان بھائی کو بلا لو۔ شاید ان کے ساتھ ناشتا کریں۔ آخر وہ ان کے قانونی شوہر ہیں۔"

سلیمان مسکرا کر بولے۔

زیبی کو ہوش آیا ہی تھا کہ رحمان کمرے میں داخل ہوئے۔ فردوسی بُوا' زیبی کے بالوں میں

دھیرے دھیرے مالش کر رہی تھیں اور زیبی چپ چاپ خاموش سی سب کو دیکھ رہی تھی۔

"سلیمان...... یہ کون ہیں بھئی؟" رحمان نے بھائی سے پوچھا۔

"کمال ہے' آپ بھی نہیں پہچانے؟" سلیمان نے حیرانی سے کہا۔ "یہ آپ کی شریک حیات ہیں...... فرح احمد۔ جنھوں نے اپنے باپ کے عیارانہ ہتھکنڈوں سے آپ کو نکاح کا فریب دے کر خوب لوٹا ہے۔"

"مگر یہ تو کوئی اور ہے۔" رحمان پریشانی سے بولے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" سلیمان نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

زیبی کی آنکھوں سے اب آنسو لگاتار بہہ نکلے۔

"بھائی جان! آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ کالا گیٹ' مکان نمبر دو سو پانچ۔ سترھویں گلی میں پانچواں مکان۔ اس علاقے تک تو آپ نے ہی میری رہنمائی کی تھی۔ تب کرائے کے غنڈوں کو میں نے وہی محل وقوع سمجھا دیا تھا۔"

"ہمارے مکان کا نمبر چھ سو پانچ ہے۔" زیبی زیرلب بڑبڑائی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" سلیمان نے اپنے ہاتھ مسل ڈالے۔

"تم ان کو فوراً ان کے گھر چھوڑ آؤ۔" رحمان گھبرا کر بولے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا' یہ غلطی کیونکر ہوگئی۔" سلیمان' زیبی کے پاس ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔

"یہ بدنامی میری زندگی میں تھی' اس لیے ہوگئی۔" بے آواز آنسو' پلکوں کی منڈیریں توڑ کر باہر نکلنے لگے۔

"خاتون' میں کیا کہوں...... میں بہت شرمندہ ہوں...... بھائی جان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔" سلیمان بڑبڑائے۔

"آپ کا انداز شریفانہ ہرگز نہیں تھا۔ بتایئے' اب میں کس منہ سے اپنے گھر جاؤں گی۔"

"ارے! آپ کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ میں خود چھوڑ کر آؤں گا آپ کے گھر۔" سلیمان بولے۔

"آپ کے نزدیک' کسی لڑکی کو رات گئے گھر سے اُٹھانے کا واقعہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے ماں باپ کے چہرے پر کالک مل کر' آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔" زیبی نے طیش میں آ کر سلیمان کا گریبان پکڑ لیا۔ "بتایئے' میں کس کس کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی پھروں گی۔"

"محترمہ' مجھے تو آپ کا نام بھی نہیں معلوم...... کیا آپ مجھے معاف کر سکیں گی؟" سلیمان نے اس کے ہاتھوں کو عقیدت سے تھامتے ہوئے کہا۔

"مجھ بدنصیب کو زیبی کہتے ہیں۔ گھر میں سب سے چھوٹی اور قسمت کی شاید سب سے کھوٹی...... آپ کو معاف کر کے بھی' میں ان طوفانوں کا رخ کسی اور جانب نہیں پھیر سکتی۔ جو میری جانب کسی اژدہے کی طرح منہ کھولے چلے آ رہے ہیں۔"

"پہلے ان کے گھر کے حالات معلوم کرواؤ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ آیا ان لوگوں نے پولیس میں رپورٹ کی ہے یا نہیں' مکان کے اطراف میں غل غپاڑہ ہے یا نہیں۔" رحمان نے بھائی کو سمجھایا۔ وہ اس صورتِ حال سے خاصے پریشان ہوگئے تھے۔

سلیمان نے فون پر کسی کو ہدایت دی اور کمرے میں پریشانی سے ٹہلنے لگے۔

زیبی کا آنسوؤں سے تر چہرہ ان کے دل میں کچوکے لگا رہا تھا...... آدھ گھنٹے میں معلوم ہوا کہ سوائے پڑوس کے کسی کو اس معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے۔ دونوں گھرانے' آپس میں بیٹھ کر آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کر رہے ہیں کہ اب کیا کیا جائے؟ پولیس میں بھی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی۔

"آپ کے پڑوس میں کون لوگ رہتے ہیں"؟ سلیمان نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"ہماری چچی کا گھر ہے۔"

"فون پر بتایا گیا ہے کہ پڑوس کا لڑکا خاصا پریشان نظر آ رہا ہے۔" سلیمان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ میرے منگیتر ہیں۔" شرم کی لالی زیبی کے چہرے پر پھیل گئی۔

"آپ اُٹھیے...... میں آپ کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔"

"مگر کہیں گے کیا؟" زیبی نے پھر پوچھا۔

"آپ چلئے تو میرے ساتھ۔"

سلیمان جب اپنے ساتھ زیبی کو لے کر گئے تو ان کا دل خاصا پریشان ہو رہا تھا کہ نہ جانے وہ لوگ' کیا کیا سوال کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ان پر پولیس کیس بھی بن جائے مگر وہ تمام خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔

زیبی اپنی امی کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔

اور سلیمان سے کسی نے بھی کچھ نہ پوچھا' جیسے کوئی بات کرنے کے لیے تھی ہی نہیں۔

"مجھے شرمندگی ہے کہ زیبی غلط فہمی کے باعث یہاں سے لے جائی گئیں۔" سلیمان نے

سب کو خاموش دیکھ کر خود ہی کہا۔

''کوئی دوسری بات کرو۔'' زیبی کے والد سرد سے لہجے میں بولے۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''اب سمجھنے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''آپ یقین کیجیے' اس معاملے میں زیبی بالکل بے قصور ہیں۔''

''کب سے دوستی تھی تمہاری زیبی کے ساتھ؟'' زیبی کے چچا پھاڑ کھانے والے انداز میں سلیمان کو گھور رہے تھے۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب!'' سلیمان کو اس صورتِ حال کی قطعی امید نہ تھی۔

''اپنے عشق کے جال میں ایک معصوم لڑکی کو پھنسا کر تباہ کر دیا...... اب کیا لینے آئے ہو تم''؟ یہ جملہ زیبی کا منگیتر کہہ رہا تھا۔

''بھائی صاحب! آپ تو ایسا نہ کہیں...... زیبی تو آپ کی منگیتر ہے۔'' سلیمان نے اس کے بازو تھامے۔

''اچھا۔ سب کچھ جانتے ہو۔'' وہ تمسخر سے ہنسا۔

''اس پر یہ دعویٰ ہے کہ زیبی کو جانتے تک نہیں ہیں۔'' چچا پھنکارے۔

''میری غلطی ضرور ہے کہ میں نے زیبی کو اپنی بھابی سمجھ کر یہاں سے اٹھوایا مگر جس نہج پر آپ لوگ سوچ رہے ہیں' وہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔''

''ڈاکو ہو تم! جو لوگوں کو اُٹھاتے پھرتے ہو۔''

''نہیں جناب!''

''پھر ایسی حرکت کیوں کی۔ ایسی حرکت کوئی شریف شخص کر سکتا ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ میں انھیں اپنی بھابی سمجھا تھا۔''

''بھابی ہوتیں تو بھائی لینے کے لیے آتا' تمھیں یہ دردسری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔'' چاچا اس کی کوئی بات بھی ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔

''جناب' اگر آپ کو میری کسی بھی بات کا یقین نہیں ہے تو آپ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں' بہرحال میں قصوروار ضرور ہوں۔'' تنگ آ کر سلیمان نے کہا۔

''پولیس بھی تم لوگوں کے ساتھ ملی ہوتی ہے۔ کیسے آرام سے کہہ دیا کہ پولیس کے حوالے کر دو۔'' زیبی کے منگیتر اسے گھورتے ہوئے بولے۔

''تمہاری کوئی عزت ہو یا نہ ہو' مگر ہماری ضرور ہے۔'' زیبی کے والد تاسف سے بولے۔

''تمہاری یہ گھناؤنی حرکت' پولیس میں بیان کر کے' میں اپنی عزت نہیں گنوا سکتا۔''

''آپ بتائیے' پھر میں کیا کروں؟'' سلیمان خاصے پریشان ہو گئے تھے۔

''کاش' زیبی کو بھگا کر لے جانے کے بعد' تم اسے زہر بھی دے دیتے۔'' زیبی کے بڑے بھائی تلخ لہجے میں بولے۔

''بھائی جان! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ زیبی پاک دامن ہے اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بے شک' آپ اس سے پوچھ لیں۔''

''بھاگ کر جانے والی کوئی بھی لڑکی' گھر آ کر اپنی عزت لٹنے کی داستان کسی کو نہیں سناتی۔'' زیبی کے والد نے آنسوؤں بھرے لہجے میں کہا۔

''کاش' آپ میری بات سمجھ لیں۔'' سلیمان کی پریشانی دیکھنے کے قابل تھی۔

انھیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال یوں بھی ہو سکتی ہے۔

''آپ یہاں سے چلے جائیے۔'' زیبی کے منگیتر نے دہاڑ کر کہا۔

تب سلیمان نے وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

''کیوں گئی تھی اس کے ساتھ؟'' امی اس کی کمر پر دھموکا جڑ کر پوچھ رہی تھیں۔ لہجہ گلوگیر تھا۔

''یقین کیجیے' امی اس نے مجھے اغوا کیا تھا۔''

''جھوٹ ہے یہ سب۔ اغوا کرنے والے بغیر تاوان کے نہیں چھوڑتے۔''

''امی' وہ اپنی بھابی سمجھ کر غلط فہمی میں لے گئے تھے۔'' زیبی نے آنسوؤں سے تر لہجے میں بتایا۔

''پھر' اس کے بھائی کا دل خوش کر آئی۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' زیبی کو غش سا آ گیا۔

''پھر کب آئے گا' وہ تجھے لینے' گھر تو دیکھ ہی لیا ہے نا' ان کم بختوں نے۔'' امی کی بڑبڑاہٹ ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''اب سمجھ میں آیا کہ محترمہ عامر کی اسکوٹر کا مذاق کیوں اڑاتی تھیں کہ اسکوٹر پر بیٹھا ہوا شخص یوں لگتا ہے جیسے کسی کتے کی پیٹھ پر بھونکتا ہوا آ رہا ہو۔ دیکھ لی' اس عیاش کی ہنڈا اکارڈ گاڑی جس کے ساتھ محترمہ ٹھاٹ سے بیٹھ کر آئی ہیں۔'' بڑی بھابی نے کلس کر کہا۔

''اسے شروع ہی سے پیسے کی ہوس تھی کیسی مالدار اسامی ڈھونڈی ہے۔'' چھوٹی بھابی نے

بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"مگر وہ تو ایک رات کے بعد ہی چیخ گیا اسے۔" بڑی بھابی کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ "کلی کلی پھرنے والے بھونرے بھلا ایک عورت پر قناعت کر سکتے ہیں۔ اوباش مردوں کو ہر رات ایک تازہ نوالہ چاہیے، جسے وہ چبا کر کھا سکیں۔"

"ارے، بس بھی کرو سب ہی بکواس کیے جا رہی ہیں...... یہ نہیں دیکھ رہیں کہ بچی کا حال کیا ہو گیا ہے۔" نانی اماں نے سراسیمہ ہوتی ہوئی زیبی کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

اور وہ نانی کے سینے سے لگ کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اس واقعے کو پندرہ دن گزر گئے تھے مگر سلیمان بے حد پریشان تھے۔ زیبی کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا، اس کا اندازہ انھیں ہو چکا تھا۔ ایک معصوم لڑکی، صرف ان کی وجہ سے گناہ گار ہوئی۔ اس کا احساس انھیں کچوکے لگا رہا تھا۔

رحمان بھائی جب سے کسی اوباش عورت کے جال میں پھنسے تھے۔ سلیمان کو عورت ذات سے نفرت ہو چکی تھی۔ شان دار شخصیت اور زمیندار خاندان سے وابستہ ہونے کی وجہ سے خاندان اور احباب میں کئی لڑکیاں ان کی جانب لپکی تھیں مگر انھوں نے اپنی جانب بڑھتے ہوئے کسی قدم کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ عیاش و بے باک لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر انھیں ان سے نفرت ہو چلی تھی۔

رحمان ہارٹ کے پیشنٹ تھے۔ اپنی محبوبہ کی بے وفائی انہوں نے اپنے دل پر لے لی تھی۔ بھائی کو خوش و خرم دیکھنے کے لیے انھوں نے غیر دانشمندانہ اقدام کیا تھا۔ جس کی سزا نہ صرف ایک معصوم لڑکی پا رہی تھی بلکہ ان کا اپنا دل بھی بوجھل ہو گیا تھا۔

'خدایا! یہ کیسی نازیبا حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی۔' وہ اپنا سر خود ہی تھام لیتے۔ زیبی کا آنسو بھرا چہرہ ان کی نظروں میں گھوم جاتا۔ اس کی رُندھی ہوئی آواز ان کے کانوں میں سیسہ سا پلا دیتی۔

'بتایئے، میں کس کس کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی پھروں گی۔'

"آپ کو معاف کر کے بھی، میں ان طوفانوں کا رخ کسی اور جانب نہیں پھیر سکتی جو میری جانب کسی اژدہے کی طرح منہ کھولے آ رہے ہیں۔'

زیبی کے منگیتر کی شعلہ برساتی آنکھیں وہ بھول نہیں پائے تھے۔

"ایک بھولی بھالی لڑکی کو ورغلاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی تھی۔" عامر اس معاملے میں

زیبی کو بھی برابر کا قصوروار سمجھ رہے تھے۔

سلیمان کو احساس ہو گیا تھا کہ جتنی وکالت وہ زیبی کی کر رہے تھے، اس کے چچا اتنا ہی اس کو برابر کا مجرم ٹھہرا رہے تھے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے۔ زیبی کا سراپا ایک آسیب بن کر ان پر حاوی ہو گیا تھا۔

تب سلیمان نے کہیں آنا جانا یکدم ختم کر دیا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں بند پڑے رہتے اور درجنوں سگریٹ پھونک ڈالتے۔ مگر دل کا بوجھ کسی طرح ہلکا نہ ہو پاتا۔ ضمیر کی خلش انھیں بے چین رکھتی۔

دل سے مجبور ہو کر زیبی کے گھر کے قریب سے گزرے تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ پڑوس کا گھر رنگ برنگے بجلی کے قمقموں سے سجا ہوا تھا۔ گھر کے آس پاس خاصی رونق تھی۔

"بھئی، یہاں کیا ہو رہا ہے"؟ اپنا تجسس رفع کرنے کے لیے انھوں نے ایک بچے سے پوچھا۔

"عامر بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔" اس بچے نے جواب دیا۔

"کیا آج شادی ہے؟"

"نہیں، آج تو مہندی ہے؟"

"تم لوگوں کے تو مزے آ گئے کہ برات پڑوس میں لے جاؤ گے۔" سلیمان نے بچے سے ہنس کر کہا۔

عامر بھائی کی شادی زیبی باجی سے تھوڑی ہو رہی ہے۔ ان کی برات تو بہت دور جائے گی۔" بچہ مزے سے پوری معلومات فراہم کر رہا تھا، جیسے وہ بھی کوئی مہمان ہوں۔

'عامر کی شادی زیبی سے نہیں ہو رہی......؟' ایک کند برچھی ان کے سینے میں اُترتی چلی گئی۔

'میں کس قدر بُرا شخص ہوں، صرف میری وجہ سے ایک لڑکی کے سپنوں میں آگ لگ گئی، میری ایک ناروا حرکت کے باعث۔ اس کا چاہنے والا اس سے دور ہو گیا۔ کیا قیامت بیتی ہو گی جب اسے معلوم ہوا ہو گا کہ اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے'

تب سلیمان تیزی سے پلٹ آئے۔ مبادا کوئی دیکھ لے۔

☆☆☆

زیبی کا رشتہ اگلے دن ہی چچی نے ختم کر دیا تھا۔

امی خاصا روئی پیٹی تھیں، گھر کی عزت کا واسطہ بھی دیا تھا اور نانی اماں نے چچا کے قدموں میں اپنا جھاگ سا سفید سر رکھ دیا تھا کہ یہ رشتہ ختم نہ کیا جائے۔

مگر چچا اور عامر بدستور اپنے فیصلے پر قائم تھے۔ انھوں نے اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ہم شریف اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔ آپ کا گھر ڈاکوؤں نے دیکھ لیا ہے' ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ وہ زیبی کو لے گئے اگلی مرتبہ شاید وہ زیبی کے چکر میں ہماری بیٹی کو لے جائیں تب تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ بدمعاشوں سے نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔'' چچا نے فرمایا۔

''عامر کی شادی کے بعد' ہم تو یہ گھر بھی بیچ کر کہیں اور لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ زیبی کی وجہ سے وہ کسی اور مصیبت میں پڑ گیا تو ہم کیا کریں گے۔'' چچی نے کہا تھا۔

ان کی بات خاصی معقول تھی۔ جو سب کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

آناً فاناً عامر کا رشتہ ختم کر کے اس کا رشتہ دوسری جگہ طے کر دیا گیا۔

اور آج عامر کی مہندی تھی۔

سب گھر والے چچا کے گھر تھے...... امی کلیجے پر پتھر رکھ کر گئی تھیں ورنہ دل تو ان کا بھی پھٹ رہا تھا۔

گھر میں زیبی اور نانی اماں تھیں۔

اچانک کسی کام سے زیبی باہر آئی تو سلیمان کی گاڑی دیکھ کر چونک گئی۔

''ذلیل انسان! تم اب پھر میرے محلے میں آ گئے ہو۔ اب کس کو اٹھا کر لے جاؤ گے...... خبیث!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

سلیمان بچے سے بات کر رہا تھا۔

اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پردے کے پیچھے سے دو آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں اور اسے کوس رہی ہیں۔

سلیمان کو جاتا دیکھ کر اس نے نفرت سے تھوک دیا۔ اور وہ نڈھال سی بستر پر گر گئی۔ ''ظالم تم نے مجھے تباہ کر دیا...... مجھے پامال کر دیا۔''

عامر کا اس کا ساتھ بچپن کا تھا۔ دونوں ساتھ کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ ان کی منگنی ہونے میں جہاں دونوں بھائیوں کی آپس کی محبت تھی' وہاں ان دونوں کی باہمی پسندیدگی بھی کارفرما تھی دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر چین ہی نہیں آتا تھا۔ عامر نے گھر میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس کی دلہن صرف اور صرف زیبی ہوگی۔

''اگر زیبی نے آپ سے شادی سے انکار کر دیا تب؟'' چھوٹی بہن مذاق سے کہتی۔

''تب تمہارا بھائی ساری زندگی یونہی گزار دے گا مگر کسی دوسری لڑکی سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

'جھوٹا' بے ایمان کہیں کا......' عامر کی باتیں سوچ کر بے نام آنسوؤں کا قافلہ خود ہی رواں ہو گیا۔

وہ عامر جو اس کے بغیر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس کے بغیر گھوم کر زیادہ شاداں و فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔

زیبی کا وجود جو سادگی اور معصومیت کا مرقع دکھائی دیتا تھا۔

اسے اب وہ فریب کا نام دینے لگا تھا۔

وہ جو باہر کھڑے ہو کر زیبی کا انتظار کرتا تھا' اب زیبی کو دیکھ کر راستہ بدل دیتا۔ اپنی بہنوں کو زیبی کے پاس آنے کی پابندی لگا دی تھی۔ زیبی کا وجود اس کے لیے ایک بدکردار لڑکی کا ہو گیا تھا جس کو دیکھ کر اس کی تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔

اور حد یہ تھی کہ وہ اس کی شادی میں بھی نہیں گئی تھی۔ ویسے بھی اپنی محبت کو کسی دوسرے کا ہوتا دیکھنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔

عامر شادی کے بعد دوسری جگہ شفٹ ہو گئے۔

خالی مکان پر برائے فروخت کی تختی لٹکا دی گئی۔

بقول ان کے کہ اب ایسی جگہ رہنا خاصا دشوار ہو گیا تھا' جہاں سے خاصی تلخ یادیں بھی وابستہ ہوں۔

بھابیاں گھر کے کام کاج کر کے اپنے کمروں میں پڑ جاتیں۔ انھوں نے زیبی کو اپنے کمرے میں بلا کر لمبی لمبی باتیں کرنا قطعی بند کر دی تھیں۔ اب تو وہ اس سے کسی کام کو بھی نہ کہتیں جیسے وہ اچھوت ہو۔

دونوں بڑے بھائی جو اس کے لاڈ اُٹھاتے نہیں تھکتے تھے' وہ بھی نظریں کترا کر اس کے سامنے سے گزر جاتے۔ گو چچی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سانحے کا پردہ رکھیں گی مگر یہ واقعہ پوری برادری میں اس برق رفتاری سے پھیلا کہ اگر اخبار میں شائع ہوتا تب بھی اس سرعت سے نہ پھیل پاتا۔

چچی کی چرب زبانی نے بات میں کئی کلیاں اور شگوفے خود ہی کھلا دیے تھے' ان کا حلفیہ بیان خاندان بھر میں گھومتا پھرتا تھا۔ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

زیبی نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ جب کسی ملنے والی نے چچی کی باتیں آ کر

سنائیں کہ "زہی جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کا لباس تار تار تھا' چہرے اور کلائیوں پر نیل کے نشان پڑے تھے مگر ڈاکوؤں نے رونمائی کے طور پر کچھ روپیہ اسے دے دیا تھا۔" یہ بات جو دوست احباب اور عزیزوں سے چھپائی گئی تھی یوں ایٹم بم کا خوفناک دھماکا ثابت ہوگئی' گھر میں کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔

"امی جان! اس کم بخت کی کہیں شادی کر کے دفع کیجیے...... میری گردن شرم سے جھک جاتی ہے جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری بہن کو ڈاکوؤں نے کتنے دن اپنے پاس رکھا۔" بڑے بھائی ایک دن آ کر برس ہی پڑے۔

"کہاں جھونک دوں اس کو' تم ہی بتاؤ۔" امی بے چارگی سے رو ہی پڑیں۔ "ہے کوئی رشتہ تمہاری نظر میں؟"

"خدایا' تو مجھے موت دے دے۔" اس شب سجدے میں گر کر زہی دھواں دھار روئی۔

☆☆☆

"سجاد صاحب کی بیگم کا انتقال ہوگیا ہے۔ پانچ بچے ہیں مگر وہ زہی سے شادی کرنے کو تیار ہیں......" چھوٹے بھائی ہفتے بھر میں رشتہ لانے میں کامیاب ہوگئے۔

"سجاد صاحب کی عمر دیکھی ہے' تم نے' زہی اس کی بیٹی سے بھی چھوٹی ہوگی۔" ابا جان اس معاملے میں پہلی دفعہ بولے تھے۔ ورنہ انھوں نے ایسی چپ سادھ لی تھی کہ کسی معاملے میں بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

"اس ٹائپ کی لڑکیوں کے ایسے رشتے بھی آ جائیں تو بہت بہتر ہے۔ یہ تو سجاد صاحب کی شرافت ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے وہ زہی سے شادی کرنے پر رضامند ہیں۔"

"بھائی جان! مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔" زہی نے پُرزور احتجاج کیا۔

"پھر میں لوگوں کی زبانیں کیسے بند کروں۔" وہ سر تھام کر بیٹھ گئے۔

"آپ مجھے زہر دے دیجیے۔ میرے مرنے کے بعد' کوئی آپ کو کچھ نہیں کہہ سکے گا۔" اس کا وجود ہچکیوں سے کانپ رہا تھا۔

"کاش' میں تجھے زہر دے سکتا۔" بڑے بھائی گلوگیر لہجے میں بولے اور باہر نکل گئے۔

تب زہی نے اپنا ٹھکانا چھت والی کوٹھری میں کر لیا۔ جہاں پرانا اور فاضل کباڑ پڑا رہتا تھا۔ نیچے سے ہٹ جانے کے باعث کسی آتے جاتے کی نظر سے بھی بچ گئی تھی۔ کھانے کا وقت ہوتا تو امی اس کا کھانا اوپر ہی لے آتیں۔ بھوک لگتی تو کھا لیتی۔ ورنہ یونہی پڑا رہتا۔

چپ چاپ' سارا' سارا دن وہ یونہی ساکت بیٹھی رہتی۔ کسی کی غلطی نے اس کی ساری زندگی کیسے داؤ پر لگا دی۔ وہ لب جو ہمہ وقت چہکا کرتے تھے' اب مسکرانا بھی بھول گئے تھے۔

"زہی' تم ماشاء اللہ ایم اے پاس ہو' ملازمت کر سکتی ہو۔ آج تمہارے والدین زندہ ہیں تو بھائیوں نے یہ کوٹھری بھی دے رکھی ہے۔ کل کو خدانخواستہ انھیں کچھ ہو جائے تو تم کیا کرو گی؟" ایک دن اس کی سہیلی نے رسان سے سمجھایا۔

"میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔" وہ پھیکی سی ہنس دی۔

"اخبار میں لیکچرر کی جاب نکلی ہے' میں بھی اپلائی کر رہی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ اپلائی کر دو۔ شاید تمہیں یہ جاب مل جائے تو گھر سے نکل کر تمہارا ذہن بھی بٹے گا اور کچھ پیسہ بھی ہاتھ آئے گا۔"

"مجھے پیسے کا کیا کرنا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مت بھولو کہ پیسہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ اگر تمہارے پاس ایک روپیہ نہیں تو بس میں نہیں بیٹھ سکتی ہو۔ میلوں پیدل چلنا پڑے گا' صرف ایک روپے کی وجہ سے......"

رضیہ کے کہنے پر اس نے اپلائی تو کر دیا تھا مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ قدرت اسے یہ ملازمت دینا چاہتی ہے۔

انٹرویو تو یوں عام سا ہی ہوا تھا مگر کامیاب امیدواروں میں اس کا نام دوسرے نمبر پر تھا۔

"اب یہ ملازمت بھی کریں گی۔" ایک دن اسے کالج جاتے دیکھ کر بھائی جان نے امی سے کہا۔

"کیا مضائقہ ہے' گھر میں بے کار پڑی رہتی تھی۔" امی کو اس کی حالت پر واقعی رحم آتا تھا۔

"ٹھیک ہے' کر لیں ملازمت' مگر اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کل کلاں کو ڈاکو اسے پھر لے گئے۔ تو میں کسی سے نہیں کہوں گا کہ یہ میری بہن ہے۔"

"جب اسے لے گئے تھے تو تم نے کون سے تیل مار لیے' کیا کیا تم نے زہی کے لیے؟" ابا جان کی دہاڑ دیکھنے کے قابل تھی۔

زہی کا ناتواں وجود ان کی آنکھوں میں کرچیاں سی بھر دیتا تھا۔ ان کی لاڈلی بیٹی اس انجام کو پہنچے گی' وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

رضیہ کی رائے بالکل درست تھی' ملازمت کرنے سے زہی کی حالت میں کچھ تغیر ضرور آیا تھا۔ اب وقت پر اس کا منہ دھلنے لگا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر وہ کالج جاتی تھی۔ ورنہ گھر

میں ایک جوڑا کئی کئی دن پہنے رہتی تھی۔

باہر نکلنے کے سبب' مزاج میں کچھ ٹھہراؤ سا بھی آ گیا تھا۔ایک دوپہر' وہ لڑکیوں کی ایکسٹرا کلاسز لینے کے بعد جب کالج سے نکلی۔تو اس کی کنٹریکٹ بس نکل چکی تھی۔مین روڈ تک جانے کے لیے اسے خاصی لمبی سڑک پر پیدل مارچ کرنا تھا۔دھوپ کی شدت میں لمبی کولتار کی سڑک پر چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔اچانک اس کے قریب کسی کار کے بریک چرچرائے۔

سلیمان۔گاڑی روک کر اس کے برابر ٹھہر گئے تھے۔

''زیبی! یہ تم ہو۔'' اس کا زرد سوکھا چہرہ دیکھ کر وہ تعجب سے بولے۔

''ہاں' بدقسمتی سے زندہ ہوں' مگر زندہ درگور۔'' اس کے لہجے میں زہر سمٹ آیا۔

''مجھے بڑا افسوس ہے زیبی! تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوا یقین جانو' مجھے تو سخت غصہ آیا جب مجھے معلوم ہوا کہ عامر نے تم سے شادی کرنے سے انکار دیا۔''

''ارے اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ ہر شریف شخص وہی کرتا ہے جو عامر نے کیا ہے۔ اس میں عامر کا کوئی قصور نہیں۔قصور تو سارا میرا ہے۔''

''مگر تم تو معصوم ہو' کسی ان چھوئی کلی کی طرح۔'' سلیمان کا لہجہ گمبھیر ہو گیا تھا۔

''سلیمان صاحب! یقین کیجئے۔ لوگوں کی اتنی باتیں سنی ہیں کہ اب تو یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے ہاں سے آ کر میں پاک دامن نہیں رہی۔''

''زیبی! کیا کہہ رہی ہو تم؟'' سلیمان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اس کے جملے ان کے کانوں میں انتہائی گرم گرم سلاخوں کی طرح لگنے لگے۔

''آؤ' میں تمہیں گھر چھوڑ دوں' کتنی تیز دھوپ ہو رہی ہے۔''

''اپنے گھر کیوں نہیں لے چلتے اپنی بھابی سمجھ کر۔غلط فہمیاں پیدا کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے میں تو آپ خاصے ماہر ہیں۔بعد میں دس جواز پیدا کر دیجئے گا اپنی شرافت کے۔''

''زیبی' کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''اچھا' یہ کیجیے۔ دو کرائے کے غنڈوں کا انتظام کیجئے' ہاں اس شہر میں ایسے نمک حلال با آسانی مل جاتے ہیں......میرا کالج آپ نے دیکھ ہی لیا ہے......گھر سے اٹھوانے میں دقت ہو تو کالج آتے جاتے اٹھوا سکتے ہیں...... پلیز' اب گھر کے بجائے قبرستان میں میری واپسی ہونی چاہیے۔شیشے کی کرچیں اپنی پلکوں سے اٹھاتے اٹھاتے میں خاصی لہولہان ہو چکی ہوں۔'' وہ نفرت سے ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

زیبی نے ان کی طبیعت اچھی خاصی صاف کر دی تھی' تب وہ زن سے گاڑی لے اُڑے۔

''حرام زادہ......اب راستے میں دلداریاں کرنا چاہ رہا تھا۔'' زیبی اسے جاتا دیکھ کر غصے سے بڑبڑائی۔

مگر سلیمان بھی شاید خاصے بے غیرت تھے' چار دن کے بعد پھر راستے میں آن مرے۔

''گاڑی اس تیزی سے اس کے پاس آ کر رکی کہ یکبارگی وہ اُچھل پڑی۔

آج وہ نئی نسان سنی میں تھے۔

''ڈاکو صاحب! آج یہ نئی گاڑی کہاں سے اُڑائی؟''

''یہ میری ہے۔'' وہ ہنسے۔

''سنا ہے ڈاکو واردات کے بعد گاڑی چھوڑ دیتے ہیں۔آپ بھی ایسا ہی کرتے ہیں یا نہیں؟''

''تم مجھے ڈاکو سمجھتی ہو؟'' وہ برہمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''ڈاکو نہیں ہو تم؟

کیا رات کے اندھیرے میں مجھے گھر سے نہیں اٹھوایا۔

میرا سکھ نہیں لوٹا!

میرا منگیتر نہیں چھینا!''

''میں آج انہی باتوں کو طے کرنے کے سلسلے میں آیا ہوں۔آؤ میرے ساتھ' تم سے ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''کیا اب بھی کوئی بات رہ گئی ہے ڈاکو جی؟'' وہ نفرت سے بولی۔

''زیبی! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔شاید اس طرح تمہارے ساتھ ہونے والی حق تلفی کا کچھ مداوا ہو جائے۔''

''اچھا......کیا ڈاکو بھی شادیاں کرتے ہیں۔'' وہ لفظ 'اچھا' پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''پلیز زیبی! میں سنجیدہ ہوں۔''

''ڈاکو صاحب! آپ مجھ پر رحم کھا رہے ہیں یا ترس یا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس رات میں آپ کے ساتھ اس وجہ سے فرار ہوئی تھی کہ میرا آپ سے کوئی تعلق تھا۔''

''بے بنیاد باتوں کو دل میں جگہ مت دو۔''

''ان بے بنیاد باتوں نے میری زندگی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں......ان کی آپ کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''زیبی! خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ضمیر کی خلش مجھے ڈسے چلی جا رہی ہے......

فار گاڈ سیک۔''

''مجھے کسی کے ساتھ بھی شادی نہیں کرنی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔''

''زیبی! میں تمہارے تمام دکھ سمیٹ لوں گا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔'' سلیمان کا لہجہ گھگھیایا ہوا تھا۔

''ڈاکو جی! اب مجھے اپنے آپ پر بھروسا نہیں رہا' تو ایک ڈاکو پر کیا بھروسا کروں گی۔''
اُس کی آواز بھرّا گئی۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''تم سے شادی کرنے کا مطلب ہے کہ میں اپنے خاندان کی بچی کھچی عزت بھی داؤ پر لگا دوں۔'' زیبی کا غصہ بدستور اپنی جگہ پر تھا۔ ''میں مر جاؤں گی مگر ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔''

''زیبی! میں ڈاکو نہیں ہوں۔ یہ وسوسہ تم اپنے دل سے نکال دو ہم خاندانی لوگ ہیں۔ اونچی ذات ہے ہماری۔ ہمارا شجرہ دیکھو گی تو اَش اَش کرو گی۔ زمیندار خاندان ہے ہمارا۔'' سلیمان اپنے خاندان کے اوصاف ایک ایک کر کے اپنی انگلیوں پر گنوا رہے تھے۔

''ایک زمانہ تھا جب چور' اُچکے' لوفر' بدمعاش غرباء میں پائے جاتے تھے'' زیبی نے طنزیہ کہا۔ ''مگر اب ایسے لوگ طبقۂ اُمراء میں زیادہ موجود ہیں۔ آپ نے اخبار میں نہیں پڑھا کہ بڑے بڑے ڈاکوؤں کی پُشت پناہی بڑے بڑے گھرانے کرتے ہیں اور یہ ڈاکو کوئی جن بھوت میں سے تو نہیں ہیں...... آپ جیسے انسان ہی تو ہیں جو رات کی تاریکی میں کسی لڑکی کو اُٹھواتے وقت ذرا نہیں سوچتے کہ ان کا یہ فعلِ بد کیا قہر لا سکتا ہے۔''

زیبی کی زبان کے کوڑے اس کے اعصاب کو جب بُری طرح لہولہان کر گئے تو وہ چلا گیا۔

پھر کتنے ہی دن گزر گئے...... سلیمان اس کے پیچھے نہیں گئے۔ وہ سڑک پر پیچھے آتی گاڑی کی آواز پر رک جاتی جیسے وہ سلیمان ہو...... مگر گاڑی گزرتی دیکھ کر آپ ہی آپ ہنس دیتی۔

'بھاگ گیا بدمعاش۔ اب یہ کم بخت ڈاکو بھی ہیرو بنیں گے۔ کیسے ڈائیلاگ بول رہا تھا' مجنوں کی اولاد۔ طبیعت صاف ہوئی تو بھاگتے بنی۔''

'اُونہہ...... ضمیر کی خلش بے چین کر رہی ہے...... تم میں ضمیر کہاں سے آ گیا سلیمان صاحب اپنی بے غیرتی کو بہادری کا نام دینے والے' میں تمہارے اوپر تھوکتی بھی نہیں۔'

زیبی کے ذہن سے سلیمان کی باتیں ابھی نکلی بھی نہیں تھیں کہ ایک دوپہر کالج سے نکلتے ہوئے اس نے پھر اسے جا لیا۔

''زیبی! میری بات سنو...... شادی کے بعد ہم کہیں باہر چلے جائیں گے۔ بہت عرصے کے بعد آئیں گے۔'' وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔ ''تب تک تمہارے خاندان کے لوگ یہ بات

بھول چکے ہوں گے۔''

''سلیمان صاحب! آپ بہت بھولے ہیں یا بہت بڑے فنکار ہیں۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ دنیا والے ہر بُری بات یاد رکھنا چاہتے ہیں اور ہر اچھی بات' خواہ وہ کسی سے بھی متعلق ہو' اسے جلد بھول جاتے ہیں۔ آپ یاد رکھیے گا کہ جب تک میں زندہ ہوں۔ مجھ سے وابستہ یہ خاک میرے منہ پر ہمیشہ لگی رہے گی۔ اس خاک کو کوئی صاف نہیں کر سکتا جو آپ نے میرے ناموس پر لگائی ہے۔''

''تم مجھے موقع تو دو زیبی! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔''

''جناب! یہ شاہراہ ہے' کوئی عشق کا پلیٹ فارم نہیں...... یہاں سے آپ جائیے' میرے دماغ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اب کوئی آپ کی بات برداشت کر سکوں۔'' زیبی نے اس کی والہانہ نگاہوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

کالج میں موسمِ گرما کی تعطیلات ہوئیں تو زیبی کا ٹھکانا پھر اس کی کوٹھری میں بن گیا۔

''زیبی یہاں تو بڑی گرمی ہوتی ہے' نیچے آ جایا کرو' میرے پاس۔'' ایک دوپہر نانی اماں اس کے پاس آئیں تو اسے دیکھ کر محبت سے کہا۔

''نانی اماں! یہاں کا سکوت مجھے بے حد سکون مہیا کرتا ہے۔ گرمی سردی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔''

''اکیلے پڑے پڑے' تیرا دل نہیں گھبراتا؟''

''اتنی ڈھیر ساری کتابیں ہیں میرے پاس' بس میں انہی کو پڑھتی رہتی ہوں۔'' اس نے میز پر رکھی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس کی آنکھوں سے لگی کتاب تو ضرور ہوتی تھی۔ مگر اس کا ذہن سلیمان کے ناروا سلوک کی جانب مبذول رہتا تھا۔

'کاش میں اغوا نہ ہوتی تو میرے شب و روز ایسے نہ ہوتے۔ میں بھی عامر کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں کا مزہ لیتی۔ خاندان بھر کی معتوب نظریں مجھے یوں نہ لہولہان کر رہی ہوتیں۔ سلیمان! صرف تمہاری وجہ سے میری عزت اپنے گھر میں دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہے' اس کی سوچ بار بار احتجاج کرتی اور رگوں میں بہنے والا لہو...... نفرت کا سمندر بن جاتا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سلیمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے جس نے اس سے' زندگی کی ہر خوشی چھین لی تھی۔

اسے جب بھی سلیمان نظر آتا اس کا ذہنی تناؤ ایک اُبال کی صورت میں بڑھ جاتا۔

گھر آ کر وہ اپنے دانت کچکچاتی۔

دیواروں پر گھونسے برساتی۔

اور آخر آنسوؤں کا سیلاب اسے یہ باور کرا دیتا کہ وہ اپنا خون پینے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

اس کی کالج کولیگز ان تعطیلات میں گھومنے پھرنے گئی ہوئی تھیں اور زیبی ایک چھوٹے سے کمرے میں مقید، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

ابا کو ترس آتا تو وہ اس کو اپنے پاس نیچے بلا لیتے اور وہ نظریں جھکائے، سہمی سہمی کھڑی رہتی۔ جیسے اپنے کیے پر شرمسار ہو، ابا کسی کام میں محو ہوتے تو فوراً اوپر بھاگ جاتی۔

امی تو اس سانحے کے بعد مستقل بیمار رہنے لگی تھیں۔ بعض اوقات ان کا بلڈ پریشر اس قدر "لو" ہو جاتا کہ وہ بستر پر ادھ موئی سی پڑ جاتیں؟ نانی اماں پھر اسے پکارتیں۔

تب سکنجبین میں بہت سارا نمک ڈال کر وہ امی کو پلاتی۔ کبھی انھیں گلوکوز کا گلاس وقفے وقفے سے دیتی۔

زبردستی انھیں کھلاتی پلاتی۔

مگر اس کے باوجود اسے یہ احساس ہوتا کہ گھر کے ہر فرد کی نظریں اسے یہ کہہ رہی ہیں۔

"امی کی طبیعت کی خرابی کی ذمے دار، صرف تم ہو زیبی! صرف تم!"

ان کی بوڑھی ہڈیاں اور ناتواں دل یہ صدمہ برداشت کرنے کا اہل نہیں تھا۔ تب وہ سب کی نظروں سے بچ کر اوپر اپنے کمرے میں بھاگتی اور پھر گھر میں ایک بھونچال سا آ گیا۔

سلیمان اپنے بھائی رحمان کے ساتھ آئے تھے۔

بھائی جان اور ابا جان انھیں دیکھ کر ہی غصے سے بپھر گئے۔

رحمان بھائی نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر پورا واقعہ سنایا۔ انھیں اس بات کا ملال تھا کہ ذرا سی غلطی نے زیبی کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ وہ اس غلطی کا ذمے دار اپنے بھائی کو برملا ٹھہرا رہے تھے۔ رحمان بھائی کی طبیعت خاصی خراب تھی...... مگر اس کے باوجود وہ سلیمان کے رشتے کے سلسلے میں ان کے ہاں آئے تھے۔ والدین کی وفات کے بعد وہی سلیمان کے سرپرست بھی تھے۔ بڑے بھائی بھی اور دوست بھی۔

سلیمان کی ذہنی حالت اور دلی کیفیت جب ان پر آشکارا ہوئی تو یہ قدم انھوں نے اسی لیے اٹھایا تھا۔

"بھائی صاحب! آپ کی تمام باتیں درست مان بھی لیں، مگر زیبی کو سلیمان سے بیاہنے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہماری بہن از خود فرار ہوئی تھی۔ ساری افواہیں سچ کا طوق بن کر ہماری

گردنوں میں لٹک جائیں گی...... تب ہم کس کس سے وضاحت کرتے پھریں گے۔" بھائی جان کی بات کافی حد تک درست تھی۔ وہ چند لمحے کے لیے گنگ رہ گئے۔

"میں زیبی کو لے کر باہر چلا جاؤں گا اور اس وقت تک باہر رہوں گا جب تک آپ مجھے پاکستان آنے کے لیے نہ کہیں گے۔" سلیمان بے صبری سے بولے۔

"نہیں بیٹے! یہ اس مسئلے کا کوئی واضح حل نہیں ہے کہ تمھیں جلاوطن کر دیا جائے۔" ابا جان نے رسان سے سمجھایا۔

"پھر آپ بتایئے کہ میں اپنی اس غلطی کی کیوں کر تلافی کروں۔ جب کہ میرا دل بھی اب زیبی کے علاوہ کسی اور لڑکی کے لیے رضامند نہیں ہو سکتا۔"

"ہم کچھ سوچ کر جواب دیں گے۔ آپ ہمیں ایک ہفتے کی مہلت دیجیے۔" ابا جان نے فی الوقت ان لوگوں کو ٹالا۔ وہ خود خاصے پریشان ہو گئے تھے۔

اور جب یہ بات زیبی کے سامنے ہوئی تو اس نے رو رو کر گھر بھر دیا۔

"میں زہر کھا لوں گی مگر سلیمان سے کسی صورت شادی نہیں کروں گی۔ وہ جو میری خوشیوں کا قاتل ہے، اس سے شادی کرنا میری توہین ہوگی۔"

ابا جان اور بھائی جان اس مسئلے پر روز سوچتے اور کوئی فیصلہ نہ کر پاتے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس رشتے کو قبول کر لیں یا انکار کر دیں۔ انکار کی صورت میں زیبی کے لیے کوئی متبادل رشتہ موجود نہیں تھا اور ہاں کرنے سے ان کی سبکی ہوتی تھی۔

امی کی تو یہ دلی خواہش تھی کہ زیبی کی شادی سلیمان سے کر دی جائے۔

"امی، آپ کیوں ایسی بات کہہ رہی ہیں...... آخر لوگ کیا کہیں گے؟" زیبی نے ان کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"پیاری بیٹی! اگر ہم لوگوں کے کہنے کی پروا کریں تو لوگ شاید ہم سے جینے کا حق بھی چھین لیں۔" امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جو ہوا، برا ہوا...... مگر اب مزید برا نہیں ہونا چاہیے۔ تمھارے چچا، چچی اور عامر...... برسوں سے ساتھ رہ رہے تھے، جانتے بوجھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ تمھیں پارسا ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ ایک ناکردہ گناہ کی تشہیر انھوں نے اس قدر کی، جس کی کم زکم ان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ سلیمان جیسا بھی ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ تمھارے ساتھ ہونے والی زیادتی پر شرمندہ بھی ہے۔ ہمارا پروردگار معافی مانگنے والوں کو معاف کر دیتا ہے تو ہم کیا چیز ہیں...... پیاری زیبی! اسے معاف کر دے۔ اس کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر، خوف و ہراس، اندیشوں سے ہٹ کر ایک بھرپور زندگی کی ابتدا کر...... میری شہزادی......

تجھے خوش دیکھ کر...... میری طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

☆☆☆

امی کا فیصلہ سب نے قبول کر لیا تھا۔

سلیمان چوتھے دن ہی رحمان بھائی کو لے کر آ گئے تھے۔

"میرے خیال سے ابھی ایک ہفتہ تو نہیں ہوا۔" بڑے بھائی کو ان کی جلد بازی پر ہنسی آئی۔

"میں نے سوچا کہ شاید آپ کو کچھ قائل کر سکوں۔" سلیمان سادگی سے بولے۔

"اس کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔" بھائی جان مسکراہٹ دبا کر بولے۔

"کیا مطلب؟ مجھے زیبی نہیں مل سکے گی کیا......؟" سلیمان نے چونک کر کہا۔ "دیکھیے' میں اپنے حصے کی کُل جائیداد کے تمام کاغذات لے کر آیا ہوں جو حق مہر میں زیبی کے نام کر دیے جائیں گے۔"

"ان کاغذات کو آپ اپنے پاس رکھیے۔ ہمارے ہاں لین دین کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ زیبی نے آپ لوگوں کی بات بھی نہیں مانی۔" سلیمان کا چہرہ ایک دم اتر گیا۔ "چلیے رحمان بھائی! واپس چلیں' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں اتنا بدقسمت بھی ہو سکتا ہوں۔" سلیمان کی آنکھوں کی جوت بجھ سی گئی۔

"اس وقت تو آپ خالی ہاتھ ہی جائیں گے...... مگر آئندہ جمعے کی آپ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ آئیے۔ نکاح کر کے زیبی کو رخصت کرا کے لے جائیے۔" بھائی جان نے مسکرائے لبوں سے سلیمان کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"زندہ باد۔" سلیمان نے ایک نعرہ لگایا پھر گرم جوشی سے گلے ملے۔

☆☆☆

وہی کوٹھی تھی...... اور وہی کمرہ تھا مگر ماحول مختلف تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے' سلیمان کی رشتے کی بہنیں شوخ جملوں سے چھیڑتے ہوئے اسے تنہا چھوڑ کر گئی تھیں۔

فردوسی بُوا لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی کمرے میں چھوڑ گئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد سلیمان بھی کمرے میں داخل ہوئے۔

اُنہیں دیکھ کر وہ اور بھی سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اُسے یاد آیا کہ جب اُس نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تب بھی وہ انہیں دیکھ کر ڈر کے باعث سمٹ گئی تھی۔

"زیبی' مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ قدرت نے یہ چاند میری قسمت میں لکھا تھا۔" سلیمان

نے اس کا چہرہ کسی مقدس کتاب کی طرح تھام کر کہا۔

"یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"زیبی' یہ بندھن کسی مجبوری کے تحت نہیں باندھا گیا۔ یقین کرو جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو مجھے یہ جان کر خاصی تکلیف ہوئی کہ تم عامر سے منسوب ہو۔"

"عامر نے جب شادی سے انکار کیا' تو آپ خوش ہوئے تھے؟" زیبی تیکھی چتونوں سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں' مجھے اس شخص کی بدقسمتی پر رحم آیا تھا جو اتنی پیاری اور حجت کرنے والی ہستی سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ کرب' یہ تکلیفیں تمہیں میری وجہ سے ملیں...... میں ان کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ اس بات پر یقین رکھنا جاناں!...... کہ میری زندگی کی تمام تر محبت اور چاہت کی تمام تر حق دار صرف تم ہو گی...... صرف تم......" سلیمان نے اپنا سر اس کی ہتھیلی پر ٹکا دیا تھا۔

"تو گویا' یہ پورا کا پورا ڈاکو میرا ہوا......" زیبی شوخی سے بولی۔

"جب تم نے میرے دل پر ڈاکا مار لیا' تو میں کیا کر سکتا ہوں جاناں۔"

تب سلیمان کے ساتھ زیبی بھی ہنستی چلی گئی۔

❀❀❀

سامان خوشیوں کے

اس قدر دغاباز ہوگا......! اتنا کمینہ بھی' اور اس قدر ذلیل کہ ملنے کا نام نہیں لے گا......!

وہ اس کم بخت دوپٹے کو ڈھوندتے ڈھونڈتے بے حال ہو چکی تھی مگر وہ منحوس ملنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"تجھے خدا کا واسطہ مل جا......" اس نے الماری کی ساری چیزیں نکال کر پھینک دیں......وہ چیزیں جو الماری میں ڈوب کر کھو چکی تھیں۔ اور جن پر وہ صبر کرنے کے ساتھ ساتھ لاحول بھی پڑھ چکی تھی۔ وہ زندہ ہو کر اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ مگر وہ دوپٹہ اس کے کمرے سے ایسا اڑن چھو ہوا تھا کہ ملنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اس کو پہننے کی آج باری تھی۔ اس دوپٹے کی وجہ سے اس نے سلک کا گلابی سوٹ بھی بنایا تھا۔ مگر وہ دوپٹہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

اس کی تلاش...... جب ناکامی کی سرحدوں تک پہنچ گئی تو آنکھوں سے بھل بھل آنسو...... اس کے عزائم کا دم توڑنے لگے......!

وہ گلابی پیور شفیون کا کامدانی سے سجا دوپٹہ کتنا خوبصورت تھا...... فیروز ولا میں رہنے والی ساتوں لڑکیوں کا یہ خیال تھا کہ اُس دوپٹے کو پہن کر ان کے حسن میں ڈھیروں بلکہ منوں کے حساب سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی گلابی شعاعیں' چہرے کی چمک میں رم جھم سی پیدا کرتی تھیں......!

ہائے میری قسمت...... آج جب میں گلابی سوٹ پر اُس کو پہنتی تو کس قدر آفت لگتی...... یہ سوچ کر پھر وہ رو دی......!

یہ دوپٹہ ان کی بڑی پھوپو نے بنایا تھا۔ جب سے ان کی عمر شادی کی امیدوں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ وہ اپنی توجہ سلائی 'بنائی کے لچھوں میں لگائے رکھتی تھیں۔ وہ دوپٹہ ان کی دن رات

کی عرق ریزی کی خوبصورت مثال تھا جسے ان کی بھتیجیوں نے فوراً ہی ان سے جھپٹ لیا تھا۔ اور وہ مسکرائے بنا نہیں رہ سکی تھیں۔

ان کی یہ پھوپو بہت ہی پیاری عادتوں کی مالک تھیں جانے کیوں' ان کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے ان کی تنہائیاں ریشم کے لچھوں اور کامدانی کے باریک تاروں سے آباد تھیں۔ وہ ہمہ وقت اپنی بھاوجوں اور بھتیجیوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی تھیں......!

گلابی کامدانی کا دوپٹہ بے حد نفیس تھا۔ اور شاہدہ کو تو بہت پسند آیا تھا...... اس کی مناسبت سے وہ سینڈل...... جیولری' سب ہی کچھ خرید لائی تھی...... اور وہ دوپٹہ...... اس کا یوں دل جلا رہا تھا کہ وہ عجیب بدحواس سی ہو گئی تھی۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ وہ دوپٹہ کھو گیا۔ اس نے اپنے دھڑکتے دل کو خود ہی ڈھارس دی......!

فاروق کے سامنے چم چم کرتا دوپٹہ اوڑھ کر آنا کوئی آسان کام تھا بھلا......!

وہ کیا سمجھتے...... ساری خودداری کا جنازہ نکل جاتا......! اب انھیں کیا معلوم کہ میں جو اُن کے سامنے یوں اکڑ کر گزر جاتی ہوں۔ اندر سے کس قدر کھوکھلی سی ہو گئی ہوں......!

سارے رسائل کے افسانے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ مگر افسانوی ہیروئین کی سی ہمت اس میں قطعاً پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

اور فاروق کس قدر خوبرو تھے۔ یوں لگتا تھا کسی افسانے کے ہیرو میں جان پڑ گئی ہو......!

بلند قامت' خوش لباس اور امیر ترین شخصیت......!

ان کے لاہور آتے ہیں ان کی امارت کی کہانیاں...... خاندان کے ہر گھر میں پھیل گئی تھیں...... ان کے باپ کمشنر تھے' اور دادا پورے گاؤں کے مالک...... اور وہ حال ہی میں لندن سے ایم' ایس کر کے آئے تھے...... پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے...... آج کل وہ کراچی سے اپنے لیے دلہن پسند کرنے کے چکر میں لاہور آئے ہوئے تھے۔ ان کی اماں نے یہ بات بتا کر لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ان کی ماؤں کے بھی بلڈ پریشر بڑھا دیے تھے۔

"فیروز ولا' بہت بڑا مگر پُرانی وضع کا ایک کشادہ مکان تھا جس میں فاروق کے رشتے کے پانچ ماموں اپنی اولادوں اور دو بہنوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

حسنہ بیوہ تھیں...... وہ اس وجہ سے اپنے بچے لے کر بھائیوں کے پاس آ گئی تھیں۔ جب کہ سلمٰی کی عمر خاصی ہو گئی تھی۔ مگر وہ یہ تہیہ کیے بیٹھی تھیں کہ اب وہ یونہی زندگی بتا دیں گی اور شادی نہیں کریں گی...... ان کا سارا وقت سلائی کڑھائی میں گزرتا یا پھر شاہدہ کے حصے کے کام نمٹاتیں۔ باورچی خانے کے کام سے شاہدہ کو ہول آتا تھا۔

فاروق کی لتاں نے جب سے فاروق کی شادی کے ارمان بھرے راگ 'فیروز ولا' میں چھیڑنا شروع کیے تھے۔ان کی آؤ بھگت میں خطرناک حد تک اضافہ ہوگیا تھا۔وہ ابھی ایک بھاوج کے کمرے میں ہوتیں۔تو دوسری بھاوج ان کو اپنے پورشن میں لے جانے کے لیے بے چین ہو جاتیں اور اس وقت تک ان کے سر پر کھڑی رہتیں' جب تک کہ وہ جانے کے لیے قدم نہ اٹھاتیں۔بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ان کو کلاشن کوف کی نالی سے اپنے کمرے میں ڈپٹ کر لے جائیں۔اور چلا کر کہیں...... ''چل بڑھیا میرے کمرے میں...... بلا قاضی...... اور میری بیٹی کو رخصت کر کے لے جا۔''

جہاں مائیں برسرِ پیکار تھیں' وہاں لڑکیاں بھی اک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

مونا کا قد چھوٹا تھا۔وہ ہمہ وقت پنسیل ہیل پر چڑھی رہتیں...... مسلسل ہیل کے استعمال سے ان کی ایڑیوں میں درد اور پیر کی انگلیوں میں سوجن آ گئی تھی مگر وہ یہ سب دکھ اپنے بہتر مستقبل کے لیے جھیل رہی تھیں۔

ملیحہ کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی ایجوکیشن لندن میں مکمل کر کے آئے ہیں تو ہنی مون کا پیریڈ بھی یقیناً پیرس اور سوئٹزرلینڈ میں گزاریں گے۔ فاروق کے پروپوزل آنے پر وہ اپنی منگنی تک سے دستبردار ہونے کو تیار تھیں۔ بقول ان کے یہ دور خوب سے خوب تر کا ہے۔زبان کا پاس واس کچھ نہیں ہوتا۔اور نہ ہی آج کل منگنی ونگنی کی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔

رانی کے بال نہ صرف بوائے کٹ کے انداز میں سیٹ تھے بلکہ آگے سے بالوں میں 'میمنگ' بھی تھی۔ ایک دن فاروق کی اماں ان کو چھوٹے بھائی کا لڑکا سمجھیں...... تب سے وہ چھوٹے بال ان کو زہر لگنا شروع ہو گئے تھے...... اس کا حل یہ نکالا تھا کہ کسی سے وگ مانگ کر لائی تھیں۔وگ کے بال خاصے دراز تھے۔ کمر تک آبشار کی طرح پھیلے رہتے۔مگر وہ وگ نہ جانے کس غلیظ سہیلی کی تھی اس کو پہنتے ہی رانی کے سر میں جوئیں سی سرسرانے لگتیں...... اور وہ سر کھجا کھجا کر بے حال ہو جاتیں۔

مگر فاروق کی اماں کو ان کے لمبے بال بہت پسند تھے۔ان کی نگاہوں کے لگاوٹ سے رانی بن پیے مسحور سی ہو جاتیں۔

وریٰ کا قد لمبا تھا۔وہ ان کے سامنے ہمیشہ ساری میں آتیں۔

نت نئی ساریوں کا ان کے پاس خاصا بڑا اسٹاک تھا کبھی پلو گرا کر چلتیں تو کبھی فال چنٹی میں پکڑ کر نفاست سے چلتیں وہ تو جانے کب تک ساریاں پہنتیں مگر ایک دن بڑی بی...... روہانسی

ہو کر بولیں...... ''اے بیٹا...... تمہارے پاس ایک بھی شلوار قمیض نہیں ہے کیا......؟ قمیض شلوار پہنتیں تو اس میں تمہارا ابھی پردہ رہتا...... کالی چرخ سی کمر تو سب کو نظر نہ آتی۔''

تب وریٰ نے ان کو ایسی بے بسی سے دیکھا کہ ساری لڑکیاں اپنے قہقہے سینے میں گھونٹتے ہوئے اوپر بھاگیں۔

''اگر یہ کسی امیر بیٹے کی ماں نہ ہوتیں تو ان کا دماغ ٹھیک کر دیتی۔'' وہ جل کر بولی۔

ملیحہ' شاہدہ اور وریٰ...... ایک دوسرے سے میچنگ چیزیں لے کر پہن رہی تھیں...... لباس کے کلر اور فیشن کا خیال رکھ رہی تھیں۔مگر فاروق کی اماں اتنی گھنی تھیں کہ ہر دوسرے دن فاروق کے ساتھ 'فیروز ولا' میں آتیں۔ سب کو خوب تاڑتیں...... اپنی خاطریں کرواتیں اور منہ سے کچھ پھوٹ کر نہ دیتیں۔

''ارے بڑی ڈراما عورت ہے۔اپنی مارکیٹ ویلیو بڑھانے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتی ہے...... دیکھنا...... یہ اپنے لڑکے کی شادی وہیں کراچی میں کسی لڑکی سے کرے گی۔اپنی سیر و تفریح کو یادگار بنانے کے لیے یہ گل فشانیاں کرتی پھر رہی ہے۔'' بڑی تائی نے خاصا تنک کر کہا تھا۔

اور بات تھی بھی غصے کی' بیچاری ملیحہ سڑی گرمی میں ان کے لیے کبھی کیک بناتیں' کبھی رس ملائی' حد تو یہ تھی کہ حلیم تک پکا کر کھلا دیا تھا۔مگر وہ شکریے کے سوا کچھ بول کر نہ دی تھیں۔

شاہدہ کو اپنی گندمی رنگت کا خاصا ملال تھا۔ اس لیے وہ فاروق یا لتاں کے سامنے بڑے جھینپے ہوئے انداز میں آتی تھیں...... 'فیروز ولا' میں رہنے والی سب لڑکیاں جو لاہور کی سڑی گرمی میں سرخ تک پر اتر آئی تھیں۔ شاہدہ تب بھی ہلکے رنگ پہن رہی تھیں۔ فاروق کی وجاہت...... اور ان کی قابلیت سے بھی بے حد متاثر تھیں' ساری لڑکیوں کے دل ایک سے ہوتے ہیں۔وہ گلابی شیفون کا خوبصورت دوپٹہ جس کو پہننے کی باری تھی...... نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔رنج کی حالت میں ان کا دل ڈوبا سا جا رہا تھا۔ دوپٹے بھی ذلیل ہوتے ہیں...... خبیث ہوتے ہیں...... یہ سوچ ان کو کلسائے جا رہی تھی۔

اسے سامنے ہینگر پر ڈال کر کیل پر ٹانگ دیا تھا...... اور اب اس کو ڈھونڈتے ہوئے انھوں نے اپنا سارا کمرہ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔مگر وہ تو یوں غائب تھا۔ جیسے کسی جادو کے زور سے ہوا ہو گیا ہو۔

ارم' وریٰ' ملیحہ' ثانیہ' شبو' رانی وہ سب کے کمروں میں جھانک آئی تھی۔ کوئی غرارہ پہن رہا تھا۔تو کوئی ساری کے فال گن گن کر ڈال رہا تھا...... مگر وہ دوپٹہ کسی کے پاس بھی تو نہ تھا۔

''اللہ میری قسمت......'' مارے رنج کے انھوں نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔ ساتھ کے

کمروں سے جب خوشی کی چیخیں سنائی دیں تو وہ ہنس پڑیں...... یہ چیخ دھاڑ......اس بات کا اعلان تھا کہ فاروق اپنی اماں کیساتھ 'فیروز ولا' میں قدم رکھ چکے ہیں۔

''اللہ...... میں ان کے سامنے جاؤں یا نہ جاؤں' ان کو دیکھ کر دل نہ جانے کیوں دھک دھک کرتا ہے۔

ساری......تایا' چچا کی لڑکیوں سے مقابلہ بھی خاصا سخت ہو رہا تھا......'فیروز ولا' میں رہنے والی ہر لڑکی ان پر عاشق ہو چکی تھی اور ایک وہ تھے۔ ترے بھوندو سے کسی کو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ لڑکیوں کی شوخیوں' شرارتوں کا جواب ایسے دھیمے اور ملائمت بھرے انداز میں دیتے تھے کہ سب بُرا سا منہ بنا کر رہ جاتی تھیں۔

''بنتا ہے......کم بخت۔'' مونا نے اونچی ایڑی کا سینڈل دیوار پر مار کر کہا......'' اُس منحوس کی خاطر ہم نے اپنے پیر تُجا لیے مگر اتنا ذلیل ہے کہ نظریں اپنی ہی ایڑیوں پر رکھتا ہے......''

''ارے' یہ سب اس کے پوز ہیں۔ یہ سیّاں بڑے کائیاں سے ہیں......'' رانی اپنی وگ کھینچ کر پھینکتی......'' پتہ نہیں کب کراچی دفعان ہوگا جب تک تو میرے بالوں کی خارش چہرے تک تو ضرور آجائے گی......؟''

''تم سب سے کس نے کہا ہے کہ اُس کی خاطر یہ سارے عذاب سہو......'' ورلیٰ اپنے آپ کو پرفیوم سے بھگوتے ہوئے سبب کو چڑاتی......!

''ارے......لڑکا حسین ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو' اپنے خاندان کا ہو......سسرال کا لمبا چوڑا بکھیڑا بھی نہ رکھتا ہو......ایسے شوہر تو اے ون گریڈ رکھتے ہیں۔ نہ جانے' فیروز ولا' میں رہنے والی کسی لڑکی کی قسمت ان کے ساتھ کھلتی بھی ہے یا نہیں۔'' شبو چہک کر کہتی۔

''یار شبو تیری آواز اتنی خوبصورت ہے......ان کو اگر تو گانا سنا دے' تو شاید تیرے نمبر کچھ بڑھ جائیں۔'' مونا اسے چھیڑتی۔

''دماغ خراب ہے میرا کہ میں ان کو گا کر لبھاؤں گی۔ ویسے میں نے ان کی اماں کو نعت سنائی تھی۔ کہ یونیورسٹی میں اس نعت پر مجھے انعام ملا تھا......''

''واقعی......! ایمان سے...... بُوھیا تو بڑی مسحور ہو گئی ہو گی۔'' ساری لڑکیاں خوش ہو کر اس کے بیڈ پر چڑھ آئیں۔

''ارے بڑی آفت ہے' بڑھیا ہنس کر بولی......ارے بیٹی تم نے نعت سنا کر' مجھے میرا زمانہ یاد دلا دیا تمہاری عمر میں' ہم بھی بڑے میلاد پڑھتے تھے بلکہ ہر جمعرات کو محلے کی بچیوں کو بلایا...... دالان میں دو تکیے رکھے اور میلاد کی کتاب لے کر بیٹھ گئے۔ ہماری اماں سب لڑکیوں کو بتاشے

تقسیم کر دیتی تھیں۔ لو بھئی' میلاد ہو گیا......مگر اب لوگوں نے ناشتے' کھانے اس قدر بڑھا لیے ہیں کہ عام آدمی اپنے گھر میں میلاد کی محفل کرتے ہوئے ڈرنے لگا ہے۔''

''ہاں...... یہ بات تو ہے خالہ جان! یہ کہہ کر میں وہاں سے کھسک گئی۔''

''میرے خیال سے بُوھیا جب فاروق کی شادی کی خوشی میں اپنے گھر میں میلاد کی محفل رکھے گی۔ تو شبو کو خاص طور پر بلائے گی۔''

''ارے تم لوگ یہ کیا منطق لے کر بیٹھ گئیں...... ہمارے ہاں اب خوشی کی محفلوں میں اللہ رسول کا نام لینا کم ہو گیا ہے۔ اب تو میوزک پروگرام ہوتے ہیں......ویسے اگر نعت پڑھنے بلایا تو ضرور جاؤں گی...... یہ دل پر لگانے والا زمانہ تو رہا نہیں......'تو نہیں اور سہی' والا دور ہے۔'' شبو قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

تب شاہدہ کے دل میں ایک ٹھنڈی سی لہر سرایت کر گئی۔ فاروق کی خاموشی ان کا دھیما پن' ان کی متانت' اس کے پورے وجود میں اتر کر نقرئی گھنٹیاں بجا رہی تھی......جس کے شور سے وہ بے دم ہو گئی تھی۔ اس وقت فاروق ان کے گھر میں تھے۔ قہقہوں کی آوازیں اس کے کانوں میں سیسہ سا ڈال رہی تھیں اور وہ ہونٹ کاٹ کاٹ کر خالی الذہن بیٹھی تھی۔ دوپٹے کا سوگ......اُسے نڈھال کیے دے رہا تھا......آج شاید میں ان کو اچھی لگ سکتی تھی۔ تو یہ چانس بھی مس ہوا......

اماں کی آواز جب چوتھی بار اس کے کانوں میں آئی تو بے دلی سے گلابی سوٹ پر نیوی بلو دوپٹہ پہنے نیچے اتر آئی۔

اس کی ساری کزنز اپنے اپنے ہتھیار سجائے بیٹھی تھیں اور پھوپو اپنے بالوں میں خضاب لگائے' وہی دوپٹہ پہنے فاروق کی کسی بات پر مسکرا رہی تھیں۔ تب اس کا دل چاہا کہ دوپٹہ ان کے سر سے نوچ کر جھیر جھیر کر دے۔ پھوپو اس قدر بری بھی لگ سکتی ہیں' اس کا احساس آج پہلی دفعہ اسے ہوا تھا۔

وہ سب کے پیچھے' ایک کرسی پر بڑی خاموشی سے بیٹھ گئی۔ فاروق......شبو کی کسی بات پر ہنسے تو انھوں نے دیکھا۔ وہ بالکل چپ چاپ اداس سی بیٹھی تھی۔ اور نہ جانے کن سوچوں میں ہلکان ہو رہی تھی۔

''ارے آپ کو کیا ہوا' بہت خاموش ہیں۔'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

''جی' کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ یکدم گھبرا کر بولی۔

پھوپو نے اسے دیکھا' تو ہنس کر اس کے پاس آئیں۔ ''اوے شدّو! تم یہاں ہو' میں تمہیں نیچے ڈھونڈ رہی تھی...... پڑوس کی راحیلہ تمہارا دوپٹہ لے کر گئی تھی دیکھنے کے لئے......اب واپس

کرنے آئی تو میرے اوپر منڈھ گئی...... لو بھئی' اپنا دوپٹہ خود اوڑھو۔'' یہ کہہ کر وہ نازک سا دمکتا دوپٹہ اس کو اڑھا دیا...... کہ وہ ماتھے تک ڈھلک آیا۔ فاروق اس کو شرماتا دیکھ کر دلچسپی سے دیکھنے لگے اور پھوپو اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے اس کی بلائیں لینے لگیں۔

شاید وہی لمحہ تھا...... جب فاروق اور ان کی اماں کے دل میں شاہدہ کے لیے محبت بھرے جذبات ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرح اُبل پڑے......!

چٹ رشتہ دیا اور پٹ شادی ہوئی......اور یوں شاہدہ بیگم لاہور سے کراچی آ گئیں۔ کراچی آئیں تو اس حقیقت کا بھی ادراک ہوا کہ ان کی امارت کے قصے' جتنے لاہور میں اڑے ہوئے تھے۔ وہ اتنے سچ تو نہیں تھے۔ ان کا گھر متوسط طبقے کی عکاسی کرتا تھا۔

لاہور میں ان کے ہاں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ ساتھ رہنے کے یہ بھی مزے تھے کہ کام بھی سب میں تقسیم تھا' یوں ان کو وہاں اتنا کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا...... اور یہاں گھر کا سارا کام خود کرنا پڑ رہا تھا۔ پھوپو بھی نہیں تھیں جو ہاتھ بٹاتیں۔ شروع شروع میں تو وہ بطور انجوائے منٹ کرتی رہیں۔ مگر جب بچوں کی آمد شروع ہوتی چلی گئی۔ تو یہی کام ان کو کھٹکنے لگے۔ فاروق کی اماں جو ابتدائی دنوں میں بہو پرواری صدقے جاتی تھیں...... بعد میں خالی اکل کھری سے بن گئیں۔

فاروق کے علاوہ ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس کی ساس اتنی ظالم تھیں کہ انھوں نے اس کو اپنے اکلوتے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور تک جانے نہیں دیا تھا۔ بیٹی پر ہونے والے مظالم وہ اپنے دل پر سہہ سہہ کر نفسیاتی مریضہ بن گئی تھیں۔ غیر ارادی طور پر وہ شاہدہ کی ہر اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتیں۔ جو رضیہ کے لیے اس کی ساس کرتی تھیں۔

شاہدہ کو اس بات کا ارمان ہی رہ گیا تھا کہ وہ چھٹی کے دن دیر تک سوتی رہے۔ جمعہ کے دن دیر تک سونا شاید اُس کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔

'فیروز ولا' میں اس کی اپنی بھابیاں دیر تک بستر پر پڑی اینڈتی رہتیں۔ مگر کوئی ان کے لتے نہ لیتا۔

''اے ہے...... ایک ہی تو چھٹی کا دن ہوتا ہے بیچاریاں ذرا آرام کرلیں تو کیا ہے۔'' اس کی اماں ہمیشہ اپنی بہوؤں کی سائیڈ لیتیں۔

اس کی سہیلیاں جب اسے فخر سے بتاتیں کہ جمعہ کے دن ان کے ہاں ناشتا گیارہ بجے ہوتا ہے۔ تو وہ ان کو ایسی رشک بھری نظروں سے دیکھا کرتی کہ جیسے وہ کہیں کی شہزادیاں ہوں یا جن کی حکومت کی پوری پوری دسترس اپنے گھر پر پوری طرح ہو۔

ایک وہ بھی کہ اس کے لیے سارے دن برابر تھے۔ جمعہ کبھی جمعہ ہی نہیں لگتا تھا۔ اگر کبھی وہ

بستر پر لیٹنا بھی چاہتی تو اس دن ساس صاحبہ کو چائے پینے کی طلب جلدی ہونے لگتی یا میاں صاحب اتنی زور سے یٰسین شریف کا ورد کرنے لگتے کہ وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔

''ارے......ابھی زندہ ہوں...... جب مر جاؤں' تب سرہانے بیٹھ کر یٰسین پڑھنا۔'' وہ جل کر کہتی۔

''ارے شدّو کیسی باتیں کرتی ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ نماز کے بعد میں سورتیں پڑھتا ہوں۔'' فاروق مسکرا کر کہتے۔

''جی ہاں...... مجھے اچھی طرح معلوم ہے' روز سنتی ہوں مگر آج جمعہ ہے' کیا میں تھوڑی دیر سو نہیں سکتی؟ کیا آپ یہ سورتیں آہستہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔''

''اوہو......ناشتے کے بعد سو جانا۔ کوئی منع کر رہا تھا کیا؟''

''جی نہیں......کوئی منع نہیں کرتا...... مگر ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے کے بکھیڑے شروع ہو جائیں گے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مہمانوں کی آمد و رفت' شام کی چائے' رات کا کھانا' پھر چائے۔ یوں رات کے بارہ بجے انشاءاللہ سونے کے لیے لیٹ ہی جاؤں گی۔''

''ارے لیٹ کر کیا کرو گی...... وہ گلابی کامدانی والا دوپٹہ تو اوڑھ کر دکھا دو۔ جو پھوپو کے ساتھ پلان بنا کر ماتھے تک اوڑھا تھا۔''

''دیکھیے مذاق مت کریں۔'' وہ خجل سی ہو گئی۔

''ارے یہ مذاق تھا...... بھئی ہماری زندگی کا نیا باب اس مذاق کے طفیل شروع ہوا...... ورنہ ہم نے تو آپ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔''

''ارے اب آپ کو سنا ہمیں دیکھتے ہیں...... ہم کام کر کر کے تھک جائیں آپ کو پروا تک نہیں ہوتی...... 'فیروز والا' ...... میں زندگی بھر اتنے کام نہیں کیے۔ جتنے آپ کے گھر میں آ کر کرنے پڑ رہے ہیں......''

''شدّو جان...... یہ گھر تمہارا ہے' ہم تمہارے ہیں' بچے تمہارے ہیں۔ اگر ان سب کا کام کرتی ہو تو کیا ہوا......؟ مگر تمھیں تو آرام کرنے کا شوق ہے......؟''

''جی نہیں...... میں انسان نہیں ہوں...... آرام میرے نصیب میں کہاں آ سکتا ہے۔''

وہ کلس ہی تو گئی......!

''اُفوہ' ایک تو تم بُرا بہت جلد مان جاتی ہو۔''

''پاگل جو ہوئی' دماغ خراب ہے میرا' میری سمجھ میں تو کسی کی بات ہی نہیں آتی' شکر کرو کہ صرف بُرا ہی مانتی ہوں۔ ڈھیلا کس کے کسی کے نہیں مارتی ورنہ شادی کے اتنے کم عرصے میں

ہر کسی کا دماغ تھوڑا خراب ہوتا ہے۔ مگر میں تو پاگل بن کر رہ گئی ہوں...... جب جس کا دل چاہے مجھے باتیں سُنا دے۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''خدایا خیر کرے...... آج تو چھٹی کا آغاز ہی تم نے چیخم دہاڑ سے کیا ہے۔''

''کیا کہا۔ میں چیختی ہوں' دہاڑتی ہوں...... ارے صاحب! اگر کوئی تیز قسم کی بیوی آپ کے پلے بندھ جاتی تو آپ تو آپ' آپ کی اماں کے بھی ہوش ٹھکانے آ جاتے' شکر کیجیے۔ بلکہ روزانہ نفل پڑھا کریں کہ مجھ جیسی بیوی' آپ کو ملی۔ میرے جیسی آپ کو کبھی مل نہیں سکتی تھی۔''

''ہاں بھئی۔ یہ بات تو مانتے ہیں کہ تم جیسی مجھ کو ہرگز نہ ملتی۔'' فاروق مسکرا کر بولے۔

''چلو شکر کہ کوئی حقیقت تو تسلیم کی۔'' وہ سادگی سے ہنس پڑی۔

''ارے جناب! ہم تو ہر بات آپ کی مانتے ہیں...... اب آپ آرام کیجیے۔ آج جمعہ کا دن ہے۔ آج زیادہ ہلنا جُلنا گناہ کے زمرے میں آتا ہوگا...... میں ناشتے کے لیے حلوہ پوری بازار سے لے آتا ہوں۔''

'حلوہ پوری لائیں گے آپ؟'' وہ تنک کر بولی۔

''کیوں کیا مضائقہ ہے...... بچوں کو بھی بہت پسند ہے' آپ کو بھی باورچی خانے میں جانے سے نجات ملے گی......''

''ارے مجھے چھوڑیں...... اپنی لتاں کی پسند کا خیال رکھیں۔''

''اوہو...... اب اس عمر میں' میں تمھیں کہاں چھوڑوں گا اور تم پہلے بھی اماں کو پسند تھیں اب بھی ہو۔''

''اللہ! کیا بے کار کی باتیں لے بیٹھتے ہیں آپ۔ میں کچھ کہہ رہی ہوں' آپ کچھ جواب دے رہے ہیں...... حلوہ پوری لینے جا رہے ہیں اور پچھلے جمعے کا فضیحتہ آپ بھول گئے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

'ارے بھئی' حلوہ پوری آپ کی اماں جان کو پسند نہیں ہے۔ ان کے حلق میں چپک جاتی ہے۔ ان کو ایسے پھندے لگنے لگتے ہیں کہ دوسروں کا کھانا تک دوبھر کر دیتی ہیں۔ کس قدر تو اوک رہی تھیں کہ سب نے منہ کا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ طبیعت علیحدہ مالش کرنے لگی تھی۔ اور طبیعت خرابی کے باوجود مجھ پر کتنا اچھل کر آ رہی تھیں کہ ان کے لیے ناشتے پر پراٹھا کیوں نہیں پکایا تھا۔''

''اماں کے لیے تو تم پراٹھا پکا دو...... باقی کا ناشتہ میں لے آتا ہوں۔''

''سنیے...... جب میں ایک پراٹھا پکا سکتی ہوں تو چار اور بھی پکا سکتی ہوں...... آپ اپنے

بچوں کو نہیں جانتے۔ ناشتے کی میز پر انھیں جو چیز کم نظر آئے گی۔ آپ کے بیہودہ بچے اُسی سمت لپکیں گے۔ مت کیجیے یہ مہربانی آپ...... اور تم کیا سمجھتے ہو' میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ ناشتے کے دوران آپ کہیں گے۔ بچوں کے لیے دو پراٹھے اور ڈال دو۔ میں خود ہی سب کے لیے ناشتہ گھر میں بنا لیتی ہوں۔ میری قسمت میں تو چھٹی کے دن کا بھی آرام نہیں ہے...... پتہ نہیں کیسے ہوتے ہیں وہ مرد...... جو اپنی بیویوں کے آرام کا خیال رکھتے ہیں...... ارے اب تو مائیاں بھی جمعے کے دن کام کی چھٹی کر لیتی ہیں...... مشین بھی کام کر کر کے خراب ہو جاتی ہے۔ ایک ہماری قسمت ہے کہ کم بخت بخار بھی چڑھ جائے تو اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بس گھرداری میں اپنی زندگی جھونک دی ہے۔''

''یوں کرتے ہیں' تم تھوڑی دیر اور سو لو جب تک میں خود ناشتہ تیار کرتا ہوں۔''

''آپ ناشتہ پکائیں گے!'' وہ ہنسی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

''کیوں' کیا ہوا۔ جب میں لندن ایم ایس کرنے گیا تھا...... تو کچن کا کام بھی سب خود کیا کرتا تھا۔''

''مگر میاں جی...... یہ لندن نہیں ہے' یہ آپ کی اماں جان کا گھر ہے۔ جہاں کی واحد نوکرانی بھی صرف میں ہوں۔''

''مگر مجھے پراٹھے پکانے بہت اچھے آتے ہیں...... یوں کرو' تم آج بستر پر لوٹیں لگاؤ...... آج مابدولت پراٹھے پکا کر کھلاتے ہیں' کیا یاد کرو گی۔'' وہ خوش دلی سے بولے۔

''ارے صاحب' آپ یہ ظلم نہ کریں ہم پر۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''عجیب عورت ہو' کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتیں۔''

''کمال ہے کہ آپ اپنی اماں جان کا مزاج بخوبی جان کر ایسی باتیں کرتے ہیں...... اگر آپ نے باورچی خانے میں جا کر پراٹھا پکانا تو درکنار...... پکا پکایا پراٹھا بھی گرم کر لیا نا تو وہ بھی آتے گئے کو بتائیں گی کہ شاہدہ تو صرف پلنگ توڑتی ہے' باورچی خانہ تو میرے بیٹے نے سنبھال رکھا ہے۔ یاد ہے' اس رات آپ میرے لیے کیتلی سے صرف چائے اُنڈیل کر لے آئے تھے تو اس کی کتنی کہانیاں انھوں نے گھڑ لی تھیں......''

''ارے لتاں کی باتوں کی پروا مت کیا کرو...... ان کا کیا ہے۔ وہ تو ایسے ہی بولتی رہتی ہیں؟۔

''جی ہاں' ان کا ایسے ہی بولنا...... بعض دفعہ دوسرے کے ذہن میں پتنگے بھر کر رکھ دیتا ہے۔''

"شاہدہ......وہ دل کی بُری نہیں ہیں۔ بہت چاہتی ہیں تم کو۔"

"سنو......کسی کے دل میں جھانکا تو نہیں جا سکتا۔ میں کیا جانوں کہ وہ دل کی اس سے بھی زیادہ بُری ہوں گی۔"

"آج کیا میں روزہ رکھ لوں فاروق......دس بج گئے۔ ابھی تک ناشتے کا پتہ نہیں۔" بڑی بی نے اپنے کمرے سے آواز لگائی۔

"سن لی آپ نے' اپنی اماں کی آواز......ذرا سامنے والی کلاک پر ایک نظر ڈال لیں۔ ابھی ساڑھے سات بھی نہیں بجے اور انھوں نے دس بجا دیئے......چندرا کر بات کرنا' تو کوئی ان سے سیکھے۔"

"ارے چھوڑو بھی......بچوں اور بوڑھوں کو بھوک زیادہ لگتی ہے۔"

"مگر وہ مانتی کہاں ہیں' ہر آئے گئے کے سامنے یہی رونا روتی ہیں کہ اُن سے کچھ کھایا ہی نہیں جاتا ہے۔"

"ارے چھوڑو ان کی باتوں کو۔ تم نے سنا نہیں کہ بچے جتا کر کھاتے ہیں اور بوڑھے چھپا کر۔"

"مگر ہماری قسمت میں تو دردِ سری ہی لکھی ہے نا۔" وہ اکتا کر باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"ارے شدو جانی! کہہ دیا نا' اب کے جمعہ کو تم دیر سے اٹھنا......مابدولت تمھیں بالکل نہیں جگائیں گے۔ تم خوب سونا بنانا۔"

اور جب اگلا جمعہ آیا تو وہ فجر کی نماز پڑھ کر سو گئی۔ ابھی نیند کچی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بُری طرح سر پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ اس کا ذرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ جا کر فون اٹینڈ کرے۔ مگر فون کرنیوالا ابھی بڑا ضدی تھا۔ مسلسل رنگ کیے جا رہا تھا۔

اس نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔ فاروق بھی سو رہے تھے۔ اور جب وہ بڑبڑاتی ہوئی ایک ٹھوکر سے دروازہ کھولتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں پہنچی تو ساس صاحبہ بات ختم کر کے ریسور کریڈل پر رکھے پھکا پھک روئے چلی جا رہی تھیں۔

اس نے اپنی نیند بھری آنکھوں سے انھیں غور سے دیکھا۔ ان کے رونے کا وہی روایتی انداز تھا......آنسوؤں سے زیادہ منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ حسب عادت اپنی ناک کو رگڑ رگڑ کر سرخ کیے دے رہی تھیں۔ وہ کندھے اچکا کر پھر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

"کس کا فون تھا؟" فاروق بھی اٹھ گئے تھے۔

"پتہ نہیں......" وہ گُھرتل پنے سے بولی۔

"رانگ نمبر تھا؟"

"نہیں' اماں نے بات کی ہے؟"

"کچھ بتایا نہیں؟"

"نہیں۔"

"کوئی خاص بات؟"

"نہیں بھئی وہی روایتی انداز میں فون سن کر خوب دھوم دھام سے رو رہی تھیں۔"

"اُن کے رونے سے تو میں تنگ آ گیا ہوں۔" فاروق بھی بیزار ہو کر بولے۔ یہ حقیقت تھی کہ ان کے ہاں کوئی بھی آتا۔ وہ سب کے گلے مل کر خوب روتیں' جو اُن کی اس عادت کو جانتے تھے' وہ ان کی اس ادا کو ان کی شدید محبت سے تعبیر کرتے' اور ناواقف' ظالم بہو کو کڑے تیور سے دیکھ کر چلے جاتے......فون پر کوئی عزیز' رشتے دار بات کرتا تو بات کے جواب میں ایسے دُکھ سے روتیں کہ بات کرنے والا پریشان ہو جاتا اور یوں لگتا کہ جانے اس بڑھیا پر اہل خانہ کیا قیامتیں توڑ رہے ہیں۔ جو اُن سے برداشت نہیں کی جا رہیں۔ ان کے رونے کے لیے کسی خاص بات کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ اپنی دوا رکھ کے بھول جاتیں۔ تب روتیں......نہانے میں آلکس آتا جب روتیں......ان کے چپل' اگر کوئی پوتا' پوتی پلنگ کے نیچے اِدھر اُدھر کر دیتا تو وہ اس کو روتے ہوئے ڈھونڈتیں اور بڑبڑاتیں علیحدہ' کر لو مجھ بڑھیا کو تنگ' پتہ ہے کہ لاچار ہوں......تمہارے گھر میں پڑی ہوں......آج میرا بڈھا زندہ ہوتا تو میں دیکھتی کہ کون میری چیزوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔

ان کی بہو......اگر انھیں پہلے کھانا کھلا دیتی تو روتیں۔ "اے ہے۔ کم بخت نے مجھے پہلے کھلا دیا۔ بعد میں جانے کیا مال ٹھونسے گی۔" اگر کسی وجہ سے ان کو دیر میں کھانا ملتا۔ تب وہ چلا کر روتیں' اے ہے اب تو بھوک مر گئی' سوکھ گئیں آنتیں' اب کس کے حلق سے اترے گا' جو چاہتے تھے وہی ہوا......بچ گئی روٹی تمہاری' رکھ دو سینت کر فریج میں......"

رونے کے علاوہ ان کے دو شوق اور بھی تھے......یا تو بڑی بڑی نمازیں پڑھتیں یا پھر گھوڑے بیچ کر سوتی رہتیں۔ ایسا سوتیں کہ فرض نمازوں کا بھی خیال نہ رہتا۔

یہ بھی ان کا دعویٰ تھا کہ ان کو بے حد سچے خواب نظر آتے تھے......بلکہ ہر ہونے والی بات کا پہلے سے ہی اشارہ ہو جاتا تھا۔ اکثر ان اشاروں' کنایوں کے چکر میں وہ گھنٹوں سوتی رہتیں۔ محلے کی عورتیں ان کو بے حد مانتی تھیں۔ صابرہ کی اماں کو جو پھونک کر پانی دیا......اس کو پینے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹے کی نعمت سے نوازا تھا۔

سلطان کی بیٹی کا رشتہ بھی ان کے وظیفے پڑھنے سے آیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ رشتہ طے ہونے کے بعد اس نے ان کا کوئی احسان نہیں مانا اور کہہ دیا کہ اس کی بیٹی خود ڈاکٹر تھی' اس کے پیچھے تو رشتوں کی فوج تھی۔

ان کے سچے خواب ایسے بھی ہوتے تھے' تمہاری اماں نے جو جہیز میں تمہیں قالین دیا تھا نا...... وہ لنڈے کا تھا۔ جب ہی تو میں کہوں کہ اتنی جلدی خراب کیسے ہوگیا۔ بھئی پانچ سال میں تو دری بھی خراب نہیں ہوتی۔

وہ اب ان سے کیا کہتی...... کہ میں اگر اکل کھری ہوتی تو مجال تھی کہ قالین خراب ہوتا' کھانا اس پر کھایا جاتا...... ساس کا پاندان مستقل وہاں جما رہتا۔ کتھے چونے کی کلیاں اس پر بیٹھ کر رگڑی جاتیں۔ رضیہ جب آتیں' تو ان کی فوج اسی قالین پر سوتی...... صبح کے وقت پیشاب میں بھیگا دیکھ کر' کبھی اس نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی۔ اس قدر تو بڑی بی کنجوس تھیں کہ انھیں اپنے کمرے کا کوڑا باہر پھینکتے ہوئے دل دُکھتا ہے۔ اور شاہدہ کے قالین کے بارے میں انھوں نے ایسا سچا خواب دیکھ لیا تھا کہ اس سے بار بار کہہ رہی تھیں کہ اس کو باہر اٹھا کر پھینک دو۔

''اے ہے ناس پیٹے کو پھینک بھی چکو...... کوئی دوسرا لاؤ۔ لاحول و لاقوۃ رات کا خواب دیکھ کر تو مجھے ابھی تک ہنسی آ رہی ہے۔'' وہ شاہدہ کو ہنس کر کہتیں۔

''ہنسی کی ایسی کیا بات ہوگئی۔''

''بھئی میں نے خواب میں دیکھا کہ اب کی بقرعید کو تمہاری فاروق سے لڑائی ہو جائے گی اور فاروق قربانی کے لیے کوئی جانور نہیں لائیں گے۔ تم مسالے پیس کر پڑوس سے آنے والے گوشت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہو گی۔''

''خواہ مخواہ میں......'' وہ بُرا مانتی......

''اے ہے...... پارسال کی بات بھول گئیں۔!''

''کون سی بات' جانے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔''

''اے لو...... بھولنے والی بات تو نہیں تھی......''

''بھئی...... مجھے یاد نہیں آ رہی' آپ ہی بتائیے۔'' وہ زچ ہو کر بولی......! تب وہ پان سے بہتی باچھیں اس کے پاس پڑے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہتیں۔

اے ہے...... پچھلے سال بقرعید کو فاروق مہنگا بکرا لے آئے تھے۔ تو تم دونوں میں کس قدر تو تکار ہوئی تھی۔ تمہاری بے ڈھنگی باتیں سن کر فاروق نے کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ بکرا نہیں لائیں گے...... تم بقرعید کے گوشت کو ترسو گی۔''

''اوہ...... تو آپ کو خواب میں نہ صرف اشارہ ہوا بلکہ سال گزشتہ کی تلخ باتیں بھی یاد دلائی گئیں......'' اس نے جل کر کہا۔

''ہاں بھئی یہی بات ہے۔ تم چاہو تو یہ تہوار فیروز ولا' میں جا کر منالو......'' انھوں نے اسے مزید جلایا۔

''جی نہیں...... میں اتنی گوشت خور نہیں ہوں۔ پورے سال گوشت سے زیادہ سبزیاں رغبت سے کھاتی ہوں۔''

اف خدایا...... کیسی کیسی بے تکی باتیں وہ گرہ میں باندھ کر کلیجے میں چھپا لیتی تھیں۔ بہو پر جب طعنے مارنے کے اوچھے ہتھیار ختم ہونے لگتے۔ تو خوابوں کی وساطت سے وار کر کے محظوظ ہوتی تھیں۔

رضیہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی اور اس کی ساس اس بیچاری کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتی تھیں۔ مجال ہے کہ کبھی ان کے دل میں بہو کے لیے محبت جاگے۔ بیٹی اور وہ بھی ایک...... پھر وہ اس قدر دُکھی۔ اس کی حالت پر وہ خوب روتیں...... دن رات اس کے لیے وظیفے کرتیں۔ مگر اس کی ساس پر رتی بھر بھی اثر نہیں ہوتا تھا...... اُدھر ان کی بہو تھی جسے 'فیروز ولا' سے منتخب کر کے ہمیشہ پچھتاتی تھیں' وہ ان کی بیٹی کے مقابلے میں کس قدر معمولی اور گہری سانولی رنگت کی تھی۔ ذرا سا گھر کا کام بھی اٹھا پٹخ کر کرتی تھی...... مگر کس قدر خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ فاروق اس قدر بیوی کی بات مانتے تھے کہ جیسے اس کے جنگی قیدی ہوں۔ مجال ہے کہ کبھی بیوی کی دل شکنی کریں۔ کبھی نوک جھونک بھی ہوتی تو ان نواب زادی کو خوب مناتے۔ جرمانے کے طور پر خوب شاپنگ کراتے۔ اور وہ الل ٹپ خریدے چلی جاتی...... میاں کے پیسے سے کسی قسم کی ہمدردی ہی نہیں تھی۔ تفریح کرنے پر آتی تو خوب گھومتی ہی رہتی...... روز آنے جانے میں' نہ تو اس کی ٹانگیں دُکھتیں اور نہ ہی اس کا دل گھبراتا...... تب کہیں جا کر اس کا موڈ بحال ہوتا۔ اس کو خوش دیکھ کر فاروق مسرور سے ہو جاتے۔ یہی باتیں دیکھ دیکھ کر بڑی بی کے آگ لگ جاتی۔ 'اونہہ کم بخت کی شکل نہ صورت' اترانا تو دیکھو...... کیسے میرے چھ فٹ کے بیٹے کو دبا کر رکھا ہوا ہے اور میری بیٹی پریوں جیسی' کس قدر گالی لات پر زندگی بتا رہی ہے۔ جہاں سے ساس کی مکاریاں ختم تھیں' وہاں سے اس کے میاں کی چلتر بازیاں شروع تھیں۔ اور بڑی بی اپنی بہو کی اس قدر رشک آور زندگی پر اشک بار ہو جاتیں۔

فارغ اوقات میں...... ان کا اس قدر رونے دھونے کا پروگرام رہتا تھا کہ گھر میں کسی اور کے رونے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود ساس کی ان حرکتوں کی وجہ سے شاہدہ اپنی

سسرال میں تیز قسم کی بہو سمجھی جاتی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی ساس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ مگر ساس کی اوچھی حرکتیں اسے بدنام کیے دے رہی تھیں۔ ایک دفعہ ایک سسرالی رشتے دار نے ان کے ہاں چائے پیتے ہوئے ریشم میں لپیٹ کر جوتا لگا ہی دیا۔ ''ارے بھائی' ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ جو جس کے ساتھ کرتا ہے۔ اب تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ہی جواب دکھا دیتا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' اس نے استفہامیہ نظروں سے پوچھا۔

''بات صاف ہے...... آپ جتنا خیال...... ہماری پھوپو کا رکھتی ہیں۔ ایسا ہی خیال آپ کی بہوئیں آپ کا رکھیں گی۔''

''ارے اس کا دس فی صد بھی نہیں رکھ سکتیں...... ہم تو پھر پرانی نسل کے لوگ ہیں۔ بزرگوں کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور ان کے ادب و آداب کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ نئی نسل تو صرف ہماہمی کی نسل ہے...... صرف اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ اگر یہ لوگ ہمارا خیال رکھیں گے تو بہت اچھا ہے' اگر نہیں رکھا تو ہمیں کسی سے کوئی گلہ بھی نہیں ہوگا بلکہ یہ ہمارا نصیب ہوگا۔''

تب وہ کھسیا کر پھوپی سے بولی...... ''اللہ پھوپی آپ ہمارے گھر چلیے نا...... دو چار دن ہمارے پاس رہیں' ہمیں بھی خدمت کا موقع دیں۔''

اور وہ خوش ہو کر اس کے ساتھ چل دیں...... مگر وہاں دو چار دن رہنے کے بجائے۔ اگلے دن ہی بھاگی چلی آئیں اور وہاں سے آ کر یوں پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ جیسے پٹ کر آئی ہیں یا لڑ جھگڑ کر......

''کیا ہوا اماں!'' یکبارگی فاروق بھی گھبرا گئے۔

''اوئے' اس کے ہاں تو رات کا کھانا بھی رات کے گیارہ بجے ملا۔ میں تو آدھی رات تک بھوکی بیٹھی رہی۔ بھوک سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کم بخت مجھے اپنے گھر لے جا کر بھوک کی مار دے گی...... اے لو...... میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ جو وہ مجھے یوں تکلیف دینے اپنے گھر لے گئی۔''

''لمّاں اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں...... اکیلی کرنے والی ہے...... جب پکتا تب ہی تو کھلاتی۔''

''اے ہے...... تمہارے چھوٹے بچے نہیں ہیں...... تمہارے آگے کون سے خانساماں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔''

''ارے لمّاں جان!...... آپ میری کیا مثال لے بیٹھیں...... اب ہر کوئی میری طرح تو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ناچنے سے رہا' میں اگر سب کا خیال رکھتی ہوں...... تو مجھے کون اچھا

سمجھتا ہے۔''

''اے ہے...... ہم سمجھتے ہیں۔''

''جب ہی سب کے سامنے یوں پھوٹ پھوٹ کر روتی ہیں۔''

''ارے وہ تو میرا دل ہی ایسا ہے۔ کیا ٹی وی کے دُکھیا قسم کے ڈرامے دیکھ کر نہیں روتی۔ مجلسیں سُن کر میرا حال کس قدر بُرا ہو جاتا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھالی جاتی۔''

''اب اگر فہمیدہ نے آپ کو رات کو کھانا دیر سے کھلایا تو اس میں رونے کی کیا بات ہوئی۔''

''اے ہے...... کم بخت نے اس پر ہی بس نہ کیا۔ بازار کے پان کھلا دیے۔ سارا میرا منہ کٹ کر رہ گیا۔ ناشتے میں سوکھی ہوئی باقر خانیاں اور رات کے باسی کباب رکھ دیے۔''

''جس کا جیسا دستور ہوتا ہے' وہ وہی کرتا ہے' اپنے گھر جیسی بات تو کہیں نہیں ہو سکتی نا......! اس میں رونے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آخر وہ آپ کو اتنی محبت سے لے کر گئی تھی۔''

''نہیں بھئی...... تم نہیں سمجھو گی۔'' وہ جھلائیں۔

''اے لو...... اس میں نے سمجھنے کی ایسی کون سی بات ہے۔''

''بھئی مجھے تو اس بات پر رونا آ رہا تھا کہ دیکھو میں باؤلی یہاں بیٹھی ہوں۔ اور تم لوگ گرما گرم پراٹھے اور انڈے کھا رہے ہو گے۔''

''اوہ...... وہ پراٹھے کھائے بنا آپ کے حلق میں اٹک گئے۔'' فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا اور بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''اے زیادہ مت ہنسو۔ ورنہ وہ پھر رو پڑیں گی۔'' اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بچوں کو سرزنش کی۔

لمّاں کا رونا یا ہنسنا ہمیشہ وقتی ہوتا تھا۔ دو چار منٹ رو کر وہ ایسے قہقہے لگاتی تھیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ روئی بھی ہیں یا نہیں۔

مگر آج صبح فون سن کر جو انھوں نے رونا شروع کیا تھا' وہ ناشتے کی میز پر بھی قائم تھا۔ نوالہ نگلنے کے بعد خاصی اُوں اُوں جاری تھی۔

''اماں...... کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ ناک پونچھتے ہوئے بولیں۔

''اوں ہوں' بات تو ضرور ہے کچھ۔'' فاروق توس پر جام لگاتے ہوئے خوشدلی سے بولے۔

''آج صبح...... رضیہ کا فون آیا تھا۔'' ان کا رونا پھر روانی لینے لگا۔

”کیا ہوا رضیہ کو؟“ بہن کا نام سن کر وہ بے چین ہو گئے۔

”رضیہ کو تو کچھ نہیں ہوا؟“

”پھر کیا ہو گیا...... کیا قیامت ٹوٹ پڑی؟ کچھ تو بتائیے۔“ وہ جھلا اُٹھے۔

”اس کی ساس مر گئی۔“ وہ روتے ہوئے بولیں۔

رضیہ کی ساس کے مرنے پر اس قدر رونا...... شاہدہ کو خاصی حیرت تھی۔ یہ تو اس کی ساس کے لیے نہ جانے کتنے وظیفے پڑھا کرتی تھیں۔ اس کی شکل سے بے زار تھیں۔ جب کبھی وہ آ جاتیں تو بڑی بی ماتھے پر شکنیں ڈالے ایسے کڑوے لہجے میں اس سے بات کرتیں کہ وہ بھی کلس کر جلدی چلی جاتیں۔

یہ...... جو...... ان کے مرنے کی تمنائی تھیں۔ آج ان کے مرنے پر اس قدر دھوم دھام سے رو رہی تھیں کہ وہ ہکا بکا رہ گئی...... ! تب اس نے سوچا۔ یہ واقعی دل کی اچھی ہیں...... کسی کا برا نہیں چاہتیں، رضیہ کی ساس کے مرنے کا انھیں از حد رنج اور غم ہوا ہے۔ گھر کا پلا ہوا جانور بھی مر جائے تو گھر والے سوگوار ہو جاتے ہیں۔ یہ تو پھر ان کی بیٹی کی ساس تھیں۔ کسی کی ماں تھیں۔ خدا ہر ایک کی ماں کو سلامت رکھے۔ تب وہ بھی آبدیدہ سی ہو گئی؟

”تمہیں کیا ہوا؟“ فاروق نے اسے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

”رضیہ کی ساس مر گئیں۔“ وہ ہونٹ دباتے ہوئے بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کی ساس، اس کو گلے سے لگا کر یوں چیخ کر روئیں کہ فاروق کو یوں لگا کہ رضیہ اپنی ساس کو دفنانے ان کے گھر ہی چلی آئی ہو۔

”اماں...... آپ یوں رو رو کر ہلکان نہ ہوں بلکہ رضیہ کو جا کر بھی دلاسا دیں۔“ فاروق ان کو پانی پلاتے ہوئے سمجھاتے ہوئے بولے۔

”میں نے ہفتہ بھر پہلے ہی خواب میں دیکھ لیا تھا؟“

”کہ رضیہ کی ساس مریں گی۔“ فاروق جل کر بولے۔

”نہیں بھئی......“

”پھر کیا دیکھا تھا؟“

”میں نے دیکھا تھا، کہ اپنی رضیہ بہت خوش ہے، خوب کُھل کر ہنس رہی ہے، مارے خوشی کے ناچ رہی ہے۔ میں نے سوچا شاید اللہ تعالیٰ اس دفعہ اس کو بیٹے سے نوازے گا یا اس کے میاں کی ترقی ہو جائے گی...... بے چارے نوشاد میاں کب سے کلرکی گھسیٹ رہے ہیں۔“

”مگر اس کے اس دفعہ بھی بیٹی ہی ہوئی...... اور نوشاد میاں کی ترقی کا چانس بھی مس ہو گیا۔

آپ کا خواب تو سراسر جھوٹا ثابت ہوا۔“ فاروق ہنس کر بولے۔

”اور کیا؟ بالکل جھوٹا...... سو فی صد جھوٹا......“ شاہدہ نے بھی آنسو پونچھ کر فاروق کا ساتھ دیا۔

”اے ہے...... تم تو مت بولو......“ بڑی بی کلس کر بولیں۔

”لماں آپ سچے وچے کوئی خواب نہیں دیکھتیں...... اب خود ہی بتائیے۔ ہو گیا نہ آپ کا یہ خواب جھوٹا۔“ شاہدہ نے پھر ان کو چڑایا۔

”اے ہے...... سمجھتی کیا ہو تم اپنے آپ کو، نہ نماز کی نہ روزے کی...... میں تو پوری نمازیں پڑھتی ہوں، روزانہ پانچ ہزار وظائف کا ورد کرتی ہوں۔ تم تو تم...... تمہارے خاندان میں بھی کسی نے آگے پیچھے نہ کیا ہو گا۔“

”لمّاں، آپ کی ہر بات درست مگر یہ خواب تو آپ نے بالکل جھوٹا دیکھا۔“ شاہدہ نے ہنس کر انھیں پھر چڑایا۔

”اے ہے...... جھوٹا خواب دیکھتی ہو گی تم...... خدا کا شکر ہے میں اتنی عبادت گزار ہوں...... اتنا پڑھتی ہوں، عامل ہوں۔ مجھے تو ہر خواب سچا نظر آتا ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا رضیہ مارے خوشی کے ناچ رہی ہے...... ظاہر ہے کہ اس کی جلاّد قسم کی ساس مرے گی تو وہ دُکھیا، خوش ہو کر ناچے گی بھی نہیں۔“

”اچھا، یہ بات ہے۔“ فاروق، ماں کا یہ روپ دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔

”اماں جان...... آپ کو رضیہ کی ساس کے مرنے کی اس قدر خوشی ہے تو یہ رونا دھونا کس لیے تھا؟“ شاہدہ نے کلس کر پوچھا۔

”ارے بیٹی...... یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ تمہیں کیا پتہ، کہ ساسیں کیسی ہوتی ہیں؟“

”جی...... واقعی......“ وہ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسی۔

”ارے میری بیٹی...... میں تجھے کیا بتاؤں، رضیہ کی ساس۔ کم بخت...... بڑی ذلیل عورت تھی، میری گڑیا سی بیٹی کی زندگی اس منحوس عورت نے عذاب کر دی تھی۔ کون سی پابندی تھی جو اس کُتیا نے میری بیٹی پر عائد نہیں کی تھی۔ اللہ بخشے...... جنتی نے مر کر...... میری بیٹی کی خوشیوں کے سامان پیدا کر دیئے۔ جب تک زندہ رہی...... بڑی دوزخی تھی...... مگر اب خدا اسے جنت میں جگہ دے...... اب میری شہزادی کا گھر جنت نظیر ہو گا۔ جہاں اس کا چھوٹا سا گھر...... اس کے لیے محل سے کم نہ ہو گا۔ اس محل کی وہ تن تنہا شہزادی ہو گی۔ اپنی نیند سوئے گی، اپنی نیند اُٹھے گی۔ خدا بخشے اس کم بخت نے تو اسے ملازمہ بنا دیا تھا...... میری بیٹی کے لیے سارے دن برابر ہو گئے تھے۔

بیچاری کو جمعہ بھی نہیں لگتا تھا۔"

"آج بھی تو جمعہ ہے......" شاہدہ نے کچھ سوچا...... پھر دو آنسو لڑھک آئے۔

"اے......اب کیوں رو رہی ہو؟" فاروق نے پوچھا۔

"رضیہ کی ساس مر گئیں۔" وہ یُوں چیخ مار کر روئی کہ اس کی ساس بھی اس کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔

تب فاروق نے اپنا سر یوں تھام لیا جیسے وہ اس کے رونے کا مطلب نہ سمجھنا چاہ رہے ہوں۔

❀❀❀

وہ مِلے یوں
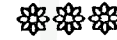
انٹر کا امتحان دے کر جیسے ساری تھکن اُتر گئی تھی۔ موٹی موٹی کتابوں کا رٹا ہوا وزن سر ہلا ہلا کر گردن سے اُتار پھینکا تھا۔ (مستقل سر کے درد سے نجات کی واحد صورت بھی یہی تھی)

اُن دنوں موسم خاصا خوشگوار ہو رہا تھا یا پھر ملیحہ کو ہی محسوس ہو رہا تھا۔ "امّاں ہم نانی امّاں کے ہاں رہنے کے لیے چلے جائیں۔" ایک شام اس نے کہا۔

"کیسے خیال آ گیا نانی کا؟ ان کی محبت کس کونے سے اُبھر آئی؟ وہ لاکھ بُلاتی رہیں' تم کہاں جاتی ہو؟" وہ طنز سے بولیں۔

"کہاں ملتی ہے مجھے فرصت۔ اب امتحان کا بکھیڑا ختم ہوا ہے تو سوچ رہی ہوں کہ نانی امّاں کے پاس ہو آؤں۔ ماموں اور خالائیں بھی یاد آ رہی ہیں۔"

"اچھا تمہیں بھی یاد آتے ہیں اپنے ننھیالی؟" اماں کا لہجہ بدستور روکھا تھا۔

"اگر آپ کا موڈ نہیں ہے بھیجنے کا' تو چھوڑیے۔ میں چھٹیوں میں بیکنگ کورس کر لیتی ہوں۔" وہ اُکتا کر بولی۔

"خدا کے لیے یہ بے تکے کورس تو کرنے نہ بیٹھو' چلی جاؤ اماں کے پاس۔ وہ تجھے بلا بلا کر ہار جاتی ہیں مگر تیرا دل نہیں چاہتا۔ اپنے باوا کو آنے دے' ان سے پوچھوں گی کہ کوئی جانے والا ہو تو تیرے لیے بھی ریل کے ٹکٹ لا دیں۔"

"ریل سے جاؤں گی میں۔ اس قدر تو کم بخت یہ ریلیں اُچھل اُچھل کر چلتی ہیں کہ اچھے خاصے آدمی کا پتا پانی ہو جائے۔ ہل ہل کر دماغ بھی کھسک کر سینے میں آ جاتا ہے۔" وہ سیخ پا ہو کر بولی۔

"ارے واہ۔ ریل سے زیادہ مزے کا سفر کس کا ہوگا۔ جھولے کی طرح لمبی لمبی پینگیں لیتے ہوئے جاؤ۔ مجھے تو اتنی اچھی نیند آتی ہے کہ سال بھر اپنے بستر پر نہ آتی ہوگی۔" لمّاں کے پاس ہر

مسئلے کا جواب فوراً موجود ہوتا تھا۔

"مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے ریل کے سفر سے۔ فرسٹ کلاس سلیپر میں اپنی سیٹ بک کروالو تب بھی مسافر ڈبے میں گھس آتے ہیں اور عورتیں تو اس قدر لڑاکا ہوتی ہیں۔ اپنی تمام بدوضع پوٹلیاں اٹھا اٹھا کر دوسرے کی سیٹ پر رکھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور پھر کوئی مائی کا لال اُن سے اپنی سیٹ خالی نہیں کرا سکتا۔ اور اگر کوئی ذرا سی بھی کوشش کرے تو گالیوں کا ایسا ایسا نادر ذخیرہ ان کے منہ سے اُبلنا شروع ہو جاتا ہے کہ جسے اگر احاطۂ تحریر میں لایا جائے تو کئی ڈکشنریاں مرتب ہو جائیں۔" ملیحہ نے خاصا بگڑ کر کہا۔

"اری باؤلی! بے کار میں پریشان ہو رہی ہے۔ تجھے اکیلا کون بھیج رہا ہے۔ کوئی تیرے ساتھ جانے والا مل جائے تو چین سے سفر بھی کٹ جائے گا...... اور تجھے دوسراہٹ بھی رہے گی۔ پوچھوں گی زینب کی ساس سے۔"

"خدا کے لیے اماں...... آپ مجھے ریل میں تو بھیجیں مت...... میں اتنا لمبا سفر کر کے نڈھال ہو جاؤں گی۔ کراچی سے اسلام آباد کا سفر بے حد طویل ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں نانی اماں سے مل آؤں تو پلیز مجھے ہوائی جہاز سے بھیج دیں کسی کے ساتھ کا بھی ٹنٹا نہیں ہوگا۔ میں اکیلے آرام سے چلی جاؤں گی۔"

"پھر بھی ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں...... اگر تجھے ڈر لگا تو۔" وہ سروتا گنگنا کر تفکر سے بولیں۔ "سفر تو پھر سفر ہی ہوتا ہے...... اکیلی کیسے جائے گی...... زینب کی ساس کا ساتھ ہو جائے تو مجھے بھی پریشانی نہ ہو...... خدا بھلا کرے، کسی کے کام کو ٹالتی نہیں ہیں۔"

"اماں میں زینب آپا کی ساس کے ساتھ تو جہاز میں بھی نہ جاؤں۔ بولنے کا انھیں اس قدر مراق ہے کہ الٰہی توبہ...... دماغ پچی کر کے رکھ دیتی ہیں۔"

"اے لو انھوں نے کب تم نازک پری کا دماغ پچی کر دیا۔" اماں کو غصہ آ گیا۔

"یاد کیجیے۔ حیدرآباد گئے تھے ان کے ساتھ...... میری بدنصیبی یہ تھی کہ میں نے کڑھی ہوئی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ بڑی بی کی نظریں پڑیں تو اچھل کر بولی تھیں۔ اے ہے۔ یہ خود کاڑھی ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دے کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

"کیسے کاڑھ لیتی ہو؟" وہ دلچسپی بے وجہ لے رہی تھیں۔

"بس ایسے ہی۔" میں نے کاندھے بے پروائی سے اُچکا کر ان کی طرف سے نظریں پھیر لی تھیں۔

"بھئی بڑا پتا مارنے کا کام ہے۔ آج کی لڑکیاں تو درزیوں کی جان کو روتی ہیں۔ کون اپنی

آنکھوں کا تیل نکالا کرتا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں روٹھی سی ہو گئی تھی۔

"ڈیزائن بھی خود ہی سوچتی ہوں گی؟"

"جی...... جی ہاں......"

"جب ہی تو چندیا پر بال کم ہیں...... سوچ سوچ کر موا ذہن بھی تھک جاتا ہوگا۔ کیوں ہے نا؟" انھوں نے مجھے جواب دینے پر زبردستی اُکسایا تھا۔

"جی بالکل۔"

"کڑوا تیل تم اپنے سر میں نہیں ڈالتیں؟ وہ ڈالا کرو، خوشبودار تیل نقصان دیتا ہے۔ بال بڑھیں گے تو دماغ بھی مضبوط ہوگا۔ اور اچھے اچھے ڈیزائن بھی دماغ میں آئیں گے۔"

"جی ہاں۔"

"تکیہ غلاف پر کبھی مور کاڑھا؟"

"جی نہیں؟"

"اے ہے۔ کبھی ہمارے گھر آنا۔ اپنے ہاتھ کے پُرانے بنے ہوئے تکیے غلاف دکھاؤں گی۔ ایسے ایسے مور اور طوطے کاڑھے کہ ہمارے میاں بیٹھک میں لے جا کر اپنے دوستوں کو دکھاتے تھے۔ کروشیے کا کمربند بھی بُنا؟"

"جی نہیں۔"

"لو دیکھو۔ ہم نے خود بُنا ہے۔" انھوں نے اپنا ریشمی رنگین کمربند دکھایا۔ "اور ڈیزائن ایسا مشکل ڈالا ہے کہ ہر کوئی ڈال نہیں سکتا۔" وہ ایسا ہنسیں کہ دل چاہا زنجیر کھینچ کر نیچے اُتر جاؤں۔ انھوں نے یہ حرکت کر کے میری برداشت ختم کر دی تھی۔

"بات کا بتنگڑ بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ اکیلی آسمان پر اُڑتی ہوئی جاؤ گی۔ ڈر نہیں لگے گا۔ خدانخواستہ اگر جہاز کسی برف کے تودے میں پھنس جائے تو۔ میں تو ساری زندگی روتی رہوں گی۔" اماں روہانسی ہو کر بولیں۔

"اوّل تو کراچی اور اسلام آباد کے مابین کوئی برف کے تودے نہیں آئیں گے۔ اور اگر کوئی سانحہ میری قسمت میں لکھا ہے تو زینب آپا کی ساس مجھے کس طرح بچا لیں گی...... بچانے والا تو خدا ہے۔"

"تو جانتی ہے کہ ذرا ذرا سی بات سے تو مجھے ہول آنے لگتا ہے جب تک تو پہنچ نہیں جائے گی میں یونہی پریشان ٹہلتی رہوں گی۔"

"حد ہوگئی ہے اماں! کیسی بچوں جیسی آپ باتیں کرتی ہیں۔ صرف ایک گھنٹا چالیس منٹ کی فلائٹ ہے۔ میں اپنے ساتھ زیادہ سامان بھی نہیں لے جا رہی۔ ایک بیگ ہوگا میرے پاس' وہ بھی اپنے پاس رکھوں گی۔ سامان آنے کا انتظار کرنا بھی نہیں پڑے گا۔ وہاں اسلام آباد ائرپورٹ پر سب ماموں ہوں گے' آرام سے گھر پہنچ جاؤں گی۔ سچ اماں جہاز کے سفر سے زیادہ کوئی سفر آرام دہ نہیں ہوتا۔ ریل میں رگڑ رگڑ کر جاؤ۔ دو دن کے بعد پہنچو۔ راستے میں ہی تین جوڑے میلے ہو جاتے ہیں...... اور پھر اتنا لمبا سفر...... لانڈھی کے بعد یوں لگتا ہے کہ اسی میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں پرورش پا کر اُتر رہے ہیں...... ریل کے سفر سے خدا بچائے...... صرف ریلوے میں ملازم لوگوں کو سفر کرنا چاہیے۔ بقیہ لوگ بے شک 'کوچ' سے سفر کرلیں مگر ریل سے نہ کریں۔"

"ارے تم تو ناشکری ہو۔ یہ ریلیں چل رہی ہیں تو بہتیرے بے چارے بغیر ٹکٹ کے سفر کر لیتے ہیں۔ غریب قلی سو' پچاس روز کے سیٹ کے چکر میں کما لیتے ہیں۔ بابو طبقہ بقیہ ریزگاری واپس نہ کر کے چائے' بوتل پی لیتا ہے۔ تم سے اپنے مظلوم طبقے کا ذرا سا بھی سکھ نہیں دیکھا جاتا۔" اماں نے تمباکو کا پھنکا مار کے ہنس کر کہا...... "بہتیرے افسانہ نگار سینکڑوں کہانیاں ریل میں گھڑ لیتے ہیں اور پھر تمہاری بڑی خالہ کا رشتہ ریل میں ہی تو طے ہوا تھا۔ بھئی ہم تو احسان فراموش نہیں ہیں۔ اپنی ریلوے کو دعا دیتے ہیں۔"

"خالہ کو ٹکٹ چیکر پسند آ گیا تھا یا گارڈ؟" ملیحہ کو مارے ہنسی کے اچھو ہوگیا۔ خالہ کی یہ کہانی اس نے اس سے قبل نہیں سنی تھی۔

"ارے ہونا کیا تھا ایک بڑی بی حیدر آباد سے چڑھی تھیں۔ لاہور تک انھیں افروز پسند آ گئی۔ لالہ موسیٰ پر انھوں نے رشتہ دے دیا۔ پنڈی اُترتے وقت وہ انگوٹھی پہنا کر اُتریں۔ اس قدر سلیقہ مند تھیں کہ اپنے بکس سے لال دوپٹہ تک نکال کر اوڑھا دیا تھا افروز کو۔"

"خالہ بے وقوف تھیں۔ پورا بکس ہتھیا لیتیں اور بعد کو چمپت ہو جاتیں۔ اتنی زبردست پرسنالٹی تھی۔ کہیں اور کیش کرتیں...... یہ کیا کہ پنڈی میں پڑی ہوئی ہیں۔ راجہ بازار کے پاس پرانی وضع کا بدشکل سا مکان ہے جس میں وہ رہتی ہیں۔ اس قدر خراب علاقہ ہے کہ توبہ بھلی۔"

"مگر تمہارے خالو کس قدر اچھے ہیں' کتنے پیار سے رکھا ہوا ہے' افروز کو انھوں نے۔ دن کو رات کہہ دے تو وہ اُسے رات ہی تسلیم کرتے ہیں۔"

"ارے اماں جانی! حسین لوگ اپنی بات منوانے پر قدرت رکھتے ہیں...... بڑی خالہ کے چاند جیسے چہرے میں اتنی طاقت ہے کہ خالو اُن کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہوتی کوئی

کالی کلوٹی پھر میں دیکھتی کہ یہی خالو ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے رہتے۔"

"کاش تجھ پر بھی کسی خالہ کے روپ کی چھینٹ پڑ جاتی۔" اماں نے اس کی سانولی رنگت کو ترحم بھرے انداز میں دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ (حالاں کہ تیکھے نقوش بے حد جاذبِ نظر لگتے تھے۔)

مگر ملیحہ ان کی یہ بڑبڑاہٹ سن چکی تھی۔

"پریشان مت ہوں اماں! میرے شادی کسی کالے بھجنگ آدمی سے کیجیے گا تاکہ میں اُسے حور لگوں۔" وہ ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے بولی۔

"اللہ مالک ہے۔" اماں اس کی توضیح سن کر خفت سے بولیں۔

یہ حقیقت تھی کہ اماں سمیت اس کا سارا ننھیال سُرخ و سفید افراد پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں بڑی فیاضی سے حسن بانٹا ہے جب کہ اس کی دُوھیال میں معمولی شکل و صورت کے لوگ تھے۔ نانی کے ہاں نہ جانے کی ایک وجہ اس کا یہ احساسِ کمتری بھی تھا۔ وہاں وہ ایک دم الگ سی لگا کرتی تھی۔ لاکھ صبح سے شام تک دسیوں دفعہ وہ منہ دھوتی...... کریم رگڑ رگڑ کر چہرے کی کھال پھاڑے دیتی۔ لائٹ سا میک اپ ہر وقت کیے رکھتی مگر وہاں سب بغیر منہ دھوئے بھی چمکے ہوئے نظر آتے۔

چھوٹی اور منجھلی خالہ کوئی سا رنگ بھی پہن لیتیں' وہ اُن پر پھوٹ پڑتا۔ اور وہ ان کے سامنے نکھرے ہوئے پُرمسرت رنگ بھی پہنتی تو بُجھ کر رہ جاتی۔

"بڑے ماموں کی سسرال بھی ہو کر آئیو۔" لتاں نے کچھ سوچ کر کہا۔

ان کی بات کی گہرائی جان کر ملیحہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ بڑی ممانی کے چھ بھائی تھے اور وہ سب کے سب اسلام آباد میں ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ چھ میں سے چار کنوارے تھے۔ جن کی جانب خاندان بھر کے لوگوں کی نظریں لگی تھیں۔

"مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ ماموں کی سسرال میں گھومتی پھروں۔" اس نے جان بوجھ کر اماں کو سنایا۔

"صبیحہ بھابی کس قدر محبت کرتی ہیں...... کسی دن جا کر ان کی اماں کو سلام کر آؤ گی تو کیا ہو جائے گا۔" لتاں نے خاصے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ویسے بھی وہ اس کے ہاتھ بڑی ممانی اور ان کے بچوں کے لیے ڈھیروں ڈھیر چیزیں بھیج رہی تھیں۔ اسلام آباد کوئی بھی جانے والا ملتا وہ اس کے ہاتھ بڑی ممانی کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجنا فرض سمجھتیں۔

"لتاں یہ تو سُنا تھا کہ بھائی اپنی بہنوں کے لیے سوغاتیں بھیجا کرتے ہیں مگر ایسا کہیں نہیں

دیکھا کہ کوئی نند اپنی بھاوج پر ہمہ وقت نثار ہوتی ہو۔ ایسی کون سی خاص بات ہے بڑی ممانی میں؟"

"اری باؤلی...... وہ بچپن کی میری دوست ہے۔ اُس کے ساتھ بہناپا شروع سے ہی رہا۔ وہ مجھے اتنی ہی پیاری ہے جیسے تمہاری خالائیں۔ اسے بڑی چاہ سے بیاہ کر ہم لوگ لائے تھے۔ اور سچی بات ہے کہ وہ بھی ہم سب پر جان دیتی ہے۔ ہم لوگوں کی محبتوں کی تو مثالیں دی جاتی ہیں۔"

"مگر اس کے باوجود میں ان کی امّاں کے گھر ہرگز نہیں جاؤں گی۔ میں اسلام آباد صرف نانی امّاں کے پاس جارہی ہوں۔ مجھے اِدھر اُدھر سلامیاں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔"

"لوگوں کی للّو چپّو کرنی سیکھو ورنہ خاندان میں 'اکل کھری' کا خطاب مل جائے گا۔" ملیحہ کی باتیں سُن کر وہ جل ہی تو گئی تھیں۔

"جس کا جو دل چاہے نام رکھ دے، مگر جس بات کو دل نامنظور کر دے وہ نہیں ہو سکتا۔" وہ اپنے دُھلے ہوئے بالوں میں برش کرتی ہوئی امّاں کے پاس سے ہی اُٹھ آئی۔ کیا فائدہ تھا کہ ان کی باتیں سُن کر اپنا دل جلایا جائے۔ اور ان کی کڑوی باتوں پر کسیلا جواب دے کر اُنھیں بھی کلسایا جائے۔

ائرپورٹ پر ابا میاں کے ساتھ امّاں بھی اُسے چھوڑنے آئی تھیں۔

نائٹ کوچ کا ٹائم تبدیل ہونے سے وہ خاصی ہراساں تھیں۔ پہلے تو اچھی خاصی ساڑھے دس بجے کی فلائٹ اسلام آباد جاتی تھی۔ اب صبح کے ساڑھے چار بجے کا ٹائم رکھ دیا گیا۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ ساری رات آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔ ابا میاں مارے ہول کے اُسے دو بجے رات کو لے کر ائرپورٹ پہنچ گئے تھے۔ سوا دو بجے اندر جانے کی اجازت ملی تو وہ انھیں خدا حافظ کہہ کر مسافر لاؤنج میں اپنا بورڈنگ کارڈ لے کر بیٹھ گئی۔

اس صبح ڈی سی ۱۰ کی فلائٹ تھی۔ اس لیے مسافروں کی تعداد بھی تین سو سے اوپر تھی۔

ملیحہ چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ ذہن پورے کا پورا اماں اور ابا میاں کی طرف تھا۔ اب اتنی رات گئے ابا میاں اپنی پھٹیچر کار چلاتے ہوئے گھر جائیں گے۔ خدا نہ کرے اگر راستے میں پنکچر ہو جائے تو ان سے رات میں پہیہ بھی نہیں لگایا جائے گا۔ خدا کرے وہ خیریت کے ساتھ گھر پہنچ جائیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک چھوٹی سی کار خرید لیں۔ اچھا خاصا ریٹائرمنٹ کا پیسہ ملے گا۔ خواہ مخواہ کی کنجوسیاں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب بھی نئی کار کے لیے اس نے بات کی امّاں نے فوراً اس کا جملہ کاٹ کر کہہ دیا تھا۔

"تیری شادی کے لیے پیسہ رکھا ہے۔ نئی کار میں اُڑانے کے لیے نہیں رکھا۔"

'اونہہ ہو رہی ہے میری شادی اسی ہفتے۔ اچھے اچھوں کے لیے رشتے کا کال ہے۔ ہو گئی شادی کسی ٹٹ پونجیے سے تو نئی کار کے لیے ساری زندگی کی ہی حسرت رہے گی' وہ خود ہی سوچ کر غصے میں آ گئی۔

اس کے برابر کی نشست پر ایک صاحب آ کر بیٹھ گئے۔ ملیحہ نے ایک اچٹتی سی نظر اُن پر ڈالی اور اپنا سفری بیگ وسط میں رکھ لیا جیسے کوئی حدِ فاصل کھینچ دی ہو۔

لاؤنج میں بیٹھے ہوئے لوگ بے فکری سے باتیں کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور بعض چائے یا ٹھنڈی بوتل پی کر اپنا گزارا کر رہے تھے۔

ریستوران کا بیرا اُس سے بھی پوچھ کر جا چکا تھا۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اپنے معدے پر بوجھ ڈالنا اُسے بالکل پسند نہیں تھا۔ اور اکیلے تو وہ کسی صورت میں کچھ کھا پی نہیں سکتی تھی۔ بیرا اس کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب سے آرڈر لینے کے لیے آیا تو انھوں نے پہلی دفعہ کھنکار کر اس سے پوچھا۔

"مس! آپ کچھ پیجیے گا؟"

"جی نہیں شکریہ!" وہ ان کی جانب رخ کر کے آہستگی سے بولی۔

"موسم کچھ سرد ہو رہا ہے، چائے تو چل سکتی ہے۔" وہ بڑی اپنائیت سے دعوت دے رہے تھے۔

"شکریہ جناب! میں اس وقت کچھ بھی پینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تکلف تو نہیں کر رہی ہیں آپ؟" لہجہ کچھ شوخ ہو چلا تھا۔

"ارے میرا آپ سے کب سے تکلف یا بے تکلفی کا رشتہ ہے؟" ملیحہ نے خاصے اکھڑ پنے سے پوچھ ڈالا اور موصوف کا گہری نظروں سے تجزیہ بھی کر ڈالا۔

موصوف تیس یا بتیس برس کے تھے۔ شکل وصورت نہ صرف اچھی تھی بلکہ چہرے پر خوشحالی کی واضح علامتیں بھی موجود تھیں۔ بے فکر کھلنڈرا سا چہرہ۔ عمدہ پوشاک اور قیمتی بریف کیس۔

'ہوں' ایسے بندے کو تو ٹی وی کا ہیرو ہونا چاہیے۔ عارفہ صدیقی کے ساتھ بھی جچے گا اور فریال گوہر کے ساتھ بھی۔ ارے یہ تو فلم میں بھی چل جائے گا۔ کافی اچھا لگے گا۔ ہاں ہیروئن بیمار ہونی چاہیے۔' اپنے خیالات پر اُسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

"آپ مجھے دیکھ کر کیوں ہنسیں؟" وہ کھنکار کر بولا۔

"ہماری اپنی بات تھی۔" وہ نچلا لب کاٹ کر بولی اور قدرے ترچھی بیٹھ گئی۔ اب معاملہ کچھ یوں تھا کہ وہ صاحب نظریں بھی اُٹھائیں تو گنہگار۔ اور ملیحہ جب تک دل چاہے اُسے اپنی تجزیاتی

نظروں سے دیکھتی رہے۔

کچھ ہی دیر بعد موصوف نے اپنا رخ بدل لیا۔ ملیحہ کی قدرے پیٹھ تھی مگر اپنی جانب بار بار پھسلتی ہوئی نظروں سے بے خبر نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہاں سے اٹھ کر کسی دوسری سیٹ پر بیٹھ جائے۔ اگر وہاں بھی اسی قسم کا کوئی دوسرا شخص اُس کے برابر آ کر بیٹھ گیا تو وہ کہاں تک نشستیں بدلے گی۔

''آپ اسلام آباد جا رہی ہیں؟'' وہ بات کرنے کی غرض سے بولا۔

''میرے خیال ۔ سے اس جہاز میں سفر کرنے والے تمام مسافر اسلام آباد جا رہے ہیں۔ یہ ڈائریکٹ فلائٹ ہے۔'' اس کا لہجہ خاصا جلا ہوا تھا۔

''جی ہاں ۔ جی ہاں۔ آپ نے درست فرمایا۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ''کیا آپ پڑھتی ہیں؟''

''جی ہاں''۔

''کس اسکول میں؟''

''میں آپ کو اسکول کی بچی لگتی ہوں؟''

''بھئی میں نے تو ایک دو سال فیل کے بھی رکھ لیے تھے۔''

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں آج تک فیل نہیں ہوئی۔''

''ویری نائس۔ اس کا مطلب ہے کہ ماشاء اللہ خاصی ذہین ہیں۔ آپ یقیناً اپنے کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی ہوں گی۔''

''میرے بغیر کوئی پروگرام مکمل ہی نہیں ہوتا۔'' اس کا لہجہ اترایا ہوا تھا۔

''ونڈرفل۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کس کاج میں پڑھتی ہیں اور کس ائیر میں؟''

''پتہ نہیں۔'' وہ روکھائی سے بولی۔ ''آپ سے مطلب؟''

''کمال ہے' آپ کو اتنا بھی نہیں پتہ جب کہ آپ کا کہنا ہے کہ آپ ماشاء اللہ خاصی ذہین لڑکی ہیں۔ حالاں کہ یہ چھوٹا سا سوال تھا۔ جس کا صحیح جواب دے کر آپ پورے نمبر حاصل کر سکتی تھیں۔'' وہ بُرا مانے بغیر بولا۔

''اے مسٹر......!'' وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

''خاکسار کو عمران احمد کہتے ہیں' امی لاڈ میں گڈو پکارتی ہیں مگر سب لوگ مجھے عمو کہتے ہیں۔ آپ مجھے عمران کہہ سکتی ہیں۔ میں قطعی مائنڈ نہیں کروں گا۔'' وہ معصومیت بھرے لہجے میں

بولا۔

''مجھے یہ سب کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''پھر آپ مجھے مخاطب کس طرح کریں گی؟'' اس کا چہرہ خاصا پریشان نظر آنے لگا۔

''اے مسٹر زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں' میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟ زیادہ عقلمند بننے کی کوشش مت کیجئے۔''

''اگر آپ نے نہیں پوچھا تو یہ آپ کی غلطی ہے مگر میں آپ کو خود ہی بتا دیتا ہوں کہ میں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں۔ اسلام آباد میں پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہوں۔ آب پارہ میں میرا بڑا سا ذاتی کلینک ہے۔ برج میرا کیپری کورن ہے اور غیر شادی شدہ ہوں اور میرا مکان ایف سکس میں ہے۔'' وہ مسکراتے لبوں سے اپنا بائیوڈیٹا اُسے بتا رہا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا آپ کے بارے میں۔'' وہ دانت کچکچا کر بولی۔

''محترمہ ابھی صرف تین بجے ہیں۔ یہ لوگ چار بجے سے پہلے جہاز میں بٹھانا شروع نہیں کریں گے۔ اس اثناء میں اگر کچھ بات چیت کر لی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔''

''بات چیت اس سے کی جاتی ہے جس سے جان پہچان ہو۔ اجنبی لوگوں سے باتیں کرنے کی میں شوقین نہیں ہوں۔''

''ارے' اب ہم اجنبی کہاں رہے۔'' وہ ہنسا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا' آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''بھئی میرا مطلب یہی ہے کہ آپ ایک کالج گرل ہیں۔ مشہور و معروف جس کے دم سے کالج میں رونق ہے۔ اور میں ایک ڈاکٹر ہوں دُکھے دلوں کا مسیحا۔ ہم دونوں اپنی اپنی فیلڈ میں فرسٹ کلاس چل رہے ہیں۔''

''کیا آپ چپ نہیں رہ سکتے۔ دماغ ہلا کر رکھ دیا' اتنی بکواس تو زینب آپا کی ساس بھی نہیں کرتی تھیں۔ مگر ایک آپ ہیں کہ بلاوجہ بولے جا رہے ہیں۔ جب کہ مجھے بے کار کی بکواس سے سخت نفرت ہے۔'' اس کا لہجہ خاصا جھنجلایا ہوا تھا۔

''ویری نائس' بالکل درست فرمایا آپ نے' میں سو فیصد آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ بے کار کی بکواس وہ لوگ کرتے ہیں' جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ یا وہ اپنے احساس کمتری کے تمام تر زنگ آلود تیر اپنے مخاطب کے سینے میں اُتارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے......''

''پلیز آپ خاموش نہیں بیٹھ سکتے؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"سوری مس ملیحہ مجھے افسوس ہے کہ میری گفتگو آپ کی سماعت کو ناگوار گزری۔"

"مس ملیحہ......" وہ آہستگی سے بڑبڑائی اور اس کی آنکھیں مارے حیرت سے پھیل سی گئیں۔ "کیسے جانتے ہیں آپ مجھے؟" اس کا لہجہ درشتگی کا حامل تھا۔

"خدا جانے کب سے!" وہ منہ میں بڑبڑا کر سر جھکا کر بولا۔

"اے...... مسٹر...... میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔"

"یہ پوچھ گچھ کر کے کیا کریں گی۔ کہیں آپ کا تعلق پولیس سے تو نہیں ہے؟" وہ مصنوعی خوف سے بولا۔

"ارے میں کیوں ہوتی پولیس میں، میں نے تو اسی سال سرسید کالج سے انٹر کا امتحان دیا ہے۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

"سب پرچوں میں پاس ہو جائیں گی یا ایک آدھ میں لڑھکنے کا بھی اندیشہ ہے۔" وہ اس کی بات کو مسکراتے لبوں سے آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

"فیل ہوں میرے دشمن، مگر آپ یہ بتایئے کہ آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں۔ کب سے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ کالج کے پاس کتنے گھنٹے ٹہلتے ہیں۔ یقیناً آپ کو ہمارے گھر نارتھ ناظم آباد کا بھی پتہ چل گیا گا؟" وہ سہمی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

"مس ملیحہ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ اسلام آباد میں جہاں آپ جا رہی ہیں وہ مکان جی سکس فور میں ہے۔ کورڈ مارکیٹ کے پاس۔" وہ زیرلب تبسم سے بولا۔

"اللہ واقعی؟" اس کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔

"اور کیا۔ آخر تپسیا کام آگئی۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

"خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیجیے۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ اگر آپ کی ان حرکات کا ہمارے کسی عزیز کو علم ہو گیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔" ملیحہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ ملتجی انداز میں اس کے بازوؤں پر رکھتے ہوئے بولی۔

عمران نے ایک نظر اُسے بغور دیکھا۔ آنسو پلکوں کی منڈیر سے قدم آگے بڑھانے ہی والے تھے۔

"واقعی بہت بے وقوف لڑکی ہو تم۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"پلیز۔ آپ لماں کی طرح باتیں نہ کریں۔ صاف صاف بتائیں کب سے پیچھا کر رہے ہیں میرا؟"

"میں کیوں کروں گا تمہارا پیچھا؟ کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو۔ کہیں کی بیوٹی کوئین ہو کیا؟"

عمران نے خاصے تیکھے لہجے میں کہا۔ تو شرم سے اس کا سانولا چہرہ مزید سانولا ہو گیا۔

"مگر...... آپ میرا نام......" وہ ہکلائی۔

"افوہ...... نام...... نام...... نام...... آخر اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔ اپنے بیگ پر ایک نظر ڈالیے۔ اتنے چھوٹے سے بیگ پر آپ نے چار جگہ اپنا نام اور جائے مقام کی چٹیں جلی حروف میں لگا رکھی ہیں۔ سبز مارکر سے خطاطی کی ہے۔ اگر اس پر میری اتفاقیہ نظر پڑ گئی تو اتنا پریشان ہونے کی کون سی بات ہے؟"

"میں یہ سمجھی کہ شاید...... آپ میرا......" وہ جملہ اُدھورا چھوڑ کر خفت زدہ سی ہو گئی اور اپنا بیگ اپنی گود میں رکھ لیا۔

"خاک سمجھتی ہیں آپ بات...... سیدھی بات کے بھی الٹے مطلب نکالنے میں ماہر نظر آتی ہیں۔" وہ اس کو بغور دیکھ کر خاصا تنک کر بول رہا تھا۔

"اچھا بھئی...... غلطی ہو گئی...... یہ بات اب ختم بھی کی جا سکتی ہے۔" اس کا لہجہ صلح پسند سا تھا...... اور لب سادگی سے مسکرا رہے تھے۔

"ایسے کس طرح ختم کر دوں بات۔ آپ نے ایک شریف آدمی پر شک کیا۔ عمران احمد۔ چائلڈ اسپیشلسٹ کی تو آپ نے کرکری کر کے رکھ دی کہ میں۔ اتنا سوبر پرسنالٹی کا شخص۔ ایک انٹر لڑکی جس کا حُسن کی دیوی سے دُور دُور کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے میں سڑکوں پر چکر لگاؤں گا۔ کبھی دیکھا ہے آپ نے کوئی خوب صورت، اعلیٰ خاندان کا مشہور و معروف ڈاکٹر کالجوں کے گرد ایک عام سی لڑکی کے لیے ٹہلیں لگاتے ہوئے۔"

"آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ جب کسی سے عشق ہو جائے تو سامنے والے کو یہ پروا بالکل نہیں ہوتی کہ وہ کیسا ہے۔" وہ جھجک کر بولی۔

"میں پناہ مانگتا ہوں ایسی شادی سے جس میں بیوی کو دیکھ کر میں آہیں بھروں اور ساری زندگی مصالحت آمیز انگاروں پر بسر کروں۔"

"افوہ۔ اب اتنا بڑا بول بھی نہیں بولیے۔ اگر آپ کی شادی کسی معمولی شکل کی لڑکی سے ہو گئی تو کیا کر لیں گے؟"

"کم از کم آپ تو نہیں کوسیے مجھے۔ خدا نہ کرے۔ اللہ میری اماں جانی اور چاروں بہنوں کو سلامت رکھے۔ وہ میرے لئے زمین کا سینہ چیر ڈالیں گی۔ آسمان تک میں تھگلی لگا دیں گی۔ آخر گھر میں اب میرا شادی کا نمبر ہے۔ جب میری دیگر بھابیاں مثلِ حور ہیں تو میرے گھر والے میرے ساتھ کیوں دشمنی کرنے لگے۔"

"ارے چھوڑیں، بُرا وقت کہہ کر نہیں آتا۔ اتنے اُونچے آدرش مت رکھیے کہ کہیں چاروں خانے چت گر جائیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ میرا نصیب کسی بدشکل لڑکی سے پھوٹے گا؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا تیزی سے بولا۔

"اچھا بھئی۔ آپ مجھے معاف کیجیے۔ میں آپ سے کچھ نہیں کہہ رہی۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بیرے کو آواز دیتے ہوئے بولی۔

"یس میڈم...... میں آپ کے لیے کیا لاؤں۔" وہ مؤدب ہو کر بولا۔

"ایک گلاس ملک شیک لے آیئے۔" وہ اپنے سُوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

"ایک گلاس میرے لیے بھی۔" اس نے بھی بیرے کو آرڈر دیا۔ "غضب خدا کا سارے موڈ کا ستیاناس ہو گیا۔ کیسا خوشی خوشی چلا تھا کراچی سے...... چار دن ہوا بن کر گزر گئے تھے۔ مگر ائرپورٹ لاؤنج میں یہ بہتان سننا تھا کہ میں اوچھے، چھچھورے عاشقوں کی طرح گرلز کالجوں کے گیٹ پر جملے کسنے کے لیے کھڑا ہوتا ہوں گا۔ توبہ...... توبہ...... توبہ...... ڈاکٹروں کی بے قدری سی تھی۔ مگر ان کی اوقات اتنی بھی نہیں گری تھی کہ ایسی حرکات ان سے منسوب کی جاسکیں۔ ارے یہ ڈاکٹر لڑکے تو کبھی بھی ایسے نازیبا عمل نہیں کرتے۔ یہ تو فارغ دل پھینک چھچھورے عاشق ایسے اوچھے ہتھیار سجاتے پھرتے ہیں۔" وہ آہستگی سے بڑبڑا رہا تھا۔

اور وہ ملک شیک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اس کی باتوں کا جواب دینے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

"میں آپ سے کچھ کہہ رہا ہوں مس ملیحہ۔" وہ اپنا گلاس ایک سانس میں چڑھا کر میز پر پٹخ کر بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں نے اس سے قبل بھی آپ سے کہا تھا کہ مجھے بے کار کی بکواس سننے کی قطعی عادت نہیں ہے۔" ٹھنڈا گلاس پی کر اُس کے حواس بحال ہوئے تو اس کے لہجے میں جرأت خود ہی در آئی۔ اس سے قبل کر وہ اسے کوئی جواب سناتا مسافر لاؤنج میں فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو گیا۔ وہ آگے بڑھ کر لائن میں لگ گئی۔ گیٹ سے نکل کر جب وہ بس میں بیٹھی تو وہ چھت کا ہینڈل تھامے اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اور خشونت بھری نظریں اسی کا احاطہ کر رہی تھیں۔

'خدا کرے اس کم بخت کی سیٹ کہیں دُور ہو۔ ویسے بھی اس کا اکانومی کلاس کا ٹکٹ تھا۔ وہ ذلیل تو ڈاکٹر ہے۔ اس کا ٹکٹ تو شاید فرسٹ کلاس کا ہوگا۔ اچھا ہے نظروں سے دُور ہوگا تو طبیعت میں بے اطمینانی کی لہریں کم از کم شور تو نہیں مچائیں گی۔ وہ بس میں بیٹھی خود ہی سوچ

سوچ کر اپنے آپ کو دلاسا دے رہی تھی۔

بس ایک جھٹکے سے طیارے کے پاس رُکی۔ اس کے خودکار دروازے خود ہی کھل گئے۔ سب مسافر ایک قطار میں جہاز کی جانب چلنا شروع ہوئے۔ اپنا بورڈنگ کارڈ دکھا کر وہ ہیٹر ایلومنیم کی کشادہ سیڑھیوں پر بھاگنے کی رفتار سے چڑھی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس کی سیٹ کھڑکی کے ساتھ کی تھی۔ اوپر شیلف سے اس نے تکیہ نکال کر اپنی پشت پر رکھا اور اپنی کرسی کا بٹن دبا کر اُسے آرام کرسی میں تبدیل کیا۔ سیٹ پر پھیل کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"واقعی اماں نے کتنا صحیح کہا تھا کہ سفر خواہ کیسا بھی ہو اکیلے دشوار لگتا ہے۔ خاندان کی کوئی بڑی بوڑھی میرے ساتھ ہوتی تو مسافر لاؤنج میں وہ خبیث مجھ سے یوں مخاطب ہونے کی جرأت کر سکتا تھا؟ اکیلی تن تنہا لڑکی کو دیکھ کر کم بخت بکے چلا گیا۔ خدا سمجھے اس ذلیل کو طبیعت کی ساری شگفتگی ختم کر گیا۔ اللہ کرے مرے منحوس کہیں۔" وہ آہستگی سے لب کاٹ کر بڑبڑائی۔

"ماشاء اللہ سوتے میں بڑبڑانے کی بھی عادت ہے۔" وہ اس کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"بدقسمتی سے میری سیٹ کا نمبر یہی ہے۔" وہ لاتعلقی سے دوسری جانب دیکھتے ہوئے اُس سے بولا۔

'مجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ نہ جانے کیا سمجھے گا' وہ اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے رسالہ بیگ سے نکالنے لگی۔

ائرہوسٹس اور اسٹیورڈ مسافروں کی سیٹ تک راہنمائی کر رہے تھے۔

جہاز کے اُڑتے وقت اُسے چکر سا محسوس ہوا...... اپنے پرس سے چیونگم نکال کر منہ میں ڈال لی۔ گو کہ یہ اس کا دوسرا ہوائی سفر تھا۔ مگر ایک ڈر اور خوف اُس کے دل میں جوار بھاٹے کی طرح اُبل رہا تھا۔

ڈاکٹر عمران بڑے شوق سے اسٹیورڈ اور ائرہوسٹس کے...... اشارے دیکھ رہے تھے کہ اگر ایمرجنسی کی صورت پیش آئے تو مسافروں کے لیے ہنگامی دروازے کس طرف سے کھلیں گے۔ پیراشوٹ ان کی سیٹ کے نیچے ملے گا۔ آکسیجن کی کمی کی صورت میں ایک آلہ ان کی سیٹ پر اوپر سے نیچے آئے گا اُسے وہ اس طرح اپنی ناک سے لگائیں۔

"اگر کوئی پہلی دفعہ سفر کرے تو یہ اشارے دیکھ کر ہی خاصا حواس باختہ ہو جائے۔ کیا آپ بھی پہلی دفعہ سفر کر رہی ہیں؟" وہ جہاز میں بڑی ملائمت سے اس سے بولا۔ یوں جیسے گفتگو کا آغاز پہلی مرتبہ اُن دونوں کے درمیان ہوا ہو۔

ملیحہ دل میں سوچے بیٹھی تھی کہ اُس سے ہرگز نہیں ڈرے گی۔ لہٰذا فوراً ہی بڑے فخر سے بولی۔ ''کراچی اور اسلام آباد میں تو ہمارا ہر وقت کا آنا جانا رہتا ہے۔ میں ہمیشہ ہوائی جہاز کا سفر ہی پسند کرتی ہوں۔ صبح اسلام آباد میں ہوں تو رات کو کراچی میں ہوتی ہوں۔''

''یہ ہر وقت کے گھومنے پھرنے سے آپ کی اسٹڈی پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا؟'' وہ اسے پھر بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''ذہین لوگوں کو زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' وہ شانے اُچکا کر بے فکری سے بولی۔

''اوہ...... آئی سی......'' وہ سیٹی بجا کر رہ گیا۔

'ڈر گیا سالا'۔ وہ دل میں ہنسی۔ اپنی وزن دار بات پر خود کو داد دے ڈالی۔

ائر ہوسٹس ٹرالی پر انگریزی' اردو کے اخبار لے کر آئی۔ تو عمران بھی ایک اخبار لے کر دیکھنے لگا۔

''ارے پڑھا آپ نے۔ ایک عورت کے سینگ نکل آئے۔ اور وہ ان سینگوں کو کٹوانے پر تیار بھی نہیں ہے۔'' وہ فارن ڈیسک کی ایک خبر پڑھ کر خاصا اُچھل پڑا۔

''کیوں کٹوائے وہ۔ آخر انفرادیت بھی کوئی چیز ہے۔'' وہ لالی پاپ منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

''مگر عورت میں نسوانیت نہ ہو تو کیا اُسے عورت کہنے کو جی چاہے گا؟''

''دیکھیے مسٹر۔ عورت کی نسوانیت کا کوئی حدود اربعہ متعین نہیں ہوا۔ کسی کو بوائے کٹ ہیئر اسٹائل میں عورت زیادہ اچھی لگتی ہے تو کسی کو مردانے لباس میں اس کا عورت پن زیادہ بھاتا ہے۔ اگر وہ سینگ کے ساتھ ٹہلی پھرے تو آپ معترض ہونے والے کون ہیں؟''

''نہیں بھئی۔ میں کون ہوتا ہوں کسی کے معاملات میں اڑی کرنے والا۔'' عمران اُس کا جواب سُن کر بوکھلا کر بولا۔

''اسی لیے بڑے کہتے ہیں زیادہ بولنا' بکواس کے زمرے میں آتا ہے اور معقول لوگ بکواس قطعی پسند نہیں کرتے۔''

''جی درست فرمایا آپ نے۔'' اس نے اپنا چہرہ اخبار سے چھپا لیا۔

'سٹی گم ہو گئی سالے کی۔ بڑا افلاطون بن رہا تھا'۔ وہ دانت کچکچا کر اُسے دیکھتی رہ گئی۔

اخبار اس کی گود میں پھیلا پڑا تھا۔ دو چار تصویریں دیکھ کر اُس نے رکھ دیا تھا۔ کورس کی انگریزی کی بُک ہی کبھی شرح کے بغیر حلق سے نہیں اُتری تھی تو یہ انگریزی خاک سمجھ میں آنی تھی۔

ان سے اگلی سیٹوں پر کوئی دولہا دولہن بیٹھے تھے۔ دولہن کا حنائی ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں تھا۔ غالباً وہ ہنی مون منانے جا رہے تھے۔ دولہن ہولے ہولے کچھ پوچھ رہی تھی جس کے جواب میں دولہا کچھ شوخی بھرے جوابات دے رہا تھا۔ جسے سُن کر مارے ہنسی کے دولہن کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس کو یوں بے تحاشا ہنستے دیکھ کر وہ آگے کو کھسک کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے کان ان کی باتوں کی جانب لگا دیے۔

''جان۔ اس وقت ہم کہاں سے گزر رہے ہوں گے؟''

''میرے خیال سے سمہ سٹہ کا اسٹیشن ہو گا۔'' دولہا میاں خاصے وثوق سے بولے۔

''ارے یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ارے جانم! سمہ سٹہ آتے ہی۔ چائے جی' لسی جی' کھانا جی کی آوازیں فل والیوم پر ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیے۔ سامنے ائر ہوسٹس اپنے ایپرن باندھ رہی ہے۔ چند ہی لمحوں میں وہ چائے کی بڑی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ہماری جانب لے آئے گی۔''

ان لوگوں کی باتیں سُن کر ملیحہ کے لب بھی مسکرانے لگے۔

''بُری بات۔ ایسا نہیں کیا کرتے۔'' وہ اخبار موڑ کر اُس سے بولا۔

''کیوں آپ کو کیا تکلیف ہُوئی؟''

''اچھے لوگ کسی کی پرائیویٹ باتیں نہیں سُنا کرتے۔'' وہ اس پر چوٹ کرتا ہوا بولا۔

''خوامخواہ ہی۔ میں نے تو کسی کی کوئی بات نہیں سُنی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''میں نے خود دیکھا ہے کہ آگے جھک کر آپ ان نئے دولہا دولہن کی باتوں پر مسکرا رہی تھیں۔''

''غلط فہمی ہے آپ کی۔'' اس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔

''نئے شادی شدہ لوگ۔ بات چیت میں خاصے پاگل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی پاگل پنے کی باتیں سُننے سے احتراز کرنا چاہیے۔'' وہ انتہائی سنجیدگی سے اس طرح بول رہا تھا۔ جیسے کوئی پروفیسر ہو۔

''جی نہیں' ایسی بات نہیں تھی۔ وہ صاحب تو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم سمہ سٹہ کے اسٹیشن سے گزر رہے ہیں۔''

''اچھا تو پھر ان صاحبہ نے کیا کہا کہ اب اسلام آباد آنے میں کتنی دیر ہے؟'' وہ اسی کے لہجے میں نقل اُتارتا ہوا بولا۔

''توبہ ہے۔ آپ سے بات کرنا تو سر میں درد کرنے کو دعوت دینا ہے۔''

"میں تو آپ کو کسی بھی قسم کی دعوت دینے میں محتاط ہوں۔ آپ خواہ مخواہ یہ امید لگائے بیٹھی ہیں کہ میں اسلام آباد میں آپ کو اپنے گھر میں مدعو کروں گا۔ میری امی میری بہنیں انتہائی سخت اصول وضوابط کی حامل ہیں۔ کسی چلتی پھرتی لڑکی کو اپنے گھر میں ہرگز انوائیٹ نہیں کریں گی۔"

"میں تھوکتی بھی نہیں ہوں ایسے گھروں پر۔" وہ نفرت سے بولی۔ غصے کے مارے اس کی رگیں چڑھنے لگی تھیں۔

سامنے ائرہوسٹس اپنی سبز قمیص پر براؤن پھول دار ایپرن باندھے ناشتا بانٹتی چلی آ رہی تھی۔ عمران نے اپنے سامنے کی ٹرے سیٹ کی تو اس نے بھی ٹرے لگالی۔ پنیر لگے دو توس ایک سموسہ اور ایک کیک کا ٹکڑا چھوٹی سی چوکور ٹرے میں اس کے سامنے دھر دیا گیا۔

"پانی پیجیے گا۔" وہ گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں۔ مگر دو گلاس۔" ملیحہ ایک گلاس غٹاغٹ چڑھا گئی۔

"صبر سے اور آہستہ آہستہ پیو۔ کہیں بھاگا نہیں جا رہا پانی۔" وہ آہستگی سے بولا تو وہ اس کی طرف غصے سے دیکھتی رہ گئی۔

"بعض لوگوں کو واقعی بولنے کا مراق ہوتا ہے۔ انٹ شنٹ بولے چلے جاتے ہیں۔ نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ ذرا بھی ایمپرس نہیں کر سکتے کسی کو۔" وہ اسے شعلے اُگلتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

مگر عمران دُور کہیں دیکھتے ہوئے چائے کے ہلکے ہلکے سپ لے رہا تھا۔ بیٹھنے کا انداز یوں بے پروائی لیے ہوئے تھا جیسے اس کے کان میں کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی ہو۔

"آپ کافی پیجیے گا۔" ائرہوسٹس کیتلی لیے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"تھینک یو مس۔" وہ چائے کے بعد کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

"آپ کی وائف کافی لیں گی۔" وہ ملیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

"اوہ۔ نو۔ ان کے لیے تو آپ کوئی گیم لا دیں۔" تاش کے تعلیمی پتے جو بچوں میں بانٹے جا رہے تھے۔ اس نے وہ ایک پیکٹ ائرہوسٹس سے لے کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ ان دونوں کی گفتگو بالکل ہی نہیں سن پائی تھی۔

"یہ تحفہ میری جانب سے نہیں ہے۔ ائرلائنز کی جانب سے ہے۔ انھوں نے آپ کے لیے دیا ہے۔"

"میں کیا کروں گی اس کا؟" اس کا لہجہ بدستور رُکھائی لیے ہوئے تھا۔

"وہی کیجیے گا جو آپ رات دن ہوائی سفروں کے بعد کرتی ہیں۔ گھر جا کر بچوں میں تقسیم

کر دیجیے گا۔"

اس نے تاش کا پیکٹ اپنے پرس میں ڈال لیا۔ اور وہ بدستور کافی کی پیالی سے کھیل رہا تھا۔

"مس کوئی کولڈ ڈرنک لا دیجیے۔" کافی کی پیالی پکڑاتے ہوئے اور مشروب کا گلاس لیتے ہوئے وہ بولا۔

"توبہ۔ بعض لوگوں کا پیٹ بارہ بیگھے میں پھیلا ہوتا ہے۔ مفت کا مال سمجھ کر کھانے پینے کا کس قدر ہوکا کرتے ہیں۔" وہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔ اس کا مستقل کھانا پینا اُسے سخت زہر لگ رہا تھا۔ "ایسے ہوتے ہیں ڈاکٹر۔ کھاؤ پیو قسم کے۔ مجال ہے کہ اپنے معدے کو ذرا آرام دیں۔"

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔" وہ جھک کر اس کی جانب اُسی دل نشین انداز میں بولا۔

"مجھے کُتے نے کاٹا ہے کہ آپ سے بولوں گی۔"

"اگر بالفرض آپ کے کُتا کاٹ لے تو آپ کو مجھ سے یعنی کسی ڈاکٹر سے بات کرنا پڑے گی۔ ویسے یاد رہے ایسی صورت میں پیٹ میں چودہ انجکشن لگوائے جاتے ہیں۔ میرے اپنے کلینک میں ایسے انجکشن ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ میرا کلینک شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ اگر آپ سپر مارکیٹ میں شاپنگ کرنے کی عادی ہیں...... تو ضرور ہی "آب پارہ" دیکھا ہوگا۔ بہت بڑا بازار ہے۔ اسلام آباد کے دیگر بازاروں سے سستی چیزیں یہاں مل جاتی ہیں۔ بڑے اچھے دکان دار ہیں۔ سب جمعے کے دن بڑی باقاعدگی سے جمعہ بازار میں شرکت کرتے ہیں۔ یہاں کا جمعہ بازار کسی گاؤں کا میلہ لگتا ہے...... اور...... اگر......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اُسے دیکھا تو پشت پر گردن کیے وہ آرام سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ اپنی سائیڈ کی لائٹ بھی اس نے بجھا دی تھی۔ "میں خواہ مخواہ ہی معلومات بہم پہنچاتا رہا۔ لوگ آسمانوں پر سو گئے۔"

کچھ لوگ سو رہے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے۔ فرسٹ کلاس میں کوئی بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ اس کے رونے کی آواز سناٹے میں صاف سُنائی سے رہی تھی۔

سامنے بیٹھی ہوئی دُلہن نے اپنا سر دولہا کے بازو پر ٹیک دیا تھا۔ بڈھے کھوسٹ اور کنوارے جوان...... اس دولہا کو بڑی حسرت اور عظمت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ بے چارہ اس سچویشن میں خاصا جھینپا جھینپا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ائرہوسٹس بچے کی بوتل میں دودھ بنا کر دے گئی تو رونے کی آواز بند ہوگئی۔

"شکر ہے کہ بچہ سو گیا۔" سامنے دوسری نشست پر بیٹھے ہوئے صاحب نے ایک لمبی جمائی لے کر آسودگی سے آنکھیں موند لی تھیں۔

اکانومی کلاس میں سب سے آگے بیٹھی ہوئی خاتون...... ٹوائیلٹ جا رہی تھیں۔ چہرہ بھی

زردی مائل ہو رہا تھا۔

"میڈم اگر آپ کو کسی دوا کی ضرورت ہو تو آپ کو دے سکتا ہوں۔ ایمرجنسی بکس میرے پاس ہے۔" عمران نے انھیں گزرتے دیکھ کر کہا۔

"مجھے موشن ہو گئے ہیں' اگر کوئی ٹیبلٹ ہو تو پلیز......" وہ کھسیا کر بولیں۔

"جی ہاں ضرور......" عمران نے ایک "لوموٹل" کی گولی انھیں دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب!" وہ خاتون گولی لے کر چلی گئیں۔

"ڈاکٹر صاحب میرے بچے کے پیر ٹھیک ہو جائیں گے۔" وسط میں ایک صاحب جو ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اپنے دو ماہ کے بچے کو عمران کو دکھاتے ہوئے بولے۔ بچے کے پیر پیدائشی مڑے ہوئے تھے۔

"جی ہاں۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ انشاء اللہ ضرور ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس قسم کے پیروں کے لیے ایک خاص ٹیکنیک کے گھٹنوں تک کے لوہے کے جوتے بنائے جاتے ہیں جن کو مستقل پہنانے سے آپ کے بچے کے پیر ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ کا بے حد شکریہ۔" وہ شخص اپنے بچے کو لے کر دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

پرواز خاصی متوازن جا رہی تھی۔ چند منٹ قبل ائر ہوسٹس بتا چکی تھی کہ ہم پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہے ہیں۔ لوگ جائے مقصود پر پہنچنے کے متمنی تھے۔

"میں کراچی سے نہاری لے کر جا رہا ہوں۔ آج صبح ہم سب گھر کے لوگ ایک ساتھ ناشتا کریں گے۔" ایک صاحب خاصی زور سے بول رہے تھے۔ ان کا لہجہ مسرت آمیز تھا۔

"ہاں صاحب! شیر مال تو میں بھی ہمیشہ اسلام آباد سے لے کر جاتا ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنے بڑے شہر میں ایک بھی شیر مال کی دکان نہیں ہے۔ میری بیوی...... شیر مال کو فریز کر دیتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ نکال کر کھاتی رہتی ہیں۔" دوسرے صاحب بھی اس گفتگو میں از خود شامل ہو گئے۔

"اگر اس بزنس کی جانب توجہ دی جائے تو خاصا چلے۔" ایک گنجے سر والا سوچتا ہوا بولا۔

"نہیں صاحب۔ اسلام آباد کے لوگوں کا مزاج سیاسی ہے۔ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔ کراچی والوں کی طرح نہیں ہیں۔ پورا ہفتہ حلوہ پوری کھاتے رہیں اور بور نہ ہوں۔ وہ کسی چیز کو اگر بے حد اہمیت دینے لگتے ہیں تو کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اسے کوڑیوں کے مول بھی نہیں خریدتے۔ یہاں پر کاروبار کرنا خاصا مشکل نظر آتا ہے۔"

"اگر بندہ بزنس اینڈ ایڈمنسٹریشن میں ڈگری ہولڈر ہو تو اس کے سامنے مشکلات دم نہیں مار سکتیں......" گرے سوٹ میں ملبوس ایک شخص نے اپنی عینک جماتے ہوئے فخر سے کہا...... ان کا لہجہ احساس برتری سے لبریز تھا۔

"آپ کے پاس یہ ڈگری ہے؟" گنجے سر والے نے تمسخر سے پوچھا۔

"جی ہاں جناب۔ میں نے آسٹریلیا سے حاصل کی ہے۔"

"پھر آپ ہی بسم اللہ کر لیجیے...... ہاں...... شیر مال کا دھندا کوئی ایسا بُرا تو نہیں رہے گا؟" وہ ہنس کر بولا۔

"جی نہیں۔ میں اپنے مزاج کے مطابق کوئی پروگرام سیٹ کروں گا۔" ان کا لہجہ آپ ہی آپ برہم سا ہو گیا۔

"صاحب! مزاج کے مطابق آجکل کون کام کرتا ہے' یہاں تو جیب کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔"

گفتگو خاصی گرما گرم ہو رہی تھی۔ عمران بھی بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ دیگر لوگ بھی اس گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ یک دم جہاز ٹیڑھا سا ہو گیا۔ پھر اور ٹیڑھا میڑھا ہونے لگا۔

ائر ہوسٹس بھاگتی ہوئی کریو کیبن کی طرف دوڑیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"مسافروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنے حفاظتی بیلٹ باندھ لیں۔" ائر ہوسٹس کی لرزاں آواز مائیک پر سنائی دے رہی تھی۔

"خدا خیر کرے۔" سب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

جہاز ایک دم تیزی سے نیچے کی جانب جانے لگا۔ انتظامی عملہ سخت ہراساں نظر آ رہا تھا۔

"لگتا ہے جہاز اغوا کیا جا رہا ہے۔ میں نے ایک مشکوک آدمی کو کیپٹن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔" ایک صاحب نے اتنے وثوق سے کہا کہ عورتیں دھیمے دھیمے سسکنے لگیں۔

نئی دلہن پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ "اللہ جان ابھی تو ہم نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اتنی جلدی ہی ہم ختم ہو جائیں گے۔"

"اللہ پر بھروسا رکھو۔ اغوا کرنے والے...... عورتوں اور بچوں کو پہلے رہا کر دیتے ہیں۔"

"میں تو آپ کے بغیر نہیں رہوں گی۔" دلہن آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے تو سخت ڈر لگ رہا ہے۔" ملیحہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ مارے

خوف کے اس کے ہونٹ نیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔

جہاز نے ایک جھٹکا کھایا' پھر ٹیڑھا اڑنے لگا۔ ملیحہ نے چونکہ اپنی حفاظتی پٹی نہیں باندھی تھی۔ وہ سامنے سیٹ سے ٹکرا کر عمران کے پہلو میں آ کر گری۔ سامنے کیل سے رگڑ کے باعث اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

اب ہر شخص اپنی اپنی زبان میں رو رہا تھا اور اللہ سے مدد کا خواہاں تھا۔ جہاز کی رفتار کچھ بہتر ہوئی تو ملیحہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پورا منہ خون سے تر تھا۔

''اپ سیٹ سے ٹیک لگائیے میں دوا لگا دیتا ہوں۔''

وہ چپ چاپ بیٹھ گئیں اپنی بے چارگی پر اسے رونا آ رہا تھا۔ وہ اس کے ہونٹ پر دوا لگا رہا تھا کہ جہاز پھر بے قابو ہوا اور وہ اس کے سینے سے آ لگی۔ خون آلود ہونٹ اس کے کشادہ سینے پر اپنا نشان چھوڑ گئے۔ جہاز پھر ڈگمگایا۔

''لگتا ہے جہاز نیچے گر جائے گا۔'' خوف سے وہ اس کے بازوؤں میں سمٹ آئی۔ جہاز میں پھر جھٹکے لگے تھے۔

''ہاں' شاید ایسا ہی ہے۔'' اس نے اسے پورا کا پورا اپنے سینے میں سمیٹ لیا تھا۔ عورتوں کے رونے کی آوازیں تیز ہو گئیں۔

''لگتا ہے اغوا کرنے والوں اور جہاز کے عملے میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔'' ایک صاحب نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''صاحب پریشان مت ہوں۔ میں جوڈو کراٹے جانتا ہوں۔'' ایک نوجوان لڑکا جوش سے بولا۔ ''ہم اپنا جہاز اغوا نہیں ہونے دیں گے۔ آخر وہ ملزمان ہم مسافروں کے پاس بھی آئیں گے۔''

''ارے بیٹے! یہ کلاشنکوف' راکٹ لانچر کا زمانہ ہے اس کے آگے اب جوڈو کراٹے ہار چکے ہیں۔''

''ہاں بھئی۔ اب ہتھیار کے آگے ہاتھا پائی کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔''

''ائر ہوسٹس اور اسٹیورڈ ایسے ہی بدحواس بھاگم دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ اس بھاگم دوڑ میں ایک گداز بدن والی ائر ہوسٹس کی ایک مصنوعی پلک کہیں گر گئی تھی۔ اس کے بالوں کا مصنوعی جوڑا چائے کی پیالی پر دھرا تھا۔ مگر اس سچویشن میں کوئی اس پر ہنس نہیں رہا تھا سب مسافر بلند آواز میں درود شریف پڑھنا شروع ہو گئے تھے۔

''کیا ہوا؟ کیا ہو رہا ہے؟'' ہر مسافر ائر ہوسٹس اور اسٹیورڈ سے پوچھ رہا تھا۔ مگر وہ لوگ کسی

قسم کا تبصرہ کرنے سے گریز کر رہے تھے۔

''آپ لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' یہ ان لوگوں کا واحد جواب تھا۔

ایک صاحب کا خیال تھا کہ اس ہنگامے میں کچھ لوگ شدید زخمی بھی ہوئے ہیں۔ انہوں نے آکسیجن کا سلنڈر لے جاتے ہوئے ایک اسٹیورڈ کو دیکھا تھا۔

جہاز اب درمیانی رفتار سے اڑ رہا تھا۔ اسلام آباد آنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی کہ پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی خاتون بیہوش ہو گئیں۔ ان کا دل و دماغ نامساعد سچویشن کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

''کوئی ڈاکٹر ہو تو ہماری مدد کرے۔'' ان کی والدہ چیخ کر بولیں۔

عمران نے اپنا بیگ اٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ جہاز پھر گرنے والا ہوا تو......؟'' وہ اس کا بازو تھام کر لرزتی آواز میں بولی...... اس کے چہرے پر خطرناک حد تک زردی پھیل چکی تھی۔

''ارے۔ اب کچھ نہیں ہوگا...... آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو...... کسی کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے......'' وہ اس کو شانے سے تھامے پیچھے بڑھا۔

فرسٹ ایڈ کی احتیاطی تدابیر عمل میں لا کر وہ ان صاحبہ کو ہوش میں لا چکا تھا۔ ملیحہ اس کی جان کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ چٹیا کے دو بل کب کے کھل چکے تھے۔ سارے بال اُڑا اُڑا کر اس کے منہ پر آ رہے تھے۔

''یہ پی لو۔'' وہ پانی میں گلوکوز ملا کر اسے دیتا ہوا بولا۔

وہ غٹاغٹ چڑھا گئی۔

''اب کچھ فرق پڑا؟'' وہ اس کے چہرے پر آیا ہوا پسینہ اپنے ہاتھوں سے پونچھ کر بولا۔

''ہاں' میں اب کافی حد تک ٹھیک ہوں۔''

''ملیحہ تم۔ ان تنہا بیٹھی ہوئی معمر خاتون سے باتیں کر کے دل بہلاؤ میں جہاز کے دیگر مریضوں کو دیکھ لوں......'' ایک صاحب اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے ہائے ہائے کر کے چیخ رہے تھے۔

عمران پہلے ان کی سمت ہی بھاگا۔ دوسری طرف سے بھی خاصی آہ و بکا تھی۔ سب 'ڈاکٹر ڈاکٹر' کر رہے تھے وہ معمر خاتون خاصی دہشت زدہ تھیں۔ ہوائی جہاز کا سفر بھی پہلا پہلا تھا۔ وہ دہشت سے ساکت و صامت بیٹھی تھیں۔

ملیحہ نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ ہتھیلی پر مالش کی۔ تب وہ ذرا بولنے

کے قابل ہوئیں۔

"میں تو کہہ رہی تھی کہ ریل سے چلی جاؤں گی۔ مگر میری بیٹی شدید بیمار ہے۔ داماد نے فون پر کہا تھا۔ خالہ۔ ہوائی جہاز سے آ جاؤ۔ پتہ نہیں میں اپنی بچی کی شکل بھی دیکھ پاؤں گی یا نہیں۔ نواسے نواسیوں کے ڈھیر سارے کھلونے...... شاید فضا میں بکھیرنے کے لیے خریدے تھے۔"

"ارے نہیں...... آپ خواہ مخواہ ہی گھبرا رہی ہیں۔ ہم سب انشاء اللہ خیریت کے ساتھ اپنے گھروں کو پہنچیں گے۔ اب دیکھیے جہاز بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔"

عمران بھاگ بھاگ کر ہر مریض کو اٹینڈ کر رہا تھا۔ شدید تھکن کے باوجود۔ وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے مریض کو روشن امیدوں کا بھی سہارا دے رہا تھا۔

ملیحہ ایک ٹک اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ کیسا فرشتہ ثابت ہوا تھا وہ اس کے لیے اور سب مریضوں کے لیے بھی۔ اس کی شفاف سفید قمیض پر بڑا سا خون کا دھبہ اس کے سینے پر چمک رہا تھا۔

تب ہی مائیک پر آواز اُبھری۔ ائر ہوسٹس اپنی اطمینان بھری آواز میں یہ نوید دے رہی تھی۔

"ایمرجنسی کی صورتِ حال ختم ہو چکی ہے۔ ہم کچھ ہی دیر کے بعد اسلام آباد کے ائر پورٹ پر ہوں گے۔ مسافروں سے التماس ہے کہ جب تک انجن پوری طرح رُک نہ جائے اپنی نشستوں پر بیٹھے رہیں۔ اب آپ لوگ اپنے حفاظتی بیلٹ باندھ لیجیے۔"

یہ اعلان سن کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ملیحہ اپنی نشست پر آ بیٹھی۔ عمران بھی بھیگے ہوئے رومال سے چہرہ خشک کرتا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔

"اب کیسی ہو ملیحہ؟" وہ اس سے شوخی سے پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔

"کیسا رہا سفر؟" وہ پھر اُسے شوخی سے دیکھ رہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ سب خیریت سے رہے۔"

"سب کے بارے میں آپ کس طرح وثوق سے کہہ سکتی ہیں ملیحہ صاحبہ! میں تو ٹھیک نہیں رہا۔"

"کیوں" آپ کو کیا ہوا؟" وہ معصومیت سے جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر بولی۔

"اچھا تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک چھ فٹ کے ٹھیک ٹھاک بندے کو آسمان میں شکار کر لیا۔

پھر بھی یہی کہتی ہیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"اللہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔" وہ شرم سے سُرخ پڑ گئی۔

"یہ دیکھ رہی ہیں آپ۔" اس نے اپنی شرٹ کا نشان دکھایا۔ "یہاں لوگ لپ اسٹک سے مہر لگاتے ہیں۔ مگر آپ کو خدشہ تھا کہ وہ مہر مٹ سکتی ہے تو آپ کے لبوں نے خون کی لالی میرے سینے پر ثبت کر دی۔"

"یہ...... یہ...... جان کر تھوڑی ہوا تھا۔" وہ اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے ہالے میں سوچ کر پسینے پسینے ہو گئی۔

"ایسے معاملات...... خود ہی ہو جاتے ہیں محترمہ!"

"اب چپ بھی ہو جائیے۔" وہ شرم سے لال چہرے کے ساتھ بولی۔

"ہاں۔ ہاں۔ میری باتیں تو بُری لگ رہی ہوں گی۔ آخر آپ کو اس سننے کی عادی کہاں ہیں؟" وہ شرارت سے ہنسا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ نے واقعی میری بے حد مدد کی ہے اگر آپ نہ ہوتے تو میں شاید مر جاتی۔" خوف زدہ سچویشن سوچ کر اس کے رونگٹے پھر کھڑے ہو گئے۔

"مگر آپ نے ہمیں مار دیا۔ اب ہم اپنا علاج کس کے پاس کرائیں گے۔ ہماری اماں' بہنیں اس وقت کو روئیں گی کہ ہم کراچی سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے کیوں گئے تھے۔ جہاز کو تو کچھ نہیں ہوا۔ مگر ہمیں معصوم سی لڑکی نے ہائی جیک کر لیا۔"

جہاز رن وے پر رک چکا تھا۔ ائر ہوسٹس مائیک پر تمام مسافروں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ ایمرجنسی صورتِ حال کی وضاحت کی جا رہی تھی کہ جہاز کے کپتان کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ سیکنڈ کریو کی ڈی سی ۱۰ پر یہ پہلی فلائٹ تھی۔ جہاز کا کنٹرول سنبھالنے میں اسے کچھ وقت لگا۔ کیپٹن کو بروقت آکسیجن دینے کے سبب اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔

"اوہ۔ میرے خدا کیسی کیسی افواہیں جہاز میں گردش کرنے لگی تھیں۔" ملیحہ جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ایک صاحب نے تو مشکوک شخص کو کیپٹن کے کیبن تک جاتے دیکھا تھا۔" عمران ہنس کر بولا۔

"اللہ کا احسان ہے کہ جہاز بہ خیریت جائے مقصود تک پہنچ گیا۔" ملیحہ نے کہا۔

"کب ملو گی؟"

"پتہ نہیں۔"

"تمہاری نانی کے گھر کا پتہ تو دل کی تختی پر محفوظ ہو چکا ہے۔"

"آپ نے اپنے کلینک کا ایڈریس بھی راستے میں رٹوا دیا تھا۔"

"پھر تو ملاقات پکی رہی۔" وہ ہاتھ تھامتا ہوا بولا۔

"نہیں جناب! بہت مشکل ہے۔ نانی کے گھر تو آپ قدم بھی نہیں رکھیے گا۔"

"اگر میں آ کر دکھا دوں تو؟"

"میں پہچاننے سے انکار کر دوں گی۔"

"کیسی طوطا چشم لڑکی ہو تم۔ جہاز میں گلے کا ہار بنی جا رہی تھیں اور اب کتنی بدل گئی ہو۔"

"ڈاکٹر صاحب! صورت حال سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کیجیے۔" بس سے اتر کر مسافر لاؤنج سے باہر نکلنے والی سب سے پہلی وہی تھی۔

چھوٹی خادمہ کے ساتھ ظفر ماموں اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ماموں نے کہا۔

"بڑا انتظار کروایا۔ اب جہاز بھی لیٹ ہونے لگے۔"

"ماموں جان۔ جہاز کریش ہوتے ہوتے بچا۔ بس اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندگی دے دی ہے۔"

"خدا کا احسان ہے کہ اُس نے سب کو بچایا۔ آؤ چلو گاڑی میں بیٹھو تمہاری نانی اماں، ممانیاں اور بچوں کی ساری فوج تمہاری منتظر ہے۔" نانی اماں کے ہاں وہ ایک لمبے عرصے کے بعد آئی تھی۔ اس لیے اسے خاصا مزہ آ رہا تھا بڑی ممانی اس کی پسند کے کھانے پکاتیں اور وہ ان کے کمرے میں گھسی چھوٹے موٹے کام نمٹاتی رہتی۔ کبھی الماریاں سیٹ کر دیتی تو کبھی ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کی صفائی کرتی رہتی۔ ممانی مطالعے کی بے حد شوقین تھیں ان کے گدّوں کے نیچے بھی رسائل کے ساتھ ساتھ ایک دُنیا آباد تھی۔ بچوں کے موزے، لٹو، تاش کے پتے۔ شطرنج کے مُہرے۔ آدھ سلی فراکیں ایک دن اس نے گدّوں کے نیچے کا سامان بھی قرینے سے ہینڈ بیگ میں رکھ دیا تھا۔

"ارے اب کے تو اپنی ملیحہ بڑی کام کی ہو گئی ہے۔ جس کمرے میں چلی جائے۔ اسی کو آئینہ بنا دیتی ہے۔"

"ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہے نا......" نانی اماں اسے دور سے دیکھتے ہوئے کہتیں۔

بچوں کے ساتھ مل جاتی تو ان میں بالکل بچہ بن جاتی...... پتنگ سے لے کر کرکٹ تک کھیلی جاتی۔ پڑھنے کے وقت ان کو پڑھانے بیٹھ جاتی۔

اس کے آنے سے سب کو ایک آرام سا مل رہا تھا۔ مگر رات گئے جب وہ اپنے بستر پر لیٹتی تو شوخ آنکھیں اُبھر آتیں۔ شرارت بھرا لہجہ اسے چھیڑنے لگتا۔

"میں تمہاری نانی کے ہاں اگر آ کر دکھا دوں تو؟"

'جھوٹا کہیں کا۔ آئے ہوئے مجھے ہفتہ بھر ہو گیا' آیا بھی نہیں۔ ڈاکٹر تو تھا ہی اگر آ کر کہتا کہ غلطی سے آ گیا تو ماموں کوئی مار کر تھوڑی نکال دیتے۔' وہ اپنی سوچ پر خود ہی ہنس دیتی۔

'اونہہ...... اتنے مصروف لوگوں کے پاس بھلا ٹائم رکھا ہے ملنے ملانے کا۔ وہ تو مریضوں کے ہجوم میں بھول بھی گیا ہوگا کہ جہاز کے ہنگامی چند منٹ کسی دوسرے کی زندگی میں ہلچل سی مچا گئے۔'

ہائے کس قدر بے شرم تھا۔ میں ڈر کر اس کی جانب بڑھی تو موصوف نے دونوں بازو اس طرح پھیلا دیے جیسے بچہ گود لے رہے ہوں۔ اور پھر اپنے بازوؤں کی گرفت میں کیسے چھپا لیا تھا جیسے کسی چھوٹی سی بچی کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہو۔ اس کے ہونٹوں کا لمس وہ اپنی پیشانی پر محسوس کر رہی تھی۔ ایک اجنبی انجان اور پھر حسین شخص یقیناً یہی سوچ رہا ہوگا کہ صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر میں اس پر لٹو ہو گئی۔

ہائے۔ اگر اسلام آباد میں دوبارہ کہیں نظر آ گیا تو شرم سے گڑ کر رہ جاؤں گی...... کیا سوچتا ہوگا وہ بھی......ایسی ہوتی ہیں لڑکیاں...... کہ اپنا آپ سونپتے ہوئے شرماتی تک نہیں'

اگلے دن چھوٹی خالہ نے اسے 'آب پارہ' چلنے کو کہا تو اس نے یک دم انکار کر دیا' کیا پتہ مارکیٹ میں نظر آ جائے اس نے اپنا کلینک بھی تو وہیں بتایا تھا۔ نہ بابا...... اتنی ہمت نہیں کہ اب اس سے نظریں ملاؤں'۔

"سپر مارکیٹ سے افغانی کباب کھانے چلو گی۔" شام کو خالہ کو پھر باہر جانے کی ہوک اٹھی...... "اماں' ملیحہ کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے...... گھر گھسنی بنی بیٹھی ہے...... کہیں چل ہی نہیں رہی...... سپر مارکیٹ چلو' واپسی پر تمہیں شاہ فیصل مسجد دکھاتے ہوئے گھر لائیں گے۔" مگر وہ بدستور سر ہلاتی رہی۔

"دل نہیں چاہ رہا......" خالہ کی شکایت پر ہنستے ہوئے بولی۔

"دل کو کیا ہو گیا تمہارے؟" وہ جز بز ہو کر بولیں۔

"میرے دل کو کیا ہونا تھا۔" وہ بے دلی سے ہنسی۔

"ارے بیٹی چلی جاؤ...... یہ چھوٹا سا شہر ہے' دیکھ ڈالو اسے' کہاں روز روز آنا ہوتا ہے تمہارا۔" نانی نے پیار سے کہا۔

تب وہ بالوں میں برش کرتی ہوئی خالہ کے ساتھ سوزوکی میں جا بیٹھی۔

''بچہ پارٹی ساتھ نہیں جائے گی کیا؟'' بچوں کے اشارے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ وہ سب ملیحہ کے کہنیاں مار رہے تھے۔

''نہیں بھئی' بہت تنگ کرتے ہیں یہ سب' مارکیٹ جا کر تو بے قابو ہو جاتے ہیں۔ جب تک دونوں بھابیاں نہ ہوں میں کسی کا بچہ ساتھ نہیں لے جاتی۔ ایک دفعہ اپنا گڈو کھو گیا تھا اتنی مشکلوں سے ملا' جب سے کان پکڑ لیے۔''

''اگر میں کھو گئی کہیں پھر' مجھے تو یہاں کے راستے بھی نہیں آتے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''تجھے کون لے کر جائے گا۔ اور جو لے کر جائے گا وہ بینڈ باجوں کے ساتھ لے کر جائے گا۔ ایویں فری میں نہیں لے جا سکتا۔'' خالہ نے شوخی سے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

مارکیٹ پہنچ کر وہ گاڑی میں بیٹھی رہی۔ خالہ بہرے کو آرڈر دے کر سامنے ڈرگ اسٹور سے اپنے لیے شیمپو اور لپ اسٹک لینے چلی گئیں۔ تب ہی اس کے برابر وہائٹ شیراڈ آ کر رکی۔ عمران نے کار لاک کر کے جو دیکھا وہ گاڑی میں بیٹھی تھی۔

''ٹھیک تو ہیں آپ۔'' وہ کھنکار کر بولا۔

اس نے چونک کر اسے گردن موڑ کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔

''آپ یہاں؟'' وہ ہکلائی۔

''جی ہاں۔ یہ ہمارا شہر ہے بھئی۔ کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ آپ اکیلی کیوں بیٹھی ہیں گاڑی میں؟'' اس نے پوچھا۔

''خالہ سامنے ڈرگ اسٹور گئی ہیں۔''

''پھر ملوایئے ان سے۔'' وہ وہیں اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''خدا کے لیے چلے جایئے آپ یہاں سے' خالہ دیکھیں گی تو نہ جانے کیا سمجھیں گی۔'' اس کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا۔ اور وہ اُچک اُچک کر سامنے دیکھنے لگی۔

''اچھا تو پھر آپ کی نانی کے ہاں کس دن آؤں۔ (اس ہفتے اتنا مصروف رہا کہ چاہتے ہوئے بھی نہ آ سکا۔) بتایئے یہ جملہ کیسا رہے گا؟''

''ایسی غلطی ہرگز نہ کیجیے گا۔ ہمارے بڑے ماموں سنکی ہیں۔ کوئی اجنبی گھر میں آئے تو جو چیز ان کے ہاتھ میں ہو کھینچ مارتے ہیں۔''

''پھر تو ان کا علاج ہونا چاہیے۔'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں جناب! یہ ان کی خاندانی بیماری ہے۔''

''ان کی بیگم بے چاری کی تو ہر وقت کی شامت آئی رہتی ہو گی۔''

''نہیں جی' وہ بھی انہی کی طرح ہیں۔'' وہ خالہ کو ڈرگ اسٹور سے نکلتے دیکھ کر گھبرا کر بولی۔

''اس اٹھا پٹخ کے ماحول میں آپ کے تو کہیں چوٹ نہیں لگی۔'' وہ اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں...... جی نہیں...... اچھا خدا حافظ آپ کو دیر ہو رہی ہو گی۔'' خالہ بس سڑک کراس کرنے والی ہی تھیں۔ ملیحہ کی جان ہی تو نکل گئی۔

''اچھا پھر ملیں گے۔'' وہ اس کو ہاتھ ہلاتا ہوا عقبی جانب مڑ گیا۔

''اللہ اس قدر رش تھا کہ یہ تو......'' خالہ بڑا سا شاپنگ بیگ گاڑی میں رکھتے ہوئے بولیں۔

''یہ کباب ابھی تک نہیں آئے...... ذرا ہارن بجاؤ...... کہ جلدی لے کر آئے۔''

ملیحہ نے ہارن بجایا ہی تھا کہ سامنے سے بیرا ایک ٹرے میں سیخیں لیے چلا آیا' ساتھ میں تل والے نان بھی۔

''گاڑی کا دروازہ کھول دو۔ ہوا آتی رہے گی۔ ڈٹ کر کھاؤ۔ یہ یہاں کی خاص ڈش ہے۔'' خالہ گرم کباب۔ سیخ میں سے نکال کر کھا رہی تھیں۔

''واقعی بہت لذیذ ہے۔'' چٹنی میں ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ بولی۔

''تمہاری کراچی میں نہیں ملیں گے ایسے کباب۔'' وہ اترائیں۔

''جی نہیں اب ایسی بات بھی نہیں ہے...... کراچی ایسا شہر ہے کہ بندہ دو روپے میں بھی کھانا کھا لے اور پانچ سو میں بھی۔ ایسے ایسے ذائقے دار کھانے ہوتے ہیں کہ گنوائے نہیں جا سکتے۔''

ڈرنکس پی کر وہ شاہ فیصل مسجد دیکھتی ہوئی گھر آ گئیں۔

''ابھی گئی ہیں تمہاری ممانی کی امی اور ان کی بہنیں۔'' نانی اماں نے اسے بتایا۔ تب اُسے اماں کی بات یاد آ گئی۔ ممانی کی اماں کو ضرور سلام کر آنا۔ ''بلا رہی تھیں وہ تجھے اپنے گھر میں کہ کسی دن ان کے ہاں کھانا کھا لو۔'' نانی نے تمباکو کا پھنکا مارتے ہوئے اسے بتایا۔

''کیوں بلا رہی تھیں وہ۔ میں کیوں جا کر کھانا کھاؤں؟'' اسے نہ جانے کیوں عجیب سا لگا۔

''ہے نا باؤلی پوری...... اری مہمان آئی ہے نا تُو ہمارے گھر۔ اس لیے وہ دعوت کر رہی ہیں۔ ان کے گھر کوئی کراچی سے رشتے دار آتا ہے تو ہم لوگ اس کی دعوت کر دیتے ہیں۔ اسلام آباد میں یہ چھوٹی موٹی رونقیں اسی طرح لگائی جاتی ہیں۔''

"میرا دل نہیں چاہتا کہیں جانے کو' آپ منع کر دیتیں۔" وہ جھلا کر بولی۔

"ارے ممانی کے گھر جانے میں اس قدر آلکس آ رہا ہے۔" پیچھے سے ممانی نے آ کر کہا تو وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

خالہ نے اسے آواز دے کر بلایا تو وہ جھٹ اپنے کمرے میں چلی گئی ممانی کے سوال و جواب سے بچنے کی واحد صورت یہی تھی۔

"خالہ اسے الماری سے ایک بڑا البم نکال کر دکھا رہی تھیں۔" دیکھ ملیحہ' یہ ہیں تیرے ہونے والے خالو جان۔" وہ ایک خوبصورت سے نوجوان کی تصویریں دکھاتے ہوئے بولیں۔

"اللہ کتنے اسمارٹ ہیں۔ کب ہو رہی ہے آپ کی شادی' ہمیں تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔"

"اے چپ کر' ابھی پتہ تو کسی کو بھی نہیں ہے۔"

"پھر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ ہمارے خالو ہوں گے؟" وہ انتہائی بے وقوفانہ انداز میں بولی۔

"ارے گڑیا۔ ہم عشق کر رہے ہیں' کوئی مذاق نہیں کر رہے۔ ہمیں نہیں معلوم ہوگا تو پھر کس کو معلوم ہوگا۔"

"کہاں پائے جاتے ہیں موصوف؟"

"آجکل تو اپنے کسی کورس کی تکمیل کے لیے چھ ماہ کے لیے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ویسے ان کا مستقل ٹھکانا اسلام آباد ہی ہے۔ ای سیون میں ان کا بڑا شاندار قسم کا بنگلہ ہے۔" خالہ فخر سے بولیں۔

"ممانی کو بھی کچھ نہیں پتہ؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں انھیں تو کچھ کچھ معاملے کا پتہ ہے۔ جب سے ٹیلی فون کا بل زیادہ آنے لگا ہے انھیں پورا پورا یقین ہو چلا ہے کہ میرا اور شجاع کا عشق زوروں پر ہے۔"

"کب ہو رہی ہے پھر آپ کی شادی؟"

"ارے شادی کا کیا ہے کرلیں گے وہ بھی' پہلے عشق تو کرلیں۔ ورنہ وہ بندہ تو شادی کے لیے بلک رہا ہے۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہے' کرلیں جھٹ پٹ شادی' بعد کو کہیں وہ مکر گیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔" اس نے اپنی طرف سے خاصی عقل مندی کا ثبوت دیا۔

"ارے وہ ایسا نہیں ہے' شادی کے بعد گنی بندھی محبت کرے گا۔ جیسے کسی یوٹیلٹی اسٹور سے ایک خاص مقدار سے زیادہ نہ لایا ہو۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی' ڈر اور خوف سے تو آپ کو نجات ملے گی۔"

"ارے تم کیا جانو کہ عشق ہے کس بلا کو نام' منٹ نہیں لگتا بندہ تسخیر ہو جاتا ہے۔"

"کیا واقعی؟" اس نے دل میں سوچا۔ "وہ چند منٹ بے خودی کے لمحے عمران کے ساتھ جو جہاز میں گزرے تھے۔ کیا وہ تسخیر ہوگئے۔ کیا میرا دل ان کے سینے میں دھڑکنے لگا؟

نہیں یہ کلیہ ہر شخص پر شاید لاگو نہیں آ سکتا۔

مگر انھوں نے کہا تھا کہ تم نے مجھے آسمان میں شکار کرلیا۔ اپنے خون آلود لبوں کی مہر میرے سینے پر ثبت کر دی۔

نہیں' بعض شخص مراقی ٹائپ ہوتے ہیں...... بے وجہ بکواس کرنے کے عادی...... یونہی کسی لڑکی کو دیکھ کر او ور ہو جانے والے سر پھرے جوان۔ آخر ٹائم بھی تو پاس کرنا تھا۔ ایسی باتیں کر کے اگر اپنا دل بھی پشوری کر لیا تو ان کا کیا بگڑا۔

وہ آپ ہی آپ ساکت و صامت بیٹھی سوچ چل جا رہی تھی۔ "شجاع اچھے ہیں نا...... اب تم تصویر پر تبصرہ بھی کرو گی یا نہیں۔" خالہ اس کے ہاتھ سے البم لیتے ہوئے بولیں۔

"واقعی بہت اچھے ہیں۔ اور اچھے کو اچھا ہی کہا جاتا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

جمعرات کی شب ممانی کی امی کے ہاں اس کے اعزاز میں دعوت تھی۔ نانی لماں کے سوا سب ہی گئے تھے۔ ان کی امی بے حد پیار سے ملیں۔ اس کی بہوئیں بے حد ماڈرن اور انتہائی خوب صورت تھیں۔ وہ انھیں دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ خدا نے انھیں حُسن کس فراوانی سے بانٹا تھا۔ وہ ممانی کی بہنوں کے ساتھ بات چیت کرتی رہی۔

"پڑھائی کے علاوہ آپ کے دیگر مشاغل کیا ہیں؟" ممانی کی بھابی نے اردو بھی انگریزی تلفظ میں بولی تھی۔ (ان کے لڑکپن کا زیادہ حصہ یورپ میں گزرا تھا۔)

"گھر کے کام اور بس۔" اس نے سادگی سے بتایا۔

"کہیں گھومنا پھرنا نہیں ہوتا؟" انھوں نے حیرت سے کہا۔

"ہمارے ہاں کا ماحول بہت مختلف ہے۔ جہاں جاتے ہیں اپنی امی کے ساتھ جاتے ہیں' اور وہ بھی کبھی کبھار ایسا سلسلہ ہوتا ہے۔ میں جہاز میں اکیلی آ رہی تھی امی کو اس قدر وحشت تھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔"

"ہماری بڑی آپا بھی ہمیشہ کی سیدھی سادی ہیں اور وہ بیاہ کر خاصے کٹر مولوی خاندان میں گئی ہیں۔" چھوٹی خالہ نے اس کی بات کی توضیح کرنی ضروری سمجھا۔

"مگر مجھے اپنا ماحول اور رہن سہن بہت پسند ہے بلکہ اس پر ناز بھی ہے۔" اسے چھوٹی خالہ

کی توضیح بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ وہ رات گئے گھر آئے تو اسے ممانی کی امی کے سوا کوئی بھی پسند نہیں آیا تھا۔

"اونہہ...... خواہ مخواہ کے شوباز لوگ...... جن کے پاس سوائے دکھاوے کی باتوں کے کچھ نہیں تھا۔"

اُسے آئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ چھوٹی خالہ نے اسلام آباد کا چپہ چپہ اسے دکھا ڈالا تھا۔ وہ اس شام کراچی جانے کا پروگرام ہی بنا رہی تھی کہ معلوم ہوا' ممانی کے بھائی کا اس کے لیے رشتہ آ گیا۔ وہ لوگ جلد نکاح کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کے ہاں منگنی کا رواج نہیں تھا۔

"مجھے نہیں کرنی وہاں شادی۔ اتنی خوب صورت فیملی میں کھسیائی سی الگ پھروں گی۔" اس نے چھوٹی خالہ سے کہا۔

"ہماری ملیحہ کیا کسی سے کم ہے۔ سانولے چہرے پر اس قدر تو ملاحت ہے۔" چھوٹی خالہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے لڑکا تو بے حد خوب صورت ہے...... اس فیملی کا سب سے وجیہہ مرد۔"

"پھر تو بے چارے کی قسمت پھوٹنے سے بچانی چاہیے۔ اس نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں۔ خواہ مخواہ بعد میں روتا پھرے گا بے چارہ۔"

"اے کیا کوئی چکر وکر ہے؟"

"نہیں بھئی...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"پھر کیوں' کس کے بل بُوتے پر منع کر رہی ہو...... اماں نے جب آپا کو فون پر بتایا تو وہ بے حد خوش ہو رہی تھیں۔"

"اماں کا کیا ہے۔ وہ تو سب سے متاثر بہت جلد ہو جاتی ہیں۔"

"تو تم نہیں ہوئیں متاثر' تم لوگوں سے تو زیادہ امیر لوگ ہیں وہ۔"

"بس خالہ آپ منع کروا دیں۔" وہ جز بز ہو کر بولی۔

"کیا کہہ کر منع کروں کہ لڑکے کی فیملی خوب صورت اور دولت مند ہے اس لیے ہماری لڑکی منع کر رہی ہے۔ اسے شکل کے چور ڈاکو چاہئیں جن کی مالی حالت بھی فقیرانہ ہو۔" خالہ جل ہی تو گئیں۔

"وجوہات آپ بعد میں پیش کر دیجیے گا۔ میں فی الحال اس جمعے کو کراچی جا رہی ہوں۔"

"اے اتنی جلدی۔ یہ جمعہ تو صرف چار دن بعد آ رہا ہے۔ اسلام آباد کو ہاتھ لگانے کے لیے آئی تھیں۔"

"بس اب اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔ ماموں سے کہہ دیں کہ اس جمعے کو کسی بھی فلائٹ سے میری سیٹ بک کروا دیں۔"

اس کے جانے میں صرف دو روز رہ گئے تھے...... چھوٹی خالہ اپنی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھیں وہ ان کا انتظار لان میں کھڑی کر رہی تھی۔ یکدم سفید شیراڈ کار پورچ تک چلی آئی...... اور جب اس نے نظر اٹھائی تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی...... ڈاکٹر عمران اس کی جانب چلے آ رہے تھے۔

"آپ' یہاں!" اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

"ہم نے کہا تھا ناں کہ آپ کی نانی اماں کے ہاں ضرور آئیں گے۔ گو دیر تو ضرور ہوئی' مگر دیکھیے اپنی بات کو کتنی پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں کہ ضرور آئے۔"

"خدا کے لیے چلے جائیے' خالہ آنے والی ہیں۔"

"افوہ...... خالہ ہی تو ہیں...... آنے دیجیے...... اور پھر آپ کے ہاں مہمانوں سے اتنا برا سلوک کیا جاتا ہے' یہ تو معلوم نہیں تھا اور کہیں آپ اس وجہ سے تو خوف زدہ نہیں کہ آپ کے ماموں' ممانی ہمارے ڈھیلے کھینچ کر مار دیں اور آپ ہمارا لہولہان چہرہ دیکھنے کی تاب نہ رکھتی ہوں۔"

"آپ بالکل درست سمجھ رہے ہیں۔ ڈھیلا تو کیا وہ آپ کے خنجر بھی گھونپ سکتے ہیں۔ کیوں آپ میری عزت مٹی میں ملانا چاہتے ہیں ویسے میں یہاں صرف دو دن اور ہوں۔"

"دیکھیے ملیحہ بی بی۔ آپ کو گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ اپنے گھر والوں سے کہہ سکتی ہیں کہ میں آپ کا دوست ہوں' آپ کا منگیتر بھی ہو سکتا ہوں۔ اس کے بعد' تو وہ شاید مجھے چائے کے بعد کھانا کھلانے کے لیے بھی اصرار کریں گے۔" وہ اسے شوخی سے دیکھتے ہوئے انتہائی شرارت سے کہہ رہا تھا۔

"بھول ہے آپ کی...... نہ میرا کوئی دوست ہے اور نہ ہی کوئی منگیتر...... میں آپ کا تعارف کسی بھی حیثیت سے نہیں کرا سکتی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کا کوئی دوست تک نہیں ہے۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"شٹ اپ۔" وہ اس کا مفہوم سمجھ کر سرخ ہو گئی۔

"اوہ ملیحہ...... ایک ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں یہ کہہ دوں گا کہ آپ کی فیملی کے کسی دوست نے مجھے فون کیا تھا۔ یہاں ایک میاں بیوی ذہنی طور پر معذور رہتے ہیں۔ ان کو چیک کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کو کس لہجے میں سمجھاؤں۔" وہ سر پکڑ کر بولی۔

وہ سامنے کرسی پر بیٹھا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا کہ یک دم چھوٹی خالہ کی سوزوکی گیٹ میں داخل ہوگئی۔ خالہ اسے حیرت سے دیکھتی وہیں آ گئیں۔

"ملیحہ کی بچی! نمبرون ڈھوکے باز!" انھوں نے اسے دیکھ کر آنکھیں دکھائیں۔

"خالہ...... میں نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ یہ صاحب زبردستی اندر آئے ہیں...... خدا کی قسم میں انھیں بالکل نہیں جانتی...... اور نہ ہی یہ میرے دوست ہیں۔" اس کا چہرہ بے عزتی سے پیلا سا ہوگیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بکواس مت کر، یہ پرسوں میرے سامنے کیوں ڈائیلاگ بول رہی تھی۔" خالہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔"

"بے ایمان...... بھول گئی سب...... نکاح کے لیے تو تُو نے صاف انکار کر دیا تھا اور میری خوشامدیں کر رہی تھی کہ رشتہ لوٹا دوں۔"

"وہ تو میں اب بھی منع کر رہی ہوں۔" وہ کلس کر بولی۔ ڈاکٹر عمران کے سامنے کس قدر اس کی بے عزتی کیے جا رہی تھیں۔

"پاگل ہے نا......" وہ ہنس کر بولیں۔

"جی نہیں۔ یہ پاگل کہاں ہیں۔ یہ تو نکاح کے ساتھ رخصتی کی بھی خواہش مند ہیں۔" عمران نے شوخی سے کہا۔

"آپ کون ہوتے ہیں، ہمارے معاملے میں بولنے والے؟"

"اری پاگل یہ نہیں بولیں گے تو اور کون بولے گا۔ انھی کے سر تو آپ منڈھی جا رہی ہیں...... وہ تو شکر ہے کہ آپ کی بے سروپا باتیں میں نے اماں اور بھابھی سے نہیں کہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ کیا یہ ممانی کے بھائی ہیں؟ جن کا میرے لیے رشتہ آیا ہے؟" وہ حیرت سے عمران کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور کیا؟ یہ صاحبزادے آپ کو دیکھنے کی غرض سے آئے ہوں گے۔ آپ ہیں کہ ان کے ساتھ لان میں بیٹھی تڑتڑ باتیں کیے جا رہی ہیں۔ آخر کچھ تو شرم کرو۔"

"دیکھ تو ہم نے انھیں جہاز میں ہی لیا تھا اور پہچان بھی لیا تھا...... ہوا یوں کہ جب میں ائر پورٹ میں مسافر لاؤنج کی طرف بڑھا تو خالہ جان اور خالو جان ان کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے...... عمران میاں ہماری ملیحہ کا خیال رکھنا۔ اکیلی جا رہی ہے۔ میں انھیں کھوجتا ہوا ان کے پاس آ کر بیٹھا تو یہ کسی صورت میں بات کرنے کی روادار نہیں تھیں۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ

ان کی سیٹ میرے برابر تھی۔ جہاز نے جب ڈگمگانا شروع کیا تب ان کی خوف زدہ شکل دیکھنے کے قابل تھی اور......" وہ جملہ چھوڑ کر مسکرایا۔

ملیحہ کے لیے بیٹھنا اب مشکل ہوگیا تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر اندر بھاگی۔ عمران سے کچھ بھی بعید نہیں تھا کہ چھوٹی خالہ کو کیا کچھ سنا دیتا۔

"اس وقت کیا آپ سے نکاح کے بعد کے پروگرام سیٹ ہو رہے تھے۔ جو وہ آپ کے پاس بیٹھی تھی؟" چھوٹی خالہ نے شرارت سے عمران کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"توبہ کریں جی...... گھر سے بھگانے کی التجائیں کر رہی تھیں کہ آپ ہمارے گھر سے جائیں...... ہمارے ماموں، ممانی بڑے خطرناک ہیں۔"

ملیحہ اندر گئی، تو وہ بھی اندر چلا آیا۔ وہ لاؤنج میں بھابی کی گڑیا کو فیریکس کھلا رہی تھی۔

"ارے عمران تم۔" بڑی ممانی اپنے بھائی کو دیکھ کر کھل ہی تو گئیں۔

"لتاں نے یہ انگوٹھی بھجوائی ہے کہ یہ سائز صحیح رہے گا یا اس سے بڑی آئے گی۔" عمران نے ڈائمنڈ کی موٹی سی انگوٹھی اپنی آپا کو دیتے ہوئے اسے کانی نظروں سے دیکھا۔

اس کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی اور وہ آپا کی نظر بچا کر اس سے کہہ رہا تھا۔ "اے لڑکی...... کیا تمہاری ممانی ٹھیک ہوگئیں...... دیکھو...... انھوں نے مجھے ڈھیلا بھی نہیں مارا۔ تمہارے ماموں...... میرے ساتھ ہاتھ ملا کر...... بغیر کچھ شور مچائے...... چپ چاپ اندر چلے گئے۔ کیا یہ آوا کا آوا میری وجہ سے بدل گیا یا تمہاری وجہ سے......؟"

اس کے لہجے کی شوخی ملیحہ کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ تب وہ بے ساختہ اس کی جانب دیکھ کر ہنسنے لگی۔

❁❁❁

تیرے بنا کیا جینا

"ارے واہ...... آج تو رانی صاحبہ آئی ہوئی ہیں۔" بڑی آپا نے اماں کے کمرے میں مجھے دیکھ کر خوشی سے نعرہ بلند کیا۔

"بھئی، تمہارے مہاراجہ کہاں ہیں......؟ آج تمہاری جدائی کیسے برداشت کر لی...... کہیں گھر بیٹھے...... الیہ گیت تو نہیں گنگنا رہے۔" وہ ایک آنکھ دبا کر شرارت سے ہنسیں...... تو میں بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکی......!

"اللہ...... !رانی تم...... آج کیسے راستہ بھول گئیں......؟" بڑی بھابی مجھے دیکھ کر لاڈ سے بولیں۔

"آج آپ سب لوگ بہت یاد آ رہے تھے۔ اس لیے چلی آئی۔"

"چل جھوٹی...... تجھے اب وحید کے سوا کوئی یاد نہیں...... خواہ مخواہ جھوٹ نہ بول۔" آپا نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔

"نہیں آپا۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔"

"چل چل، زیادہ باتیں نہ بنا...... تجھے تو وحید کے سوا کسی سے محبت ہی نہیں رہی۔"

"دیکھ رہی ہیں اماں...... آپ...... آپا کو۔" میں روہانسی ہو کر بولی۔

"اے کیوں ستا رہی ہے میری بچی کو...... میاں سے محبت کرنا کیا بُری بات ہے؟ خدا اُس کی محبت سلامت رکھے۔"

تب میں ہونٹ کاٹ کر جز بز سی ہوگئی......!

"تمہارے عاشق نامدار کب آئیں گے؟" بڑی بھابی نے شرارت سے پوچھا۔

"شام کو آئیں گے۔" میں یہ کہتے ہوئے ہنس دی۔

"بھئی بہت سے عاشق دیکھے ہیں۔ مگر وحید جیسا نہیں۔ جسکا عشق وقت کے ساتھ ساتھ

بڑھ رہا ہے۔" آپا نے بڑے فخر سے کہا۔

"آپا...... یہ تو اچھی بات ہے نا؟" میں دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کو قابو کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں رانی...... ایسی حقیقتیں عشق کی معراج ہوا کرتی ہیں۔ تو واقعی بہت خوش نصیب ہے...... حقیقت میں خوش بخت۔"

"رانی کا انتخاب کتنا صحیح تھا۔ کیسی راج کر رہی ہے میری بچی۔ خدا اس جیسا نصیب ہر ایک کا کرے۔" اماں نے مجھے کلیجے سے لگاتے ہوئے فخر سے دعا دی...... اور میں یکبارگی کانپ سی گئی...... میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ میرے اور وحید کے عشق کی مثالیں بڑے تفاخر سے دیتے ہیں۔ تب ایسے سمے...... میں اپنے عشق کا بھرم رکھتے رکھتے زخم خوردہ سی ہو جاتی ہوں۔ اپنا آپ سنبھالنا خاصا دوبھر سا لگتا ہے۔ مگر میرے قہقہے میری سسکیوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ میری خود ساختہ شرمیلی ادائیں میرا مان بڑھا دیتی ہیں...... کبھی کبھی میں اپنی ان حرکتوں پر خود ہی حیرت زدہ رہ جاتی ہوں۔ مگر کیا کروں...... وحید کے عشق کا نشہ جو میری رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اُسے اپنے سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی...... یوں تو ہر لڑکی ہی دوسری لڑکی سے مختلف ہوتی ہے...... اپنے رکھ رکھاؤ...... اپنے انداز...... اپنی میٹھی رسیلی عادتوں کی وجہ سے......!

مگر میں شروع ہی سے عجیب و غریب عادتوں کی مالک تھی......! اپنی چھ بہنوں میں سب سے مختلف...... شکل و صورت میں بھی...... اُن کے مقابلے میں خاصی پیاری تھی...... اور عادتوں میں بھی خوب نیاری...... یہی وجہ تھی کہ میں سارے گھر کی دلاری تھی۔

ہر کوئی...... مجھے چاہتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی کسی نے مجھے ڈانٹا ہو...... میرے لیے سب کے دل میں چاہت کے ان گنت پھول کھلے ہوئے تھے۔ جب بہت چھوٹی سی تھی۔ تو اپنے ساتھ کی بچیوں میں کھیلنے کے بجائے اپنے سے بڑی عمر کی لڑکیوں میں کھیل کر خوش ہوا کرتی تھی۔ شاید میں اُس کو بھی اپنے لیے کوئی اعزاز سمجھتی تھی کہ بڑی لڑکیاں مجھے اپنے برابر کا سمجھتی ہیں...... وہ بڑی لڑکیاں اپنے ساتھ کھلانے کے صلے میں مجھ پر خوب حکم چلایا کرتی تھیں......! 'رانی۔ ذرا ہمارا کمرا سجا دو......' میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے سارے کمرے کی چیزیں ایک ترتیب سے سجا دیتی۔ سگھڑاپا اور سلیقہ تو میری سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ 'رانی ہماری کاپیوں پر کور چڑھا دو۔' میں اتنی نفاست سے اُن کی کاپیاں سنوارا کرتی کہ وہ خود بھی حیران رہ جاتیں۔

"اللہ...... اتنی سی بچی کتنے سلیقے سے کام کرتی ہے...... وہ مارے خوشی کے میرے پھولے پھولے سُرخ گال چوم لیتیں۔ اور میں خوشی اور شرم سے سُرخ پڑ جاتی۔

اُن کے کام دوڑ دوڑ کے کرنے میں ایک فخر سا محسوس کرتی۔ جیسے یہ میرے لیے کوئی قابل انعام بات ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی تو پانچویں جماعت کی مانیٹر کا بستہ خود اٹھا کر چلا کرتی تھی...... اُس لڑکی کا گھر ہمارے محلے ہی میں تھا' اور میں آتے جاتے اُس کا بستہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھا کر خود کو بہت بڑا محسوس کرتی تھی......!

اور ایک دن جب مالی بابا نے مجھے یوں لدا پھندا اسکول سے آتے دیکھا...... تو مجھے کچھ کہنے کے بجائے اُس لڑکی کو بے تحاشا ڈانٹا تھا۔ اُس کے گھر شکایت علیحدہ بھجوائی گئی تھی کہ ایک اسکول میں ساتھ جانے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہماری رانی کو بوجھ سے لاد دیا جائے۔

اُس دن کے بعد' کبھی کسی نے مجھے اپنا بستہ نہیں تھمایا تھا۔ تب میں خود کو کتنی بے وزن سمجھا کرتی تھی۔

چھوٹا سا ہلکا سا بستہ اُٹھا کر اپنے کو کتنا کم تر سمجھا کرتی تھی' کتنے بہت سے دن میں نے اس واقعے کی سبکی اپنے دل میں محسوس کی تھی۔ میں دراصل شروع سے ہی بہت حساس تھی' ذرا ذرا سی بات کا میرے دل پر بڑا اثر رہا کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں' اماں شدید بیمار پڑی تھیں۔ سب گھر والے اُن کی بیماری کی شدت سے بہت پریشان تھے اور میری حالت دیدنی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جسم میں خون کا قطرہ نہیں رہا۔

تپتی دوپہروں کو میں کچے آنگن میں سجدے میں گر گر گڑگڑا کر اماں کی صحت اور زندگی کی دعائیں مانگا کرتی۔

ابا میرے لاڈ بے طرح اٹھاتے تھے۔ مجھے پژمردہ دیکھ کر وہ ہر سمے مجھے اپنے ساتھ رکھا کرتے۔ اماں جب صحت یاب ہوئیں تو انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ساتھ دو دو زندگیاں بچائی تھیں۔

جب میں اسکول کی دہلیز پار کر کے کالج میں پہنچی تو میرے ارمانوں میں رنگ بھرنے لگے۔ کالج کا ماحول مجھے خوب بھایا تھا۔

اسکول کی روک ٹوک اور پابندیاں یہاں نہیں تھیں۔ دل چاہتا تو کلاس اٹینڈ کرتی اور دل نہ چاہتا تو اپنی سہیلیوں کی سنگت میں گھنٹوں کیفے میں گزار دیتی۔ سہیلیوں کی پُر لطف باتیں زندگی سے معمور تھیں۔ بلکہ زندگی کا تمام تر بانکپن مجھے اپنی سہیلیوں کے قہقہوں میں نظر آتا تھا......

اللہ...... کس قدر رسیلے قہقہے ہوتے تھے ہمارے' جب شروع ہو جاتے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے

تھے۔ مگر اُس کے ساتھ یہ ضرور تھا کہ میں سہیلیاں خوب چھان پھٹک کر بناتی۔ حسین لڑکیوں سے مجھے چڑ تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اینگی بینگی لڑکیاں ہی پسند آتیں۔ کسی میں کوئی خامی ضرور ہوتی...... اور یہ خامی ہی مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی۔ میرے حلقۂ احباب میں کوئی کانی' کوئی چھوٹی' کوئی موٹی غرض ہر سہیلی اپنی کوئی نہ کوئی خاص شناخت ضرور رکھتی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ حُسن دیکھنے والی آنکھ میں ہوتا ہے اور مجھے حُسن ہر ایک کی خامی سے پھوٹتا نظر آتا تھا۔ اُس خامی میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہوتی' جو مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی۔

بڑے بھیا نے میری انہی عادتوں کو دیکھ کر "چلتر" کا خطاب دے دیا تھا کہ بے حد تیز لڑکی ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کے لیے ایسی الٹی پلٹی لڑکیوں کو سہیلیاں بناتی ہے...... تاکہ وہ سب اُس کی خوبصورتی کو سراہیں اور یہ احساس برتری سے اپنا قد بڑھاتی ہے۔ حالانکہ یہ بات ہرگز نہیں تھی۔ گو میں کلی طور پر خوبصورت نہیں کہی جا سکتی تھی مگر اپنی کالی پیلی بہنوں میں اپنی گوری رنگت اور تیکھے نقوش کے باعث ممتاز ضرور تھی۔ مجھے ہر بھدی چیز پُرکشش لگتی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ پھل بھی مجھے داغیلے پسند تھے۔ اُن کا داغ کھرچ کر کھانے میں مجھے انتہائی طمانیت حاصل ہوتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں جب کلاس میں پاس ہوا کرتی تو اماں میرے لیے دو کورس منگواتیں۔ ایک اسکول جانے کے لیے دوسرا گھر میں ماسٹر صاحب کے پڑھنے کے لیے...... مجھے نئی کتابوں کے کلف زدہ صفحے کبھی نہیں بھائے' میں ہمیشہ پاکٹ منی سے اپنی بڑی سہیلیوں سے اُن کے پُرانے کورس خریدا کرتی۔ پُرانی کتابوں سے مجھے عجیب سوندھی سی خوشبو محسوس ہوتی۔ سوکھے گلاب کے پھول صفحوں پر چپکے ملتے۔ اور اُن کی باسی خوشبو میری کتاب کی شان بڑھا رہی ہوتی۔

بوسیدہ پھٹے ہوئے اوراق' جن پر سوالوں کے غلط سلط نشان لگے ہوتے' میں اُن کو پڑھ کر خوب انجوائے کرتی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم فقرے جو لڑکیاں کلاسوں میں اپنی کتابوں پر لکھ کر اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی ہیں۔ اُن کو پڑھ کر میں اپنے آپ کو بھی اُن مترنم فضاؤں میں محسوس کرتی۔

اللہ! یہ پُرانی کتابیں' کیسے کیسے راز لیے بھرتی ہیں۔ کتنی بے ترتیب دھڑکنوں کی سہمی صدائیں اُن میں منہ بند کلیوں کی طرح موجود ہوتی ہیں۔

میں صرف پُرانی کتابوں کی ہی شیدائی نہیں تھی بلکہ بہت سی باتوں میں عجیب تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ گھر والے میری اس عادت کا خوب مذاق اُڑاتے تھے کہ میں فلم دیکھتے وقت ہیرو' ہیروئن سے زیادہ ایکسٹرا اداکاروں کو خوب غور سے دیکھا کرتی تھی۔ ہائے بے چاریاں کس قدر

محنت کرتی ہیں۔ ناچتے وقت اپنے جسم کو توڑ مروڑ دیتی ہیں اور کیمرا ہیروئن کے سینڈل تک کے کلوز اپ لے لیتا ہے اور ان بے چاروں کو پس منظر میں دکھاتا ہے۔

اب میں اتنی سرپھری بھی نہیں تھی کہ مجھے خوبصورتی سے بیر ہوتا۔ خوب صورت چیزیں' خوب صورت لوگ مجھے پسند تو ضرور تھے مگر میں اُن سے عشق نہیں کر سکتی تھی۔ میرے نزدیک عشق اور محبت دو جُدا جدا خانے تھے۔ محبت تو ہر ایک سے کی جا سکتی تھی مگر عشق کے لئے خاص الخاص خصوصیات کا ہونا ضروری تھا۔

اور پھر...... عشق کی شدت میں جو گہرائی تھی وہ محبت کی سطح میں کہاں......؟

خاندان کے سارے اچھے لڑکوں کے رشتے میرے لیے آئے۔ ایک تو میں اپنی معمولی شکل کی بہنوں میں چاند کی طرح چمکتی تھی۔ دوسرے مالی لحاظ سے بھی ہم اپنے پورے خاندان میں سب سے زیادہ طاقتور تھے اور پیسے کی طاقت بعض لوگوں کے لیے عشق کی توانائی سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے۔ میرا انکار میری بہنوں کے حق میں بہتر رہا۔ وہ ایک ایک کر کے اچھے خاندانوں میں بیاہی گئیں۔

خاندان کے لڑکوں کے حق میں میرا انکار اقرار میں تبدیل نہ ہو سکا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ہاں باہر شادیاں کرنا پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ جو لوگ بہ حالتِ مجبوری اپنی بیٹیوں کو باہر بیاہ دیتے تھے تو اُن سے خاندانی تعلقات منقطع کر لیے جاتے تھے۔

ہم لوگ کھرے سیّد تھے۔ کسی غیر سیّد سے رشتہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر ہونی کو کون روک سکتا تھا......؟

وحید سے میری ملاقات' یونیورسٹی میں یونین الیکشن کے دوران ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوست قادر رحمان کے لیے زبردست کنویسنگ کر رہا تھا...... لمبا چوڑا سیاہی مائل رنگت کا وحید۔ مجھے پہلی نظر میں ہی بہت بھلا لگا......! اُس کی بائیں آنکھ پر چوٹ کا نشان' مجھے چاند کی طرح دمکتا نظر آیا۔ اُس کے مسکرانے ہنسنے' چلنے کے انداز انتہائی متاثر کن تھے۔ جب وہ اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے' سگریٹ ہونٹوں میں دبائے' سوچتا ہوا سا چلتا تو میرا دل دھڑک کر باہر آنے کو بے تاب ہو جاتا اور پھر اُس کے دیکھنے کا انداز کتنا گہرا تھا۔ جب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہتا تو یکبارگی میرے پورے وجود میں ایک عجیب سنسنی کی لہر سی دوڑ جاتی۔

اُس کی آنکھیں ہمیشہ بولتی ہوئی محسوس ہوتیں...... جیسے کچھ پوچھ رہی ہوں...... کچھ سُنا رہی ہوں۔

تب اُس کی عام سی بات کا جواب دینا بھی میرے لیے مشکل ہو جاتا۔ لہجے کی لڑکھڑاہٹ' لبوں کی تھرتھراہٹ دیکھ کر وہ...... مسکرائے بنا نہیں رہتا۔ وہ بھی شاید میری شخصیت سے خاصا متاثر

ہو گیا تھا۔ الیکشن کے بعد بھی مجھ سے ملتا' میرے ڈیپارٹمنٹ میں اکثر آنے لگا تھا۔

اور یہی چند ملاقاتیں مجھے عشق کی حدتوں سے آشنا کرنے لگیں۔ کبھی کسی کے لیے میرا دل نہیں دھڑکا تھا۔ مگر وحید کی شخصیت میرے لیے اس قدر طلسماتی تھی کہ میں اُس کے سحر میں پور پور گرفتار ہو چکی تھی۔ شازیہ میری دوست اکثر اُس کو چھیڑا کرتی۔ ''بھئی آپ کا دوست الیکشن میں جیت چکا ہے۔ اب کس لیے ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگاتے ہیں؟''

''ہاں بھئی اپنا دوست تو جیت گیا۔ مگر ہم ہار گئے ہیں؟''

''آپ کس سے ہار گئے؟'' وہ مسکراہٹ دبا کر پوچھتی۔

''اپنے دل کے ہاتھوں ہار گئے۔'' وہ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتا۔

''پھر امراضِ قلب کے ادارے سے رجوع کرنا چاہیے۔''

''ہمیں کس سے رجوع کرنا چاہیئے' یہ ہمارا دل اچھی طرح جانتا ہے۔''

''اچھا......! بڑا سمجھ دار قسم کا دل ہے۔ ورنہ دل والے تو اپنے عشق کے خمار میں اپنی راہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔''

''اے لڑکی...... پائی ہوئی چیز کو کیا ڈھونڈنا' اور پھر اس وقت یہ اعلان بھی کر رہا ہے کہ آپ یہاں سے نو دو گیارہ ہو جایئے۔ یہ کچھ کہنا' کچھ سننا چاہتا ہے۔''

''اوہ' تو آپ تقریر دلپذیر کرنا چاہ رہے ہیں۔ اگر آپ بیٹھنے کو بھی کہتے تو میں نہ بیٹھتی۔ یہ ناتواں کان بے بھاؤ جھوٹ سننے کے اہل نہیں ہیں۔''

''اے...... کیا بکواس ہے۔ میں جھوٹ بولتا ہوں؟'' اُس نے مُکّا تانا۔

مگر وہ اپنا بیگ کاندھے پر لٹکا کر منہ چڑاتی ہوئی بھاگ گئی۔ تب میں ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

''اے ہنس کیوں رہی ہو؟'' اُس نے بُرا مانا۔

''بس ایسے ہی۔ مجھے شازیہ کی باتوں پر ہنسی آ رہی ہے۔''

''رانی۔ کیا میری باتیں تمہیں جھوٹ و فریب سے پُر لگتی ہیں۔'' وہ بوجھل سے لہجے میں بولا۔

''نہیں وحید۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ تم میرے نزدیک کیا اہمیت رکھتے ہو' یہ میں ہی جان سکتی ہوں۔ جس کے سازِ زندگی پر جلترنگ صرف اور صرف تمہاری وجہ سے بج رہا ہے۔''

''سچ کہہ رہی ہو رانی؟'' اُس نے بے یقینی سے میری آنکھوں میں جھانکا...... بے چینی اور اضطراب اُس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔

"وحید......تم یقین رکھو......رانی اگر کسی کی ہوگی تو صرف تمہاری......" میں نے اپنا چھوٹا سا ملائم ہاتھ......اُس کے مضبوط ہاتھوں میں تھما دیا۔ جسے اُس نے یکبارگی اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

خاندان کے شاندار اور ٹھاٹ باٹ والے لڑکوں کے مقابلے میں وحید کی نہ تو شخصیت شاندار تھی اور نہ ہی پوزیشن مضبوط تھی......اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُس کی ذات کو ہمارے ہاں بہت کمتر بلکہ بے حد نیچ سمجھا جاتا تھا۔ وحید کا میرے لیے رشتہ آنا ہی گھر والوں کے لیے ایک طمانچہ تھا۔

"آخر اُس کی اتنی ہمت ہی کیسے ہوئی؟" اماں جان اپنے رعونت بھرے لہجے میں، سارے گھر میں گرجتی پھر رہی تھیں۔ بڑے بھائی اس رشتے کی آمد کو اپنی تذلیل سمجھ کر خوب بھنا رہے تھے......"اُسے اپنی اوقات معلوم نہیں تھی یا ہمیں جانا نہیں تھا؟"

"بھائی جان! میں وحید کو اچھی طرح جانتی ہوں۔" میرا لہجہ بڑا مضبوط تھا۔

"اُونہہ......تم اُسے جانتی ہو......؟ تم تو اپنے آپ کو بھی نہیں جانتیں......تو اُسے کیا جانو گی۔" وہ بپھر کر بولے۔

"تم اس قابل کب سے ہوگئیں جو اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنے لگو؟" لتاں بولیں۔

"یہ فیصلہ میرے بارے میں ہے اور مجھے اس بارے میں بولنے کا شرعی حق حاصل ہے۔"

گو میں نے یہ جملہ دھیرے سے کہا تھا مگر لفظوں میں طوفان چھپے تھے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو، آخر تمہاری بہنیں بھی اس گھر سے باعزت بیاہی گئی ہیں۔ تم اس دو ٹکے کے لڑکے کے عشق میں ہمیں پورے خاندان میں بے عزت کرنا چاہتی ہو۔" لتاں نے انتہائی غصّے میں چبا چبا کر کہا۔

"اماں......وہ دو ٹکے کا انسان نہیں ہے۔ ہر انسان قابلِ عزت ہوتا ہے۔ یہ اونچ نیچ کے خانے ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لتاں۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ چاہے جانے کے قابل......وہ مجھے بے حد چاہتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔" آخر میں سسک اُٹھی۔

"اُونہہ......آجکل کی لڑکیوں کا فلمیں دیکھ دیکھ کر دماغ خراب ہوگیا ہے، اپنے آپ کو بھی کسی فلمی ہیروئن سے کم نہیں سمجھیں۔ اری بنو، حقیقت کی دنیا میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ اپنے معیار سے ہٹ کر کوئی چیز پسند آجائے......حقیقت میں پسند، محبت اور عشق اپنے مرتبے، اپنے معیار اور اپنے اسٹیٹس کے حساب سے ہوتا ہے۔" بڑی بھابی نے بڑی رکھائی سے کہا۔ (اُن کے بھائی کا

رشتہ کافی عرصے سے آیا ہوا تھا اور یہ بھابی کے ساتھ ساتھ اُن کے بھائی کی بھی شدید خواہش تھی۔)

"ارے عشق کرنا تھا تو اپنے خاندان میں ہی کر لیتیں۔ یہ یونیورسٹی کے لونڈے کو کیوں چُنا؟" انھوں نے خاصی بدتمیزی سے میرا مذاق اُڑایا۔

"بھابی......آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" میں مارے رنج کے، دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رو دی۔

"تم بہت سچ بولتی ہونا۔ تو سچ کو تسلیم کرنا بھی سیکھو۔" انھوں نے پھر انگارے برسائے۔

"رانی! تم خاندان کے جس لڑکے سے شادی کرنا چاہو، اُس کا نام بتا دو۔ ہم خوشیاں تمہاری جھولی میں ڈال دیں گے۔ مگر باہر اور پھر کم ذات میں شادی کر کے ابا کا اونچا شملہ نیچے مت کرو۔" بڑی آپا نے مجھے سمجھاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

گھر والے مجھے جس قدر سمجھا رہے تھے، وحید کی شخصیت اتنی ہی میرے لیے نکھر رہی تھی۔ میں اُس کے لیے اپنی جان تک دے سکتی تھی۔ یہ بات میں نے صاف صاف کہہ دی تھی کہ اگر میری شادی وحید سے نہ ہو سکی تو میں خودکشی کر لوں گی۔ اُس کے بنا میرے لیے جینا ہی بے کار ہے۔

"کوئی کسی کے بغیر نہیں مرا کرتا۔" بھابی بڑبڑائیں۔

"اے ہے، خودکشی کر لو گی تو خود اپنی عاقبت خراب کرو گی۔ دنیا میں بھی ذلت سمیٹو گی اور آخرت میں بھی بخشش نہ جاؤ گی۔ ہم بھی چار دن رو کر صبر کر لیں گے۔ خودکشی کا ڈراوا کسی اور کو دینا۔" لتاں نے انتہائی تلخ لہجے میں جل کر کہا تھا۔

"لتاں۔ آپ اپنی بیٹی کو آج تک نہیں سمجھ سکیں۔" میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

"بھئی خوب سمجھتی ہوں......تمہاری ساری بہنوں کو جانتی ہوں۔ تمہارے لاڈ اُٹھا اُٹھا کر میں نے خود تمہیں تباہ کر دیا۔" وہ زچ ہو کر بولیں۔

"نہیں لتاں آپ کچھ بھی نہیں جانتیں۔ آپ نہیں جانتیں......کہ وحید میرے لیے کیا ہے؟ اُس کی ذات میرے لیے کتنی اہم ہے؟"

"ہمیں یہ موٹی موٹی باتیں کر کے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ کس کی ذات، کس کے لیے کتنی اہم ہو سکتی ہے، یہ ہم تم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں اب ایک لفظ نہیں کہنا۔" بڑے بھائی نے تیز چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

تب میں بے تحاشا روئی، گھر والوں نے ذرہ برابر نوٹس نہیں لیا۔ میں نے کھانا نہیں کھایا،

کسی نے پروا نہیں کی۔!

میں اِس دکھ سے بے دم سی ہوگئی۔ مگر گھر والوں کے فیصلے میں ذرا سی بھی لچک پیدا نہیں ہوئی۔

''رانی! تو مر جائے گی' مگر گھر والے تیری بات نہیں مانیں گے۔'' بڑی آپا میری حالت دیکھ کر رو دیں۔

''آپا' مجھے مر جانے دو۔ میں زندہ رہ کر'...... وحید کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُس زندگی سے یہ موت میرے لیے بہتر ہوگی۔''

جانے کون سا قبولیت کا وہ وقت تھا کہ میری لڑکھڑاتی سی حالت اور متورم سی آنکھیں دیکھ کر ابّا جان کا دل پسیج سا گیا اور وحید سے رشتہ کرنے کی انھوں نے ہامی بھر لی' حالانکہ بڑے بھیا نے ابا کو ورغلانے کی خاصی کوشش کی۔ مگر ابا اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا کرتے تھے۔

میری شادی دیگر بہنوں کے مقابلے میں انتہائی سادگی سے کی گئی۔ خاندان سے دو چار لوگوں کے سوا کسی کو مدعو نہیں کیا گیا...... مگر میں اپنی فتح پر خوش تھی۔ یہ جیت تھی میرے سچے جذبوں کی۔

وحید کا ایک چھوٹا سا بزنس تھا۔ میں ہر حال میں اُس کے ساتھ خوش تھی۔ زیادہ دولت اور نام و نمود کی مجھے خواہش نہیں تھی۔

☆☆☆

شادی کے بعد ماہ و سال بیتتے رہے اور میں دھیرے دھیرے سکھ کی کلیاں چنتی رہی۔ سب سے بے نیاز' سب سے بے پروا۔ اب لوگ اس پر بھی چین سے نہیں بیٹھتے۔ خواہ مخواہ' کچھ نہ کچھ کہتے ضرور ہیں۔ جانے کیوں لفظوں کی سنگباری مجھ پر کرتے رہتے ہیں۔ کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اب خواہ مخواہ مجھے ''اکل کھری'' کا نام دیا گیا ہے کہ میں آدم بیزار ہوں' کہیں آتی جاتی نہیں ہوں...... اپنے آپ میں مست رہتی ہوں۔ بعض لوگ مجھے مغرور کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو بہت سمجھتی ہوں اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اب میں کس کس کے سامنے وضاحتیں پیش کرتی پھروں اور کیا کیا بتاؤں......؟

بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ گھر سے باہر تو وہ جائے جس کا گھر میں دل نہ لگے......!

میرا گھر' میرے بچے اور میرا شوہر میرے لیے جنت سے کم نہیں ہے...... میرا دل ہمہ وقت اسی جنّت میں رہنے کو کہتا ہے۔ باہر کہیں جاؤں تو عجیب وحشت سی ہوتی ہے۔ چھوٹا سا خوبصورت گھر...... میرے لیے محل سے کم نہیں ہے اور اس محل میں میری حیثیت ایک رانی کی سی ہے۔ اگر

کسی صبح میں چوڑیاں چھن چھنا کر' کھِل کھِلا اپنے شوہر کو بیدار نہ کروں تو وہ اٹھتے ہی نہیں ہیں۔

اُن کی صبح کا آغاز میری چوڑیوں کے چھناکوں اور میرے قہقہوں کے ترنم سے ہوتا ہے۔ میری چوڑیوں کی نغمگی کے وہ عاشق ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ دونوں کلائیوں میں خوب بھر بھر کر چوڑیاں پہنتی ہوں۔ بغیر چوڑیوں کے کوئی سہاگن کتنی ادھوری اور کتنی بے رنگ نظر آتی ہے۔ بجتی ہوئی کلائی کتنے سُندر نغمے سناتی ہے۔ یہ نغمے صرف اہلِ دل ہی سُن سکتے ہیں۔ میں ان خوش نصیب بیویوں میں سے ایک ہوں جن کے شوہر اُن کو جنون کی حد تک چاہتے ہیں اور یہ شدت وقت کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔

گو میں حسین و جمیل عورت نہیں ہوں۔ مگر حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ میں ایک اوسط شکل و صورت کی عورت ہوں۔ مگر میرے شوہر کی محبت میرے لیے کبھی اوسط درجے کی نہیں رہی...... میں اُن کی محبت کو کسی پیمانے سے ناپ نہیں سکتی۔ کیونکہ مجھے ہمیشہ اُن کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا ہے۔

وہ مجھ سے...... میری خوبیوں' خامیوں سمیت بے حد محبت کرتے ہیں۔ میں چونکہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہوں' اور نفسیات میرا خاص مضمون رہ چکا ہے اس لیے میں ہمیشہ اپنا خاص خیال رکھتی ہوں۔

میں اُن بیویوں کی طرح نہیں ہوں جو میلے کچیلے حلیے میں میاں کا سواگت کرتی ہیں۔

وحید نہ صرف بہت خوش لباس ہیں بلکہ قد آور بھی ہیں۔ میرا قد اُن کے مقابلے میں خاصا کم ہے۔ تیکھے نقوش مٹاپے میں چھپ چکے ہیں۔ شلوار قمیض کے مقابلے میں ساری مجھ پر اچھی لگتی ہے یا میرے مٹاپے کو بُری طرح فاش نہیں کرتی۔ جبکہ تنگ قمیض میں تو بڑھا ہوا پیٹ اسپیڈ بریکر کی طرح بدنما لگتا ہے اس لیے میں ہمہ وقت ساری میں ملبوس رہتی ہوں۔ گو چھوٹے بچوں اور گھر کے کام کاج میں' ساری میں مجھے دشواری ہوتی ہے۔ اس لیے جب میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں' تو صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں آزادانہ کام کرتی ہوں اور جہاں کسی گاڑی کے بریک میرے دروازے پر چر چرائے' میں نے ساری ہینگر سے کھینچی اور چند لمحوں میں کس لی...... اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ میرے گھر کے بجائے کوئی پڑوس میں آتا ہے تو میں اپنا مہمان جان کر بھی تیار ہو جاتی ہوں۔ چھوٹے قد کی فکر میں نے ایڑی چوٹی کے زور سے ختم کر لی ہے...... یہی وجہ ہے کہ میری تمام سینڈلیں اور چپلیں ہائی ہیل کی ہیں۔ میرے بالوں کے تمام ہیئر اسٹائل اوپر کی جانب کوہان کی طرح اُٹھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں چھوٹی نظر نہیں آتی۔ موٹی ہونے کے باوجود موٹی نہیں لگتی...... شوہر کے بے پناہ پیار اور چاہت کے باوجود میں بے حد محتاط عورت ہوں......!

ظہیر صاحب میرے میاں کے بہت گہرے دوست ہیں۔ اُن کی دو بیویاں ہیں۔ میں نے آج تک اُن کی کسی بیگم سے دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ لوگ میرے گھر بے تحاشا آتی ہیں مگر میں اُن کے گھر ایک دفعہ بھی نہیں گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ میرے میاں کے ذہن میں بھی دو بیویوں کے فوائد جاگیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ پچاس فی صد عورتوں کے جو گھر اُجڑتے ہیں وہ اُن کی بے وقوفیوں کی وجہ سے اُجڑتے ہیں۔ میری یہ سو فی صد رائے ہے کہ ہر بیوی میں ایسی قوت اور اتنی قابلیت ہونی چاہیے کہ میاں صرف اُس کا ہو کر رہے۔ وہ بیوی ہی کیا جو اپنے میاں کو بھی پہچان نہ سکے۔ جب بیوی میں اتنی کشش ہوگی تو شوہر اُس کے حصار سے باہر جانے کی جستجو نہ کر سکے گا...... اپنے میاں کو اپنی شخصیت کے سحر میں جکڑنے کے لیے مجھے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اینٹ سے رائی تک اپنے میاں کے تمام کام میں خود کرتی ہوں ......انھیں کس وقت کیا چاہیے اور وہ کیا چاہتے ہیں' انھیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ میں اُن کے چہرے سے خود بھانپ جاتی ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ جب وہ نہا کر باہر آتے ہیں تو اُن کے بال بھی تولیے سے خود خشک کرتی ہوں۔ بالوں میں تیل کی مالش بھی میں کرتی ہوں۔ بیمار پڑتے ہیں تو نہ صرف دوا کھلانے کی ذمے داری میری ہوتی ہے بلکہ اُن کو ڈاکٹر کے پاس لے جا کر اُن کی بیماری کی کیفیت میں ہی ڈاکٹر کو بتاتی ہوں۔ وہ کسی شرمیلے بچے کی طرح میرے پہلو میں خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ میری اتنی خدمت اور اتنی ریاضت کے سبب اب وہ میرے وجود کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ہاتھ پیر صحیح سلامت ہونے کے باوجود وہ میرے محتاج ہیں۔ وہ کم از کم گھر میں تو اپنا کام خود نہیں کر سکتے۔ وہ میرے بنا بالکل ادھورے ہیں۔

سلیم صاحب بھی میرے میاں کے پسندیدہ دوستوں میں سے ایک ہیں۔ اُن کی بیگم بے حد حسین ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ میں اتنی حسین عورت سے دوستی کر کے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہتی...... میں تو وی سی آر پر جب میاں کے ساتھ فلم دیکھتی ہوں تو میک اَپ سے مزین ہو کر دیکھتی ہوں کہ قاتل حسیناؤں کا جھرمٹ دیکھ کر بے ڈھب بیوی پر نظر پڑے تو دل بالکل ہی نہ ڈوب جائے......!

مسز احمد اور مسز علی...... بھی بہترین قسم کی عورتیں ہیں...... مگر وہ میرے گھر میں آ کر ہمیشہ مجھ سے تنہائی میں گفتگو کرنے کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ میرے ہاں بیٹھ کر وحید کا تمسخر اڑانا چاہتی ہیں۔ اکثر اپنے ہاں بلا کر کچھ لوگوں کی چغل خوریاں کرنے کی خواہشمند نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کی یہ عادت مجھے انتہائی بُری لگتی ہے۔ میں نہ کسی کی غیبت کرتی ہوں اور نہ کسی کی غیبت سُننا چاہتی ہوں۔ میں انتہائی صاف گو اور کھری عورت ہوں۔ اگر میرا میاں اُن کے شوہروں سے وجاہت

اور رنگ و روپ میں کم ہے تو اس پر اُن کو ہنسنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو آج تک وحید سے زیادہ وجیہہ مرد کرۂ ارض پر کوئی نہیں لگا۔ آپ اسے میری محبت کا کرشمہ کہہ سکتی ہیں کہ یہ محبت کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے......! وہ بارہا مجھے اپنے گھر میں بلانا چاہتی ہیں۔ نہ جانے ایسے کون سے دکھڑے ہیں جو وہ اپنے میاں کے سامنے کہتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ میں تو اپنے میاں کے سامنے ہر بات کر لیتی ہوں۔ کوئی خوف' کوئی خدشہ نہیں ہوتا۔ بس یہی چھوٹی چھوٹی بے ایمانی کی باتیں مجھے بُری لگتی ہیں...... اور جتنا وہ مجھے بلاتی ہیں اُتنا ہی مجھے اُن کے گھروں میں جانے سے چڑ ہوتی ہے۔

وحید کو جب میں یہ سب باتیں بتاتی ہوں تو وہ کھلکھلا کر میری پیشانی چوم لیتے ہیں......"رانی...... تمہارا انتخاب واقعی بہت خوب کیا۔ اس پر مجھے ہمیشہ ناز رہے گا کہ میری بیوی واقعی میری دیوانی ہے......"

"اچھا تو میں ہی دیوانی ہوں۔ آپ کچھ نہیں ہیں میرے لیے......" میں انداز دکھاتی ہوں۔

"ارے بھئی۔ ہم تو آپ کے عاشق صادق ہیں۔ آپ کہیں تو گریبان چاک کر کے...... رانی رانی کی صدائیں لگاتے...... بیابانوں کا رخ کر لیں۔"

"خدا نہ کرے۔" میں گھبرا کر اپنا ہاتھ اُن کے لبوں پر رکھ دیتی۔

"پھر یقین ہے' اپنے عاشقِ صادق پر؟" وہ ہنستے۔

"یقین نہیں بلکہ ایمان ہے۔" میں جھوم کر کہتی۔

تب ہمارا مشترکہ قہقہہ دور تک اپنے رنگ بکھیر دیتا۔

رحمان صاحب کی بیگم مجھے ذاتی طور پر بہت پسند ہیں۔ بے تحاشا ہنس مکھ۔ اُن سے باتیں کر کے واقعی مزہ آ جاتا ہے۔ دل و دماغ بوجھل نہیں ہوتا...... واقعی بعض لوگ گفتگو کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مگر میں اُن کے ہاں جانا پھر بھی پسند نہیں کرتی۔ اُس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ بے حد سلیقہ مند خاتون ہیں...... کسی وقت بھی اُن کے ہاں چلے جاؤ۔ نہ گھر گندہ' نہ خود گندے۔ اُونہہ' گھر نہ ہوا کسی پرائیویٹ اسپتال کا اسپیشل وارڈ ہو گیا۔ ہر چیز صاف ستھری...... ہر چیز جگہ پر...... نہیں بھئی' میں اتنی منظم اور اتنی تمیز سے بھی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ زندگی کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئیٹ کا نام نہیں ہے۔ تھوڑی سی بے ترتیبی اور تھوڑی سی بے قاعدگی بھی ضروری ہے...... یا آپ یوں سمجھیے کہ میں کسی ایسی عورت سے دوستی نہیں کر سکتی جو کسی پہلو سے بھی مجھ سے زیادہ قوی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں اچھی ماں' اچھی بیوی ہونے کے باوجود اچھے دوستوں سے محروم ہوں۔ میرے

محتاط انداز نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ مجھے یہ محرومی کبھی کبھی بہت کھلتی ہے...... جب شوہر بزنس کے سلسلے میں مصروف ہوتے ہیں' بچے اپنے کھیل میں مست' تو ایسے میں میرے رفیق اور میرے تنہائی کے ساتھی معیاری قسم کے رسائل ہوتے ہیں جن سے میں اپنا دل بہلاتی ہوں...... اُن کی سنگت میں نہ صرف میرا وقت بہت اچھا گزرتا ہے بلکہ بہت کچھ سوچنے کا مواد بھی ملتا ہے۔

میرا دل شروع ہی سے بڑا حساس ہے۔ اس لیے افسانوں کے انجام کا اثر میرے دل پر بہت پڑتا ہے۔ میرا دل تو اتنا چھوٹا ہے کہ ٹی وی کے ٹریجڈی ڈرامے دیکھ کر' مصیبت زدہ کردار سے زیادہ میرے آنسو بھل بھل بہتے ہیں۔ وہ بھی شاید میں نے افسانہ پڑھا تھا جس کو پڑھ کر میرا دل یکبارگی دھک دھک کرنے لگا تھا۔ افسانہ نگار خاتون نے بہت خوبصورتی سے اپنے افسانے میں یہ بتایا تھا کہ شادی شدہ مرد محبت کے جال پھینکنے والا ماہر کھلاڑی ہوتا ہے اور زیادہ تر شوہر شادی کے دس سال بعد کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور چاہتے ہیں۔ ایک شوہر کا دس سال تک ایک بیوی کو دیکھ دیکھ کر دل اوب جاتا ہے اور وہ کہیں نہ کہیں عشق کا چکر ضرور چلاتا ہے اور اُس کا یہ دور بہت خطرناک ہوتا ہے۔

افسانہ پڑھ کر رسالہ میں نے ریک پر رکھ دیا۔ مگر جانے کیوں میرا رنگ فق سا ہو گیا تھا اور ہاتھ پیر سنسنانے سے لگے تھے۔ میری شادی کو بھی کم وبیش دس برس ہی بیتے تھے۔

'نہیں یہ کلیہ...... وحید پر لاگو نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسے ہرگز نہیں ہیں' میرے دل نے میری وحشتوں کو کم کرنا چاہا۔

مگر میرا ہمیشہ کا محتاط انداز میرے وجود میں چنگاریاں سی بھر رہا تھا۔

'اگر میرے ساتھ بھی ایسا ہو جائے تو......' یہ آواز میرے اندر سے آ رہی تھی اور اسے سُن کر میں خود ہی کانپ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس آواز کا گلا گھونٹ دوں۔ مگر یہ آوازیں تو میرے روئیں روئیں سے چیخ رہی تھیں اور میرا وجود ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا......!

وہ میرے دیوانے ہیں......!

میرے عاشق ہیں......!

مجھے پوجتے ہیں......!

میرے بنا ادھورے ہیں۔ اُن کا ہر کام میں کرتی ہوں۔ میرے شوہر میرے وجود کے عادی ہیں۔ میرے بنا جینے کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ میں نے بیوی ہونے کے ناتے اُن کو اتنے سکھ

پہنچائے ہیں جس کا کوئی شوہر تصور تک نہیں کر سکتا...... میں...... جس نے ناز ونعم میں آنکھ کھولی تھی...... آگے پیچھے نوکر ہوا کرتے تھے...... پیاس بھی لگتی تھی تو خود اٹھنے کے بجائے آواز دے کر ملازمہ سے پانی مانگتی تھی...... اُس لڑکی نے بیوی بن کر شوہر کی اتنی خدمت کی تھی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انھیں پیاس لگتی تو مجھے محسوس ہوتی...... اُن کے کہنے سے پیشتر ٹھنڈے پانی کا گلاس اُن کے سامنے ہوتا۔

بعض اوقات تو وہ حیران ہو کر کہتے...... ''رانو...... تمہارا دماغ ہے یا کوئی مشین! بات کہنے سے پیشتر اس کا جواب حاضر ہوتا ہے۔''

''جان...... اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کو نہیں سمجھتی...... تو میں سمجھتی ہوں کہ وہ ایک ناکام عورت ہے۔'' میں مسکرا کر کہتی اور وہ کھل کھلا کر ہنس دیتے......

اور آج اُس کھل کھلاہٹ کا مفہوم میں اخذ کرتے کرتے پریشان ہو رہی تھی......! میری سوچیں...... مجھے پاگل بنا رہی تھیں...... وحید بھی مرد ہیں...... کچھ بھی کر سکتے ہیں...... باہر کی رنگینیاں مرد کو اپنا اسیر جلد کر لیتی ہیں...... میرے وسوسے...... مجھے خود ہی ڈرا رہے تھے...... جن سے میں لرز کر حواس باختہ ہو رہی تھی...... وحید ایسے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک شفیق باپ بھی تو ہیں۔ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ صائمہ کو جب تک اپنے پاس لٹائیں نہیں۔ اُن کو چین نہیں آتا۔ فرخ اور مان پر تو جان دیتے ہیں۔ رات کو اُٹھ اُٹھ کر اُن کے کمبل درست کرتے ہیں۔ اتنا چاہنے والا باپ اپنے بچوں کی حق تلفی کبھی نہیں کر سکتا۔

'اگر انھوں نے ایسا کر لیا تو؟' یہ واہمہ تھا جو میری رگوں میں خوف بن کر اُتر رہا تھا......

گو افسانے کا انجام ٹریجڈی نہیں تھا۔ مصنفہ نے کمال مہارت سے لکھا تھا کہ یہ شوہر حضرات اپنا دل پشوری کرنے کے بعد' صحیح سلامت اپنے گھر واپس آ جاتے ہیں اور شادی کا جُوا دوبارہ نہیں کھیلتے۔ مگر میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے مجازی خدا میرے ہوتے ہوئے باہر عشق بگھارتے پھریں...... جب بیوی' اپنی محبت میں اتنی مستحکم ہوتی ہے کہ یہ ماہ وسال اس کی محبت اور عشق کی شدتوں میں کوئی دراڑ میں ڈال پاتے تو شوہر کی محبتوں پر یہ کائی کیوں آ جاتی ہے......؟

میرے لیے یہ بات ہی خاصی افسوسناک ہو سکتی تھی کہ وحید کسی لڑکی کو سبز باغ دکھا کر اس کی زندگی اجیرن کر دیں اور میرے ساتھ بے وفائی کریں۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ یہ سب میرا واہمہ ہے جو افسانہ پڑھ کر جاگا ہے...... کچھ دنوں بعد میں نارمل ہو جاؤں گی......

مگر عجیب بات یہ تھی کہ جوں جوں دن گزر رہے تھے...... میرے واہمے عجیب شکلیں اختیار کر رہے تھے۔

کل رات وہ کھانے پر آلو گوشت دیکھ کر چیخ اُٹھے...... شاید پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا' یا میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔

''کیسی عجیب عورت سے سابقہ پڑا ہے...... روز آلو گوشت پکا کر رکھ دیتی ہے۔ ایک چیز کوئی کب تک کھا سکتا ہے؟'' وہ بُری طرح چیخ رہے تھے۔

''دیکھیے...... سبزی بھی ہے۔ دال بھی پکی ہے...... آپ کچھ اور کھا لیجیے۔''

''میں سبزی اور دال نہیں کھاتا۔'' وہ پھر دھاڑے۔

''میں کچھ اور بنا لاؤں۔'' اُن کا یہ انداز دیکھ کر میں خاصا سہم گئی تھی۔

''نہیں...... مجھے نہیں کھانا...... ساری بھوک مرگئی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ اور رات گئے گھر آئے۔

ہوں...... جو شوہر...... ایک سالن دو دن نہیں کھا سکتا' وہ ایک بیوی پر کیسے اکتفا کر سکتا ہے۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ کل رات تو کھانے پر اسٹو پکا تھا۔ جس کو انھوں نے برائے نام چکھا تھا...... پرسوں مٹن بریانی اور قیمہ تھا۔ جس پر انھوں نے بدہضمی کا بہانہ کر کے صرف رائتہ پینے پر اکتفا کیا تھا۔ اور آج تین دن بعد آلو گوشت دیکھ کر خواہ مخواہ شور مچایا تھا۔ اور مجھے سہا کر باہر جانے کے لیے راستہ استوار کیا تھا۔

ہوسکتا ہے' وحید عشق لڑا کر کسی لڑکی سے شادی بھی کر لیں...... یہ ذلت آمیز احساس ہی میرے اعصاب کو منجمد کرنے کے لیے کافی تھا۔

اُف خدایا...... اگر وحید نے ایسا کر لیا تو پھر کیا ہوگا......؟ خاندان والوں کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جائے گی......؟ کتنی سبکی ہوگی...... کس قدر لوگ ہنسیں گے......! میری محبت میری ضد کا کیا تماشا بنے گا......؟ محفلوں میں ہنسی مذاق کے لیے میرا موضوع کب تک قہقہے لگواتا رہے گا......! اُف! نہ صرف میرے لیے بلکہ میرے پورے خاندان کے لیے کس قدر ذلت آمیز شکست ہوگی...... آخر میں نے ابّا جان کا اونچا شملہ نیچا کر ہی دیا۔ وحید نے اپنی نیچ ذات کا ثبوت دے ہی دیا۔

ہائے۔ میں لوگوں کا سامنا کس طرح کروں گی...... لوگ کس قدر مذاق اُڑائیں گے...... خاندان کے وہ لڑکے جو اپنی محبت سے سرشار پیغام کے ساتھ مجھ تک آنا چاہتے تھے...... میری نخوت' میری انا کے بُت سے ٹکرا کر جو واپس چلے گئے تھے وہی میری نخوت کے چیتھڑے اُڑانے سب سے پہلے آئیں گے۔

مجھے یہ بات بھی اچھی طرح یاد تھی کہ خاندان کے لوگ اس شادی پر خاصے برہم ہوئے

تھے۔ کیونکہ اُس وقت ہمارے ہاں باہر شادیاں نہیں ہوا کرتی تھیں...... سیدوں کی بیٹی کا کم تر ذات میں جانا ہی ایک بہت بڑا دھماکا تھا جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

اور پھر وحید کی ذات...... ہمارے خاندان میں ایک عرصے تک موضوع بحث بنی رہی تھی۔ اچھے خاصے انسان کو بدذات کا خطاب دے دیا گیا تھا۔ میں اپنی محبت کے سحر میں اس قدر جکڑ چکی تھی کہ کسی ذات پات کے حوالوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

میری اور وحید کی محبت وہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جس نے ساری دیواریں تہس نہس کر دی تھیں۔

اور پھر شادی کے بعد ہماری زندگی ایسے پیار سے گزر رہی تھی کہ لوگوں کی باتیں خود ہی دم توڑ گئیں۔

بچوں کی آمد نے زندگی میں مزید حسن بکھیر دیا۔ ہماری زندگی آئیڈیل تھی۔ وحید میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تیسرے بچے کی پیدائش قبل از وقت ہو گئی تھی۔ بچہ آپریشن سے ہوا تھا اور میں مہینوں بستر پر پڑی رہی تھی۔ ایسے وقت میں اماں نے مجھے اپنے پاس بلانا چاہا مگر وحید میرے قرب کے اس قدر عادی تھے کہ انھوں نے انتہائی عمدگی سے منع کر دیا...... مجھے اور بچوں کو سنبھالنے کی پوری...... ذمے داری انھوں نے اُٹھالی تھی۔

اُس سمے...... میرے پور پور سے خوشیاں چنک اُٹھیں جب وہ مجھے اپنے ہاتھ سے سوپ بنا کر پلاتے...... زندگی کے وہ لمحات بہت پیارے اور حسین ہوتے ہیں جب شوہر اپنی بیوی کا خیال رکھتا ہے۔ شاید اتنا ذہنی سکون اور طمانیت مجھے اماں کے حویلی نما مکان اور نوکروں کی فوج سے خدمت گزاری لے کر بھی نہ ملتا...... وحید نے گھر کا سارا انتظام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔ گھریلو ملازمہ جو اوپری کام کرنے آتی تھی...... وہ جب اُن کو میرا اس قدر خیال کرتے دیکھتی تو کہتی۔

''بیگم صاحبہ...... آپ محبت کے معاملے میں واقعی بڑی خوش قسمت ہیں۔''

''ارے...... یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' میں ہنس کر کہتی۔

''صاحب۔ آپ کی طرف دیکھتے ہیں نا تو اُن کی آنکھوں میں قندیلیں سی روشن ہو جاتی ہیں۔''

''اچھا......'' میں جھینپ سی جاتی......

''خدا نظرِ بد سے بچائے۔ صاحب آپ کو بہت چاہتے ہیں۔'' وہ خوش ہو کر دعا دیتی......

اور میرے دل میں طمانیت کی ایک لہر سرایت کر جاتی...... واقعی مجھے بھی اپنے اوپر رشک سا آ

جاتا۔

ملنے جلنے والے بھی وحید کو بیوی کے مرید کا نام لے کر چھیڑتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہماری نوک جھونک نے کبھی لڑائی کی شکل اختیار کی ہو یا ہم دونوں کبھی ناراض ہوئے ہوں...... بڑی سے بڑی بات کی ناراضگی چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہی۔

یا شاید...... یہ بات تھی کہ میرے اندر محبت کے سوتے اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ میں اُن سے ناراض رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ چاہے میری غلطی ہوتی یا نہ ہوتی...... میں ہمیشہ اُن کو منانے میں پہل کرتی۔

میں اُن بیویوں میں سے نہیں تھی جو اپنی خود ساختہ انا کی خاطر اپنے شوہر سے ناراضگی کے لمحے بڑھا دیتی ہیں۔ وہ شوہر کو جھکا کر خوش ہوتی ہیں......

میں تو جھکنے والی ڈالی تھی...... محبت کی آبیاری میں، میں نے کبھی اپنی ناک کٹتی محسوس نہیں کی...... مجھے معلوم تھا کہ وہ میری اس ادا پر جھوم جاتے ہیں۔

شادی کے بعد لڑکیاں میکے میں رہ کر کس قدر خوش ہوتی ہیں۔ مگر میں شاید اپنے خاندان تو کیا اپنے حلقہ احباب میں بھی واحد تھی جو شادی کے بعد ایک رات بھی اپنے میکے میں نہیں رکی تھی۔ حالانکہ بعض دفعہ میرا دل بھی بے حد چاہتا تھا۔ بڑے بھیا جب پانچ سال کے بعد گھر لوٹے تھے تو پورے گھر میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ وہ نہ صرف دیارِ غیر سے ایک بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔ بلکہ اُن کے آتے ہی اُن کے بچوں کی خوشیاں بھی منائی جارہی تھیں جو ایک عرصے سے اُن کی وجہ سے رکی ہوئی تھیں۔ ساری بہنیں اپنے اپنے بچوں سمیت حویلی میں آ گئی تھیں اور میں مہمانوں کی طرح مل کر گھر آ گئی تھی۔ حالانکہ چلتے سمے بھیا نے روکا بھی...... "رانو...... تم کیوں جارہی ہو؟ تم رہ جاؤ نا۔"

"بڑے بھیا...... میں ان کو لے کر کل پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" وحید نے میرے بولنے سے پیشتر ہی بوکھلا کر کہہ دیا۔

اور بڑے بھیا وحید پر گہری نظر ڈال کر خاموش سے ہو گئے تھے۔

اور پھر چھوٹے بھائی کی شادی پر حویلی میں رت جگا تھا...... ساری بہنیں ڈھولک کے سنگ گیت گا رہی تھیں۔ میں اُس دن بھی وہاں نہ رہ سکی۔ حالانکہ اُس دن میرا دل وحید کے ساتھ گھر جانے کو ہرگز نہیں چاہ رہا تھا۔

"وحید...... آج میں یہاں رہ جاؤں......؟"

"کیوں بھئی......؟"

"اتنا مزہ آ رہا ہے یہاں۔ سب آئے ہوئے ہیں۔ سچ اتنی رونق ہو رہی ہے...... پلیز وحید...... میں رُک جاؤں؟"

"ارے اتنے بھرے ہوئے گھر میں تمہیں نیند کیسے آئے گی، بچے علیحدہ بے آرام ہوں گے۔"

"اُف...... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کے دلارے، لاڈلے بچے آپ کے ساتھ ہرگز جانے کو تیار نہیں ہیں۔"

"اچھا...... تو بچوں کو یہاں ہی چھوڑ دو۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ......؟ بچوں کو یہاں چھوڑ دوں اور میں آپ کے ساتھ گھر چلوں!"

"رانو...... تم یہاں بے آرام جو ہو گی......" وہ ہنسے۔

"اللہ۔ وحید! آپ کو پتہ بھی ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ بھلا میں یہاں بے آرام ہو سکتی ہوں۔ میں جو یہاں پلی بڑھی ہوں۔ میرے خیال سے شاید آپ نے یہ سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ میں نے اپنا جنم بھی آپ کے درِ دولت پر آ کر لیا ہے۔"

"جان...... تمہارا اصل جنم تو میرے گھر میں آ کر ہی ہوا ہے۔"

"اللہ۔ چپ رہیے نا۔ کسی نے سُن لیا تو کیا کہے گا۔"

"کیا کہے گا؟" وہ ہنسے۔

"اتنے سارے بچوں کے ابا جان عشق بگھار رہے ہیں۔" میں شرما کر بولی۔

"بائی دا وے آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ عشق کتنے بچوں کا باپ افورڈ کر سکتا ہے......؟" انھوں نے پھر چھیڑا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں خواہ مخواہ کھسیا سی گئی۔

"پھر کیا معلوم ہے، رانی جی......؟"

"جناب! بس یہ پتہ ہے کہ آج مجھے نہیں جانا، میں یہاں رات کو رہوں گی...... سچ اتنا مزہ آئے گا کہ کیا بتاؤں......؟"

"پلیز رانو، چلو نا......" انھوں نے التجا کی۔

"کیوں چلوں؟ میرے بھائی کی شادی ہو رہی ہے میں خوب انجوائے کر رہی ہوں۔ خواہ مخواہ اکیلے گھر میں جا کر بور ہوں۔"

"اے کیا کہہ رہی ہو...... میرے ساتھ بور ہوتی ہو...... یار، تم سمجھتی نہیں ہو۔ بس میرے

ساتھ چلو۔ صبح سویرے یہاں کوئی اُٹھے گا بھی نہیں تب میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا...... رانو! تمہارے بنا...... رہنے کی عادت نہیں ہے۔ تم نہیں جاؤ گی تو ساری رات جاگتا رہوں گا۔"

"ہونھ۔ بیوی نہ ہوئی سلیپنگ پلو کی گولی ہو گئی۔" میں نے نخرا دکھایا۔

"نہیں جان...... تم تو میرے اطمینان قلب کی دوا ہو۔" وہ ہنسے۔

تب مجھے جاتا دیکھ کر لمّاں نے بھی خاصا بُرا منہ بنایا۔ "اُونھ باؤلا بنا رکھا ہے کم بخت نے۔ بڑا چالاک مرد ہے۔ سب سمجھتی ہوں اس کی ریاکاریاں۔ اپنے ناشتے پانی کی وجہ سے لے کر گیا ہے۔ کہ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اور ہماری بیٹی پر میاں کا خمار اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ شادی کے اتنے سالوں بعد بھی اُنھیں چاروں طرف سوائے میاں کے اور کوئی رشتہ نہ دکھائی دیتا ہے اور نہ سمجھ میں آتا ہے۔"

"لمّاں یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" اُن کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہو پایا تھا۔

"وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے......" یہ بات میں اپنے ہونٹوں میں ہی لوٹ پلٹ کر کے رہ گئی...... ہمارے ہاں کا ماحول ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ میں یہ سب کچھ اُن سے نہ کہہ پاتی تھی حالانکہ بڑی بھابی نے تو میاں کی دیوانی کہہ کر خاصا مذاق اُڑایا تھا۔ اور چھوٹی آپا تو اچھی خاصی ناراض ہو گئی تھیں۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ میاں کو اس قدر چڑھا کر نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ہمیشہ اُس کی ہی ہر بات مانی جائے۔ یہ تو کوئی زندگی نہیں۔ آخر بیوی بھی ایک گوشت پوست کی انسان ہوتی ہے اگر بیوی' میاں کی دس باتیں مانتی ہے تو یہ میاں کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ وہ بیوی کی بھی بات مانے اور جو شوہر ایسا نہیں کرتے وہ اپنے رشتوں میں مخلص نہیں ہوتے بلکہ فراڈی ہوتے ہیں۔

"آپ وحید کو فراڈی سمجھتی ہیں۔" میں خاصی ناراض ہو گئی۔

"اری بنّو۔ عقل کی دشمن تو تم ہو...... ہم نہیں...... جب تم ہی اُن کو کچھ نہ سمجھ سکیں تو ہم کچھ کہنے والے کون ہوتے ہیں۔" آپا نے گول مول سا جواب دے کر اپنی جان چھڑائی۔

اب میں آپا کو کیا کیا بتاتی کہ میری زندگی محبت کے کتنے حسین رنگوں کا مرقع ہے۔ میرا سازِ زندگی صرف وفا کے نغمے سناتا ہے......!

"ارے چھوڑیے آپا...... اب میں اتنے چاہنے والے شوہر سے اتنی سی بات پر ضد کرتی اچھی لگتی۔"

"اوہو...... یہ بات ہے۔" وہ تمسخر سے ہنسیں۔ "ویسے محترمہ! آپ شادی سے پہلے تو بہت

ضدی بلکہ اکھڑ قسم کی ضدن لڑکی ہوا کرتی تھیں۔ یہ شادی بھی تمہاری ضد کے نتیجے میں انجام پائی تھی۔ بھئی تم موم کی گڑیا کب سے بن گئی ہو؟"

"ارے آپا...... میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ ان کے پیار کے رچاؤ نے زندگی کے سارے رویّے میں گداز پیدا کر دیے ہیں۔ ہر رنگ اپنے پیار میں رنگا نظر آتا ہے۔"

شادی کے ان دس سالوں میں محبت کا نشہ ٹوٹا نہیں تھا بلکہ اُس کا خمار اور بڑھ گیا تھا۔

مگر اب وہ افسانہ ہی تھا۔ جس سے میں چند روز سے اُلجھ سی گئی تھی۔ میں تو اُن کی محبت میں اتنی ڈوب گی تھی کہ آنکھیں تک بند ہو گئی تھیں۔ اب جو آنکھیں کھولیں تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ میں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ وہ ٹین ایجر لڑکوں کی طرح خوب سج بن کر اپنے آفس میں جاتے ہیں۔ اپنی ذات پر پیسہ بھی خوب دھڑلے سے خرچ کرتے ہیں۔

رات کو میں نے غیر ارادی طور پر پہلی دفعہ اُن کا بریف کیس چیک کیا۔ اُس میں تین ہزار روپے رکھے تھے اور اگلے دن اس میں صرف تین سو روپے رہ گئے تھے۔ مانا کہ ہمارا چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ مگر یہ بھی میری بے وقوفی تھی کہ میں نے اس میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ کتنا پیسہ آتا ہے اور کتنا وہ خرچ کرتے ہیں' میں قطعاً لاعلم تھی۔ سیاہ وسفید کے وہی مالک تھے۔ مختارِ کُل تھے بلکہ گھر کا خرچ بھی وہی چلاتے تھے۔ مجھے کبھی پیسے کی تکلیف ہوئی نہیں تو اس عذاب سے بھی بچی رہی کہ خواہ مخواہ اپنا دماغ پچی کروں۔ حالانکہ بیوی کی یہ خاص شناخت ہوتی ہے کہ وہ شوہر سے چھین چھین کر پیسے کو جمع کرتی ہے۔ وقتاً فوقتاً میاں کی جیب پر بھی حملے کرتی رہتی ہے۔ شوہر کتنا ہی لا کر دے دے۔ وہ 'ہے ہی نہیں' کی گردان ہمیشہ الاپتی ہے۔ تیز قسم کے شوہر کو حساب کتاب کا پرچہ لکھ کر اندر ہی اندر سرخرو ہوتی ہے...... مگر میں اپنے گھر پیسے کی ریل پیل اتنی دیکھ آئی تھی اور پھر وہاں بھی اس قدر خود مختارانہ زندگی بسر کی تھی کہ مجھے شوہر کے سامنے چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے ہاتھ پھیلانا اچھا لگتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی خواہش پوری کر کے وحید نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو مجھ سے بہت بلند محسوس کرتے تھے اور میں یہی چاہتی تھی...... جانے کیوں مجھے میاں بیوی کی برابری کا درجہ کبھی نہیں بھایا۔ مجھے شوہر کا رتبہ ہمیشہ سے بیوی سے بلند پسند رہا ہے۔ میں نے ہر لحاظ سے اُن کی تکریم کی تھی...... اُن کو اپنے سے برتر اور اونچا سمجھا تھا۔

مگر اب معلوم ہو رہا تھا کہ ان معاملات سے الگ رہ کر میں کتنی ہر معاملے سے الگ تھی۔

بیوی کو تو شوہر کی شہ رگ کے قریب ہونا چاہیے تھا اور میں اُن کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اُن کی جیب سے اتنی دُور تھی۔ مرد کی شہ رگ اُس کی جیب ہی تو ہوتی ہے۔

آج وہ نیا رومال لے کر گئے مگر وہ واپسی پر جیب سے غائب تھا۔

"ارے آپ کا رومال کہاں گیا؟" گو میں نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر جس طرح انھوں نے مجھے دیکھا...... میرے اندر شک کے کئی ناگ سر اُٹھانے لگے۔ اُن کی آنکھوں میں بے اعتباری کا رنگ نمایاں تھا...... خوف اور پکڑے جانے کے احساس کا ہیولا سر جھکائے بیٹھا تھا۔

بیوی کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے...... جب ہی لوگ اُس کو جھوٹ پکڑنے کی مشین کہتے ہیں۔ وحید کا لہجہ اُن کی اپنی ہی بات کی اس طرح چغلی کھا رہا تھا کہ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً دیر نہیں لگی کہ اس رومال سے انھوں نے یقیناً اپنی کسی چہیتی کے آنسو پونچھے ہوں گے۔ یہ سوچ کر ہی میں دل میں تڑپ کر رہ گئی۔ "ہائے......" میرے لبوں سے بے ساختہ آہ بلند ہوئی۔

"آفس میں میرا رومال شاید گر گیا۔ جب ہی میرے پاس نہیں ہے۔"

گو انھوں نے یہ جملہ بڑی بے پروائی سے کہا تھا' مگر میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خاصا سوچ سمجھ کر چبا چبا کر ادا کیا گیا ہے۔

خدایا...... میں کتنی دیر سے جاگی...... میں تو ان دس برسوں میں اپنی ساری حسیات سُلائے بیٹھی تھی...... اور اب جاگی تو رُواں رُواں حساس پنکھ لیے اُڑنے کو تیار تھا۔

میں گھڑی کی چوتھائی میں اُن کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔

وحید کہاں جاتے ہیں......؟

کن دوستوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں...... یہ سب معلوم کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ میری یونیورسٹی کی ایک دوست سلطانہ کے میاں اُن کی کمپنی میں کسی اچھی پوسٹ پر ملازم ہیں۔ مگر میں نے سلطانہ سے ملنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی اور نہ ہی وحید کو کبھی اس بارے میں کچھ بتایا تھا۔ میں تو گھر اور بچوں میں اس طرح مست تھی کہ شوہر پر پہرے بٹھانے کی آنکھیں جو ہر بیوی کو ہر حالت میں کھلی رکھنی چاہئیں' وہ بھی از خود بند کیے بیٹھی تھی۔

اور جب سلطانہ نے وحید کی پوری کتھا سُنائی تو یکبارگی پورے جسم سے ٹھنڈے پسینے پھوٹ پڑے اور دل تو یوں لگ رہا تھا کہ اب ڈوبا کہ تب ڈوبا۔ میں جو ہر لحاظ سے اتنی محتاط عورت تھی' اپنے ہی مہرے سے پٹ چکی تھی۔ کتنی ذلت آمیز ہار تھی جو میری جھولی میں آئی تھی۔

سلطانہ کے جُملے میرے ذہن پر بار بار ہتھوڑے برسا رہے تھے کہ وحید تو آج سے نو سال پیشتر ہی کسی ناچنے والی سے شادی کر چکے تھے۔ اُس کو الگ فلیٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اُس سے بھی کئی بچے تھے اور آجکل بھی اپنے آفس کی مخربِ اخلاق عورت کے ساتھ گُل چھرّے اُڑا رہے تھے۔

"سلطانہ۔ تم تو میری دوست تھیں۔ میری یونیورسٹی کی ساتھی مگر تم نے اتنی بڑی حقیقت مجھ

سے چھپائے رکھی۔ اس بارے میں کبھی ذکر تک نہیں کیا۔" میں نے غم سے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم نے کبھی ملنے کی کوشش ہی نہیں کی...... احمد صاحب کی بیگم تمہارے ہاں اتنی بار گئیں...... کئی دفعہ اشاروں کناریوں میں محتاط رہنے کو بھی کہا...... ان لوگوں نے تمھیں اپنے ہاں مدعو بھی کیا۔ مگر تم نے اُن کے ہاں جانا تو درکنار اُن کی بات تک کو کوئی اہمیت نہیں دی...... مسز علی نے بھی ڈھکے چھپے لہجے میں بتایا تھا مگر تم کوئی بات سُنتا ہی نہیں چاہتی تھیں۔"

"ہوں۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "واقعی' میں اچھے دوستوں سے محروم رہی۔ اور اچھے دوستوں کی محرومی نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سے محروم کر دیا......"

"نہیں رانی...... ایسا نہیں سوچتے۔ دراصل یہ مرد جہاں بہت زیادہ چاہتوں کے جال پھیلائیں...... وہاں بیویوں کو چوکنا رہنا چاہیے...... اِن جالوں کی ڈوریوں سے اپنے پپوٹے بند نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ مرد بھی عجیب مخلوق ہیں۔ کہیں نہ کہیں اپنی مردانگی کا زعم دکھا ہی دیتے ہیں۔" سلطانہ مجھے دلاسا دے کر جا چکی ہے اور میں یہ سوچ رہی ہوں کہ میں تو بہت محتاط قسم کی بیوی تھی۔ شوہر کو اپنے عشق کے شکنجے میں جکڑنا خوب اچھی طرح سے جانتی تھی۔ مگر وہ تو میرے بھی اُستاد نکلے۔

میں نے جو افسانہ پڑھا تھا' اُس کا ہیرو تو شادی کے دس سال بعد بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا۔ مگر تھوڑی سی بے وفائی کے بعد صراطِ مستقیم پر آ گیا تھا۔ مگر وحید تو آج سے نو سال پیشتر ہی دوسری شادی کر چکے تھے۔ گویا مجھ سے شادی کے صرف ایک سال بعد اُن کی زندگی میں عشق کا یہ دور اتنا طوفانی آیا کہ وہ شادی کر بیٹھے اور مجھے کوئی احساس تک نہیں ہوا...... کوئی واہمہ' کوئی شک تک نہیں ہوا۔ ان نو سالوں میں' وہ ایک رات بھی میرے بغیر نہیں رہے۔ مجھ سے محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

وحید' واقعی تم مُحبتوں سے مالا مال تھے۔

اب تم اپنی سکریٹری سے تیسری شادی رچا بیٹھتے تو بھی نہ مجھے پتہ چل سکتا تھا اور نہ ہی تمہاری دوسری بیوی کو۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ایسا کرو گے...... یہ دھوکا' جھوٹ' فریب عشق کی منزلیں تو نہیں ہیں۔ یہ تو میرے وجود پر ایسا دھبّہ ہے...... جس نے میرے عشق کی توہین کی ہے۔ وحید' ایسا کر کے تم نے میری ذات کی تذلیل کی ہے۔ یہ رسوائی کی سوغاتیں میں کیسے سنبھالوں۔ میں تو لوگوں کی خامیوں تک سے محبت کرتی تھی۔ مجھے تو سارا حسن وفا کی مالا میں نظر آتا تھا۔ جو عشق سے لبریز جذبوں میں گُندھی ہوئی تھی۔ اور اب تو وہ مالا ہی ٹوٹ گئی ہے جس

سے میں بھی بکھر کر رہ گئی ہوں۔

کئی بچوں کے ساتھ شوہر کو چھوڑ دینا' ایک بیوی کے لیے خاصا مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔

مگر پھر بھی اکثر عورتیں' شاطر مردوں کو چھوڑ دیا کرتی ہیں۔ شاید میں بھی ایسا کرتی مگر میں کیا کروں...... میری طبیعت شروع ہی سے عجیب ہے۔

یہ دل...... جو عشق میں کسی قسم کی بے وفائی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے...... مگر۔

میری انا کے سامنے ہار گیا ہے۔

میں کیسے سر جھکا کر اعتراف کروں گی کہ میرا انتخاب غلط تھا۔

میں کیسے یہ وار سہوں گی کہ میرا عشق' میرے ساتھ ایک بھونڈا مذاق کر گیا جس سے میری ساری ہستی تہس نہس ہو گئی۔

وحید...... مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ تم سے آنکھیں چار کر کے یہ پوچھ سکوں کہ تم نے میرے ساتھ یہ خیانت کیوں کی......؟

مجھ میں تو اتنا حوصلہ بھی نہیں ہے کہ تمہارا اقرار سُن سکوں۔

اس لیے وحید...... تم بے شک' شادیوں پر شادی کرتے چلے جاؤ......

میں یونہی ہنس ہنس کر تمہارے اس بھونڈے عشق کے ساتھ زندگی نبا ہوں گی...... تمہارے ساتھ قدم ملا کے...... میں...... واقعی ان محبت کرنے والی بیویوں میں سے ہوں...... جن کا ٹھاٹیں مارتا ہوا پیار...... اُن کے خون میں ایسے سرایت کر جاتا ہے...... جسے زندگی میں جدا نہیں کیا جا سکتا......!

❀❀❀
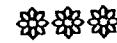
من کی جیت

آج پھر صبح سویرے اخبار چھپا دیا تھا۔ چھوٹے بھائی اخبار والے کو برا بھلا کہہ رہے تھے' کل ہی دوسرا اخبار والا لگاؤ۔ اخبار پڑھے بغیر مزہ ہی نہیں آتا۔ آنے دو اس کو میں پوچھوں گا لاٹ صاحب سے۔

کبھی اخبار نہیں ڈالتا۔ تو کبھی فلمی میگزین نہیں ڈالتا۔ صبح سویرے اخبار پڑھنے کو نہ ملے تو یوں لگتا ہے کہ منہ دھوئے بغیر ناشتہ کر لیا ہو۔

اور میں اپنے کمرے میں لرز رہی تھی۔ آج کا اخبار گولا بنا میرے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔

جس کی جلی حرفوں کی خبر میرے گھر کے لیے ایٹم بم کا درجہ رکھتی تھی۔

ٹی وی اسٹار وری کا بلند پایہ اسٹار شایان سے عشق......!

اف خدا سمجھے ان اخبار والوں کو...... ایسی خبریں لگاتے ہیں کہ اخبار نہ ہوا چاٹ کا مصالحہ ہو گیا۔

یہ نہیں سمجھتے کہ ایسی خبروں کی اشاعت سے کسی کی ذاتی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ اماں تو میرے سینے میں خنجر گھونپ دیں گی۔

"وری...... کیا آج ناشتہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے......" بھابی میرے کمرے میں کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"نہیں بھابی...... ابھی دل نہیں چاہ رہا۔"

"اچھا...... ذرا...... آج کا اخبار تو دکھاؤ......" انھوں نے شرارت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ بھابی...... آپ دیکھ کر جلدی سے تکیئے کے نیچے رکھ دیجئے۔" میں روہانسی تھی۔

"ماشاءاللہ تم دونوں کتنے پیارے لگ رہے ہو۔" وہ میری اور شایان کی تصویر کو محبت سے

دیکھتے ہوئے بولیں......!

''ارے یہ پچھلے ڈرامے کی تصویر ہے......'' میں شرمسائی۔ شایان میرے بالوں میں گجرا سجا رہے تھے۔ اور میں ان کے ہاتھوں کے ہالے میں چھوئی موئی کی طرح کھڑی تھی۔

''رات شانی کا فون بھی آیا تھا۔'' انھوں نے دھاکہ کیا؟

''اچھا...... کیا کہہ رہے تھے...... وہ......'' میں ان کا ذکر سن کر پھر بے سدھ سی ہوگئی۔

''کہہ رہا تھا...... کوئی اسٹیج ڈرامہ کراچی میں ہو رہا ہے اس میں وہ اپنے ساتھ تمہیں ہیروئن بک کرنا چاہتا ہے۔''

''بھابی آپ اسٹیج ڈرامے کے لئے بھائی جان سے اجازت دلوا دیں گی۔'' میری بے تابی دیدنی تھی۔

''ہاں ان کی طرف سے تو اجازت شائد مل جائے۔ مگر تمہاری اماں جان خاصا شور مچائیں گی۔ یاد ہے کہ ٹی وی پر ہی اجازت کن مشکلوں سے ملی ہے۔''

''ارے اماں کو میں سمجھا لوں گی۔'' اماں میرے رونے دھونے سے تنگ آ کر مان ہی جایا کرتی تھیں۔

شایان کے ساتھ کام کرنا۔ میری فنکارانہ زندگی کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ تو اتنے بڑے اداکار تھے کہ لوگ ان کی آمد کو ہی اپنے لئے اعزاز کی بات سمجھا کرتے تھے۔

میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ ان کے ساتھ کام کروں گی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہمارے گھر کا ماحول خاصا دبو قسم کا تھا۔ لڑکیوں کو خوب دبا کر رکھا جاتا تھا...... اسکول' کالج بھیج کر احسان کیا جاتا تھا۔

بڑی آپا نے بے حد مشکلوں سے انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی...... دروازے کی دستک سن کر کوئی لڑکی دروازہ کھولنے کی مجاز نہیں تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی سننے کے باوجود لڑکیاں بہری ہو جایا کرتی تھیں گھر کے لڑکے فون ریسیو کیا کرتے تھے لڑکیاں کہیں جاتیں تو اماں کی موجودگی لازمی ہوا کرتی تھی۔

میں سب بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔

پاپا کے انتقال کے بعد۔ بڑے دو بھائی اپنا حصہ لے کر گھر چھوڑ گئے۔ ان کی بیویاں علیحدہ گھر میں رہ کر زیادہ خوش تھیں۔ بڑی آپا اپنے میاں کے ساتھ سعودی عرب چلی گئیں۔ اور چھوٹی آپا کے میاں کا ٹرانسفر فیصل آباد ہوگیا۔

تب چھوٹے بھائی نے مجھ پر لگائی ہوئی ساری بے جا سختیاں ختم کر دیں۔ اور میں بے

تحاشہ پڑھتی چلی گئی۔ کالج سے یونیورسٹی جا کر۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہاں کی دنیا میری دنیا سے کس قدر مختلف تھی۔ ہر لڑکی اپنے آپ میں مست تھی۔ کسی کو کسی سے سروکار ہی نہیں تھا۔ تب میں نے پہلی دفعہ یونین کے تحت ہونے والے ڈرامے میں کردار ادا کیا۔ اپنے پہلے ڈرامے میں میری کامیابی اس قدر شاندار تھی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ پریس نے خاصی کوریج دی۔

یوں میرا شمار بھی یونیورسٹی کی جانی پہچانی طالبات میں ہونے لگا۔ مگر اماں مجھ سے خفا خفا سی تھیں۔

''وری یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔

''کیا اچھا نہیں کیا؟'' میں ان کی بات سمجھ کر بھی پوچھتی۔

''اے ہے کیا اچھا لگتا ہے کہ بن بیاہی لڑکی کبھی کسی کی بیوی بنے اور کبھی کسی کی۔''

''ارے اماں ڈرامے میں بیوی بن جانے سے کیا سچ مچ کی بیوی بن جاتے ہیں؟'' مجھے ان کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی۔

''ارے نہ بنتے ہوں۔ مگر چہرے کی آب تو ختم ہوگئی ناں۔''

''میری سمجھ میں' تو آپ کا فلسفہ آتا نہیں' آپ ان لڑکیوں کو نہیں دیکھتیں۔ جو گھر میں بیٹھی ہوتی ہیں۔ ان کو سورج تک آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا۔ نہ ان کے چہرے پر آب ہوتی ہے نہ تاب اور نرے خاک سے چہرے ہوتے ہیں۔''

''ارے چل تو کیا سمجھے گی۔''

اور میں واقعی ان کی باتیں سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

علاقہ تھر کی قحط سالی کی امداد کے لیے یونیورسٹی نے ایک بڑے فنکشن کا اہتمام کیا۔ اس میں پیش کیے جانے والے ڈرامے کی ہیروئن میں ہی تھی۔

میری غضب کی اداکاری نے سب کو حیران کر دیا۔ اس میں میرا کردار ایک اندھی لڑکی کا تھا' جو لوگوں کو ان کے قدموں کی چاپ سے پہچانا کرتی تھی۔ ڈائیلاگ سے زیادہ میرے ایکسپریشن عمدہ تھے۔

اس ڈرامے نے وہ دھوم مچائی کہ راتوں رات شہرت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگئی۔

ٹی وی اور ریڈیو کے پروڈیوسر میرے گھر کے چکر کاٹنے لگے مگر اماں تو ایسی چراغ پا تھیں کہ چھوٹے بھیا نے بھی سب سے معذرت کر لی۔

''ہمارے گھر کا ماحول ابھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہماری بہن ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرے۔''

بھیا کے اس اقدام کا میں نے خاصا برا مانا۔ میرے اندر جو کچھ کرنے کا جذبہ تھا۔ وہ اندر ہی اندر جلنے لگا۔

''وریٰ تم ہوش میں آ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں یونیورسٹی سے بھی اٹھا لوں گی۔'' اماں کا غصہ انگارے برسا رہا تھا۔ اور میں اندر' باہر کی تپش سے جھلسے جا رہی تھی۔

میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔ کچھ منوانا چاہتی تھی۔ مگر اماں کی اس روک ٹوک کے آگے بے بس تھی۔ تب ان دنوں میں تکیئے کو اپنے چہرے سے لگائے خوب دھواں دھار رویا کرتی تھی۔

شاید اماں کا دل پسیج بھی جاتا کہ چھوٹے بھیا نے بھی دھماکہ کر دکھایا اور رابعہ سلطان سے شادی کر لی۔

ان کی یہ شادی کورٹ شپ کا نتیجہ تھی۔ ورنہ ان کا خاندان بھی اس اقدام کے سخت خلاف تھا۔ مگر وہ دونوں اپنی محبت میں اس قدر سرشار تھے کہ شادی کر کے ہی دم لیا۔

اماں نہ صرف چھوٹے بھائی سے ناراض تھیں بلکہ ان کو بھابھی بھی ایک آنکھ نہ بھائی تھیں۔ حالانکہ لمبی تڑنگی...... بوائے کٹ بالوں والی بھابی طبیعت کی بے حد بھلی تھیں۔ اپنے کام سے کام رکھتیں۔ کسی کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاتیں۔ اماں کی سرکشی کو وہ محسوس کرتیں مگر منہ سے کچھ نہ بولا کرتی تھیں۔

ہاں ان کی مجھ سے بے حد دوستی تھی۔ میں حالات سے سمجھوتہ کرنے والی لڑکی تھی۔ چھوٹے بھائی نے اگر اپنی پسند سے شادی کر لی۔ تو کیا ہوا؟

''بقیہ دو بھائیوں کی شادیاں آپ نے خود کی تھیں وہ اور ان کی بیویاں آپ کے حق میں کتنے بہتر ثابت ہو رہی ہیں۔'' یہ بھی کبھی سوچا؟'' میں اکثر ان کو سمجھاتی۔

''ارے یہ ایسا نہیں تھا۔'' وہ بے تحاشہ روئے چلے جاتیں!

''اماں لڑکے سب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ چھوٹے بھیا نے اگر اپنی پسند سے شادی رچائی ہے تو اس میں بھابی کا بھلا کیا قصور ہے؟''

''ارے سارا قصور اسی کلموہی کا ہے سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ کم بخت نے پھانس لیا میرے بیٹے کو۔'' وہ چیخ چیخ کر بھابی کو سناتیں۔

''اماں پلیز! آپ تو ایسا نہ کہیئے۔ اب وہ ہماری بھابی ہیں آپ کی بہو ہیں اس گھر کی عزت ہیں آپ اگر ایسا کہیں گی تو پھر دوسرے لوگ تو اس سے زیادہ کہیں گے۔''

''ارے تو رہنے دے مت سمجھایا کر مجھے' سچ بات جو ہو گی وہ سب ہی کہتے ہیں۔'' وہ غصے میں آتیں تو کوئی بات مان کر نہ دیتیں۔

''بیکار میں غصہ کرتی ہیں آپ' یہ نہیں سوچتیں کہ چھوٹے بھائی ان کو پا کر کس قدر خوش ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ان کے ارمانوں کو جیسے خوشیوں کا خزانہ مل گیا ہو۔''

''ہاں ہاں اس کے ارمان تو رنگ لا رہے ہیں۔ بہاریں دکھا رہے ہیں' مگر میرے سارے ارمانوں کے تو اس نے لاشے بکھیر دیئے۔ کیا کچھ میں نے سوچا تھا۔ اس کے لئے کتنی جگہوں کی خاک چھانی تھی۔'' وہ اس ذکر پر پھر آبدیدہ ہو جاتیں۔

''ارے چھوڑیئے اماں۔'' میں سمجھا سمجھا کر انہیں تھک سی جاتی۔

''میں کیسے چھوڑ دوں۔ ہاں تُو تو اکبر کی بڑی چہیتی بہن ہے اس سے کہو۔ اس لم ڈھنگو کو چھوڑ دے کم بخت کا کیسا ہتھنی سا قد ہے بری لگتی ہے مجھے۔''

''اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ ایسا بھی ہوا ہے ہمارے خاندان میں؟''

''مگر ایسا بھی تو کبھی نہیں ہوا۔ اکبر اپنی شادی میں ماں اور ایک بہن کا وجود بھی برداشت نہ کر سکا۔''

''سب بھول جایئے۔ آپ یہ دیکھئے بھابی کتنی اچھی ہیں۔!''

''خاک اچھی ہیں۔ چوروں کی طرح گھر سے بھاگ کر شادی کر لی۔'' وہ بلبلا کر پھر رو پڑیں۔

ان کو یوں روتا دیکھ کر باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی بھابی خفت زدہ ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئیں شام کو وہ اپنے کمرے سے نکلیں تو ان کی آنکھیں بھی متورم تھیں۔ اور بھیا علیحدہ جھنجلائے جھنجلائے سے تھے۔

''وریٰ ادھر آؤ۔'' وہ غصے سے بولے۔

''جی! بھائی جان!'' میں ان کا یہ روپ دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔

''اگر اماں رابی کو برداشت نہیں کر سکتیں تو ہم علیحدہ گھر میں چلے جاتے ہیں۔''

''نہیں۔ بھائی جان ایسا نہ کہیئے۔''

''پھر میں کیا کروں۔'' ان کی پریشانی دیدنی تھی۔

''میں اماں کو سمجھاؤں گی۔''

''خاک سمجھاؤ گی تم۔ ان کا جو دل چاہتا ہے کہے چلی جاتی ہیں۔''

''بھائی جان! یہ بھی تو سوچئے کہ ان کا صدمہ بھی خاصا بڑا ہے۔''

''میں مر تو نہیں گیا۔ شادی ہی کی ہے ناں اور کیا کیا ہے۔'' وہ بپھرے۔

''خدا نہ کرے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔''

''وری! تم جانتی ہو رابی مجھ سے شادی کرنے کے سبب اپنے خاندان سے بھی کٹ گئی ہے۔ اگر اسے ہمارے گھر میں بھی طعنے تشنے ملیں گے۔ تو شادی اس کے لیے قطعی نقصان کا سودا ہوا ناں۔''

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ بھابی مجھے بے انتہا پسند ہیں۔ اماں کا صدمہ بھی وقتی ہے کچھ ہی دنوں میں وہ نارمل ہو جائیں گی اگر آپ اپنی پسند بتا دیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ بلکہ وہ خوشی خوشی بیاہ لاتیں۔''

''وری! تم نہیں جانتیں' رابی کے والد انتہائی سخت آدمی ہیں آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ان کے ہاں غیر سیدوں میں شادیاں نہیں ہوا کرتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک پکے بزنس مین ہیں۔ اور میں ان کی توقعات پر پورا نہیں اترتا تھا۔ انہیں جب ہماری محبت کا علم ہوا تو وہ اسی شام رابی کی شادی اپنے بزنس پارٹنر کے صاحبزادے سے کر رہے تھے جو کہ ان کا ہم پلہ بھی تھا اور ہم ذات بھی۔''

''افوہ! بدذات تو ہم بھی نہیں بھائی جان!''

''یہ میں کب کہہ رہا ہوں۔'' وہ مسکرائے۔

''اگر آپ بھابی پر عاشق تھے' تو وہ بھی آپ پر ہوں گی۔ اس کے باوجود ان کے والد صاحب کا دماغ تنا رہا۔''

''ارے ایسا ویسا' بلکہ بہت زیادہ۔ ان کا تو بس نہیں رہا تھا کہ وہ رابی کے بھی ٹکڑے کر دیں مگر اس کا بھائی میرا دوست تھا۔ اس نے اس سلسلے میں' میری پوری پوری مدد کی۔ اور رابی اتنی خوف زدہ تھی کہ بڑی مشکلوں سے میری التجاؤں اور اپنے بھائی کے کہنے سے وہ کورٹ شپ پر راضی ہوئی۔ یقین کرو۔ وری۔ اگر رابی مجھے نہ ملتی تو میں ساری زندگی اپنے آپ کو ادھورا ادھورا سا سمجھتا۔''

''کمال ہے جب بھائی تیار تھا۔ تو اتنا عرصہ ہو گیا اس نے اپنی شکل بھی نہیں دکھائی۔'' مجھے خاصا تعجب ہو رہا تھا۔

''وہ فنکار آدمی ہے۔ پچھلے دنوں اپنی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں باہر تھا۔ اب اپنے اسٹیج ڈرامے کے سلسلے میں کل یہاں آ رہا ہے ہمارے پاس ہی ٹھہرے گا۔''

اور میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شایان جیسا بڑا فنکار بھابی کا بھائی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کیا آیا۔ ہمارے گھر میں خوشیوں کا سیلاب آ گیا۔

ہنسنا اور ہنسانا۔ اس کا شوق تھا۔ اماں جو بھابی سے اکل کھرے انداز میں پیش آتی تھیں

شایان کے لطیفوں سے کھل کر قہقہے لگاتیں۔

وہ نجانے کہاں کہاں سے قصے گڑھ کر اماں کو سناتا اور اماں ہنسے چلی جاتیں۔

''ارے خالہ جان کل ایک عجیب لطیفہ ہو گیا۔'' میں ہاشو آڈیٹوریم کے پاس اپنے دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک صاحب آئے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور بڑی رقت سے بولے۔ ''سو فی صد آپ مشابہ ہیں۔''

''بھائی کس سے مشابہ ہوں۔'' میں حیران تھا۔

''بس مونچھوں کا فرق ہے آپ کی شکل ہماری خالہ جان سے بہت ملتی ہے۔''

''مگر میری تو مونچھیں نہیں ہیں۔'' میں جھنجلا کر بولا۔

''مگر ہماری خالہ جان کی ہیں۔'' انھوں نے انتہائی اطمینان سے کہا۔

اماں کو ہنستے ہنستے اچھو ہو گیا اور میرا قہقہہ اتنا واضح تھا کہ وہ یکبارگی مجھے گہری نظروں سے دیکھتے گئے۔

''شانی۔ یہ وری تیری بڑی فین تھی۔'' بھابی نے اسے بتایا۔

''کیا اب نہیں رہی۔'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

''بھابی نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ آپ ان کے بھائی ہیں۔''

''اب تو آپ کو علم ہو گیا اب آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔'' وہ کھنکار کر شرارت سے بولے۔

''جی آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے ان کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''میرا خیال ہے کہ اگر آپ پہلے میری فین تھیں تو اب تو ترقی کر کے ایئر کنڈیشن ہو جانا چاہیے۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''ارے پہلے ہمیں اپنا ڈرامہ دکھاؤ۔ پھر یہ رائے دے گی۔'' بھابی نے میری مشکل حل کرتے ہوئے کہا۔

''ان کی رائے کی' تو بہت اہمیت ہے بھئی۔'' ان کی آنکھیں پھر شریر ہونے لگیں۔

''ارے تجھے نہیں پتہ۔ یہ خود فنکارہ ہے یونیورسٹی میں اتنا اچھا ڈرامہ کیا تھا کہ لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔''

''ارے نہیں۔'' وہ حیرت سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔

''یہ دیکھئے میری تصویریں۔'' میں نے جوش میں آ کر ڈرامے کا البم انھیں اٹھا کر دے دیا۔

وہ ہر تصویر دیکھ کر مجھے دیکھتے اور نفی میں گردن ہلا دیتے۔

"نہیں ربو میں نہیں مان سکتا۔ یہ تصویریں کسی اور کی ہیں۔ یہ ان کی شکل سے ملتی جلتی کسی لڑکی کی ہیں۔"

"ارے یہ میں ہی ہوں۔ ہیروئن بنی تھی اس میں یہ میرا سرٹیفکیٹ رہا۔" مارے جوش کے میں سرخ پڑ گئی۔

"وری یہ واقعی تم ہو۔" ان کی آنکھیں مجھ میں گڑ گئیں۔

"ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔" میں چلائی۔

"میرے ساتھ ایک ٹی وی ڈرامہ پلے کرو گی؟ انھوں نے بھابی کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر میرے ہاتھ تھام لئے۔"

"اماں اجازت نہیں دیتیں۔" میں نے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"پلیز صرف ایک ڈرامے میں۔" انھوں نے التجا کی اور مجھے یوں لگا کہ میں بادلوں کے سنگ اڑ رہی ہوں اوپر ہی اوپر۔ اتنا بڑا فنکار میری خوشامدیں کر رہا تھا۔ انھوں نے شاید میرے فن کو مان لیا تھا۔

اس رات میں بھیا اور بھابی کے ساتھ ان کا شو دیکھنے گئی۔ ڈرامہ کیا تھا۔ ون مین شو تھا۔ شایان واقعی غضب کے اداکار تھے۔ لڑکیاں ان سے آٹو گراف لینے کے لئے تڑپی جا رہی تھیں۔ اور وہ کیسی جاندار مسکراہٹیں لبوں پر سجائے سب سے باتیں کر رہے تھے۔

ہر طرف ان کی واہ واہ تھی۔ ان کی پرسنالٹی سے سب بے حد متاثر تھے۔

ڈرامے کی ہیروئن تو ان پر مرمٹی تھی۔ شایان شایان کرتی ان کے پیچھے پھر رہی تھی۔ ان کا لمبا قد' تیکھے نقوش' بڑی بڑی براؤن آنکھیں۔ لڑکیوں کو ان کا دیوانہ بنا رہی تھیں۔ اور پھر ان کی آواز کس قدر دل میں اتر جانے والی تھی۔ کس دل نشین انداز میں وہ دیکھا کرتے تھے کہ مخاطب ان کی نظروں کی مقناطیسیت سے گھبرا جاتا۔

ان کا اخلاق اتنا اچھا تھا کہ ہر ایک سے انتہائی متانت سے پیش آتے۔

صحافیوں اور فوٹو گرافرز کا بے حد احترام کرتے۔ ڈرامے ختم ہونے کے بعد کیمرہ لائٹس نے انھیں روشنی میں نہلا دیا تھا۔ ان کا مسکراتا وجود سب میں ممتاز نظر آ رہا تھا۔

اچانک انھیں کیا سوجھا۔ میں بھابی کی بغل میں کھڑی تھی' میرا وری کا ہاتھ کھینچا اور اپنے برابر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"اب ٹی وی پلے میں مس وری میرے ساتھ ہیروئن ہوں گی۔" روشنی کے کئی جھماکے۔

میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ اور میں ہکا بکا سی ان کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اگلی صبح اخبارات میں یہ خبر نمایاں شائع ہوئی تھی۔ معروف اداکار شایان نے ٹی وی پلے میں کام کرنے کے لیے اپنی پسند کی ہیروئن چن لی۔ مس وری احمد یونیورسٹی کی طالبہ ہیں اور ایک اچھی فنکارہ بھی ہیں۔

اخبار میں میری تصویر کے ساتھ کیپشن پڑھ کر اماں کا غصہ آگ برسا رہا تھا۔ شایان انھیں انتہائی برا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات کا جواب دینا بھی انہوں نے چھوڑ دیا۔

"بہن نے بیٹے کو پھسلایا اور بھائی میری بیٹی کو بہکانے آ گیا۔" ان کے جملے سب کے ذہنوں پر سنگباری کر رہے تھے۔

تب میری خوشامدیں۔ میرا گریہ۔ انہیں پسیج گیا اور بڑی مشکلوں سے مانیں۔ "وری کہیں ٹی وی پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ تم فلم کی اجازت تو نہیں مانگو گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں سمجھوں گی کہ میری بیٹی بھی ناخلف بیٹوں کی طرح ہے۔

تب میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ "اماں میں صرف اور صرف اپنے فن کی تسکین کروں گی۔ اگر آپ مجھے دیکھیں تو بخدا میری گردن اڑا دیجئے شایان یا کسی اور میں مجھے قطعی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔"

شایان کے ساتھ میرا پہلا ڈرامہ یوں کلک ہوا تھا کہ ٹی وی پروڈیوسر بھی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ میرے ڈائیلاگ بچے بچے کی زبان پر تھے۔

ہماری تصویریں ہر رسالے کے سرورق پر جگمگا رہی تھیں۔

"اتنی دبلی پتلی گڑیا سی لڑکی۔ یوں ڈوب کر بھی اداکاری کر سکتی ہے۔" شایان واقعی حیران تھے۔

"وری تم نے تو کمال کر دیا۔" وہ اپنے مسحور کن لہجے میں بولے۔

"کیسا کمال؟" میں چندرائی۔

"میری کامیاب ہیروئن بن کر۔" ان کی آنکھوں کے خواب خاصے واضح تھے۔

"آپ کی ہر ہیروئن ہی کامیاب ہوتی ہے۔" میرا یہ جملہ ان کے انیٹ بن کر لگا۔ خاصے تلملا کر رہ گئے۔

"وری تمہاری جیسی بات کسی میں نہیں ہو سکتی۔"

"یہ کس پلے کا ڈائیلاگ ہے۔ پلیز بتائیے۔ میری انٹری۔ کہاں سے ہو گی۔" میں نے شرارت سے ہنس کر کہا۔

اور وہ کھول کر رہ گئے۔ ’’ذرا سی لڑکی کے مزاج تو دیکھو۔ ذرا ایک ڈرامہ کیا کرلیا۔ محترمہ اوپر ہی چڑھ گئیں۔‘‘

’’ارے صاف کہیے ناں کہ اپنی اوقات بھول گئیں۔‘‘ میرا لہجہ زہر آلود تھا۔

’’اوہ۔ نو۔ یہ بات نہیں ہے۔‘‘ وہ گڑبڑائے۔ ’’میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ پلیز۔‘‘ انھوں نے میرے ہاتھ تھام کر اپنے کشادہ سینے پر رکھ لئے اور مجھے یوں لگا کہ میرے ہاتھ جل گئے ہوں۔ فوراً ہاتھ چھڑا کر اپنے کمرے میں بھاگی۔

شایان کے جانے کے بعد۔ میں نے دیگر فنکاروں کے ساتھ بھی ڈرامے کیے مگر یہ حقیقت تھی جو لطف شایان کے ساتھ آیا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ نہ آیا۔ یہ پرانے فنکار نئے فنکاروں کو کچھ گردانتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا رویہ بھی خاصا ہتک آمیز ہوتا تھا۔ اس لئے خاصی بوریت ہوتی۔

نئی سیریز کے لئے جب ٹی وی سے میرے لئے کال آئی تو میں نے صاف انکار کردیا۔

’’کیوں شوق ختم ہوگیا کیا؟‘‘

’’ہاں اب اتنا زیادہ بھی نہیں رہا۔‘‘

’’سوچ لو۔‘‘

’’خوب سوچ لیا ہے۔ جب موڈ کرے گا تو میں آپ کو خود فون کرکے کہہ دوں گی۔‘‘

’’ہمارا یہ خیال ہے کہ تم آج ہی فون کرکے حامی بھروگی خاصا۔‘‘ وثوق سے کہا گیا۔

’’نہیں محترمہ! اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔‘‘

’’ہمارا خیال ہے کہ ایسی بات ہے۔‘‘ ہدایت کارہ دل کھول کر ہنسیں۔

’’مگر آپ ایسا کیوں‘ اور کس وجہ سے کہہ رہی ہیں؟‘‘

’’اس لئے مائی ڈیئر کہ اس سیریز کے ہیرو شایان ہیں اور وہ صرف اسی شرط پر اس میں کام کرنے پر تیار ہوئے ہیں کہ لیڈنگ رول ورئی کریں گی۔‘‘

’’اوہ یہ بات ہے۔‘‘ میں نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔!

’’تو پھر۔ آج آپ آرہی ہیں نا!‘‘

’’جی میں سوچوں گی۔‘‘ اپنی بات کا آخر کچھ تو بھرم رکھنا ہی تھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ابھی قلانچیں بھرتی...... چلی جاؤں!

’’ارے کیا سوچنا بھی پڑے گا۔‘‘ ہدایت کارہ خوب دل کھول کر ہنسیں۔

’’جی ہاں بالکل!‘‘

اور پھر اسی شام میں کنٹریکٹ پر سائن کرنے ٹی وی اسٹیشن پر موجود تھی۔

’’من کی جیت‘‘ دو محبت کرنے والے کی کہانی تھی جن کی محبت کے آگے کوئی بند نہیں باندھا جا سکتا تھا۔ سیریز کیا تھی ایک خوبصورت اور جذباتی ڈرامہ تھا۔ جس میں شایان اور میرے وجود نے ایک رنگ بھر دیا تھا۔

سیریز اتنی کامیاب ثابت ہوئی تھی کہ ابتدائی قسطوں نے ہی ناظرین کو بے حد متاثر کر دیا تھا۔ میری اور شایان کی تصویریں چپے چپے پر لگ رہی تھیں۔

اخبارات من مانے انٹرویوز شائع کر رہے تھے اور اب ایک اخبار نے یہاں تک لکھ دیا تھا ٹی وی اسٹار ورئی کا معروف اداکار شایان سے عشق!

اخبارات کی یہ خبریں میرے من میں ہلچل مچا رہی تھیں اور میں ایسے اخبارات چھپاتے چھپاتے تھک گئی تھی۔

سیریز کی پندرہ قسطیں ناظرین کی پسندیدگی کی وجہ سے کھینچ کر اکیس قسطوں تک کر دی گئیں اور اس کا آخری ڈرامہ لوگوں کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔ ڈرامے میں بالآخر میری اور شایان کی شادی ہو ہی گئی۔

میں دلہن بنی بہت خوبصورت لگ رہی تھی اور شایان تو واقعی کہیں کے شہزادے لگ رہے تھے اس لباس میں۔ ان کے لبوں سے رومانی جملے سن کر مجھے حقیقت میں پسینے آرہے تھے۔ میرا سین جو ایک بار میں اوکے ہو جاتا تھا وہ بار بار ہو رہا تھا۔ میری گھبراہٹ سے شایان بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔

’’ورئی دلہن بننا اتنا مشکل کام تو نہیں ہے۔‘‘ انھوں نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔

’’جی ہاں آپ کے لئے تو یہ کام روزمرہ کا ہے مگر میرے لئے نہیں۔‘‘ میں بھی غصے سے ان کے کان کے پاس جا کر منمنائی۔

’’تم دل سے قبول کرلو۔ تو پھر وعدہ رہا کہ تمہارے سوا کسی کا دولہا نہیں بنوں گا۔‘‘

ان کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ مجھے یوں لگا کہ میرا دل ان کے سینے میں دھڑک رہا ہو۔

شایان کی محبت میری رگ رگ میں موجیں مار رہی تھی اور آخری سین کراتے وقت میں یہ سمجھ رہی تھی کہ شایان کے ساتھ میرا حقیقت میں عقد ہو رہا ہے۔ میرے چہرے کی ادائیں اتنی فطری تھیں کہ شایان ہکا بکا مجھے دیکھے جا رہے تھے! اور ہدایت کارہ تو مارے خوشی کے مری جا رہی تھی۔

’’بہت خوب۔ بہت اچھا۔ ورئی تم نے کمال کر دیا۔ ایکسپریشن دینے میں تو تمہارا کوئی مقابل نہیں آئندہ سیریز میں بھی‘ میں تمہیں لوں گی۔‘‘

مگر میں تو اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ مرے ہوئے قدموں سے جس طرح میں گھر پہنچی تھی یہ میں ہی جان سکتی تھی۔

"وری۔ ارجمند آپا اپنے لڑکے وقاص کا تمہارے لیے رشتہ لائی ہیں۔" گھر پہنچتے ہی یہ خبر میرے حلق تک کو کڑوا کر گئی۔

"مجھے وقاص پسند نہیں۔" میں بڑبڑائی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تکیئے پر سر رکھ کر لیٹی تو شایان تصوراتی ہنڈولوں میں بیٹھے آموجود تھے۔ ان کے ڈائیلاگ میرے سینے میں ہر دھڑکن کے ساتھ مچل رہے تھے۔

"تمہیں نہ دیکھوں تو دن میں اجالا نظر نہیں آتا۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔"

"قربت کے لمحے وجدانی ہوتے ہیں سکون وطمانیت ساری دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔"

"اپنی دنیا اپنے سامنے ہو تو خدا سے کچھ اور مانگنا غلط ہوگا۔"

"تم اب تم نہ رہیں بلکہ میرے وجود کا ایک حصہ بن گئی ہو۔"

تب میں آنکھیں موندے گھنٹوں پڑی رہی شانی کے جملے امرت بن کر بوند بوند میرے حلق کو تر کرتے رہے۔

"کیا بات ہے وری۔ اپنے کمرے میں کیوں بند پڑی ہو۔ لائٹ تک نہیں جلائی۔" بھابی لائٹ آن کرتے ہوئے بولیں۔

اب میں ان کو کیا بتاتی کہ میرے اندر روشنیوں کے اس قدر جھماکے ہو رہے تھے کہ میں اس نور میں نہائی ہوئی تھی۔ بلکہ اس روشنی کا حصہ بن چکی تھی۔

"بہت خاموش ہو۔" مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر وہ فکرمند سی ہو گئیں۔

"نہیں بھابی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں!"

"من کی جیت کی آخری قسط ریکارڈ ہو گئی۔!"

"آج وہی کام تو نمٹا کر آئی ہوں!"

"تو پھر کس کی جیت ہوئی۔" انہوں نے شرارت سے پوچھا۔!

"بھابی جان...... جیت تو من کی ہوئی۔" میں جھینپے ہوئے انداز میں بولی۔

"خدا کرے یہ جیت دائمی ہو جائے۔" انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر دعا دی۔

"آمین۔" میری رواں رواں پکار اٹھا۔!

"وری۔ ابھی شانی کا بھی فون آیا تھا۔"

"جی؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھا۔

"وہ تمہارے لیے بڑا بے کل ہو رہا ہے۔"

"میں کیا کروں بھابی!" میں بے اختیار رو پڑی۔

"میں کوشش کروں گی کہ تمہاری حق میں کوئی۔ بہتر صورت نکل سکے۔" انھوں نے میرے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

آخری جملے شاید اماں نے بھی سن لیئے تھے کمرے میں آ کر وہ برسیں کہ میں دیکھتی رہ گئی۔

"رابعہ سلطان...... تم یہ مشورہ کیوں نہیں دیتیں کہ میں بھی بھاگ کر آئی ہوں۔ تم بھی بھاگ کر میرے بھائی کے ساتھ شادی کر لو۔ تاکہ تمہاری ماں کا منہ خود بخود بند ہو جائے۔"

"اماں جان!" میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" وہ گڑبڑائیں۔

"تمہارے جو مقصد تھے وہ میں پوری طرح جان چکی ہوں۔ ایک بھولی بھالی لڑکی کو جس طرح تم نے فریب دیا ہے وہ میں سمجھ چکی ہوں۔"

"اماں...... آپ بھابی کو غلط سمجھ رہی ہیں۔ انھوں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" میں اس صورت حال سے خاصی پریشان ہو گئی!

"وری! تو نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ صرف اپنے فن کی تسکین کرے گی۔ یہ عشق نہیں بھگارے گی۔ اب بتا تیرا یہ وعدہ کہاں رہا۔ تو بتا کہ شایان سے تجھے محبت ہے یا نہیں۔ ہاں تو کہہ دے کہ نفرت ہے تجھے اس سے۔ ڈرامے میں کام کرنا اور بات ہے اور محبت کرنا دوسری بات ہے بول وری۔ جواب دے۔ اور بتا کہ شایان تجھے کیسا لگتا ہے؟

اماں اپنے سینے پر دوہتڑ مار کر چیخ چیخ کر رو رہی تھیں اور ان کی زبان کے کوڑے۔ مجھے لہولہان کر رہے تھے۔ "خدا کے لیئے اماں آپ چپ ہو جایئے۔ میری بات بھی سنیئے۔"

"تجھے قسم ہے اپنے مرے ہوئے باپ کی تو جو بات کہے گی سچ کہے گی۔" ان کی آواز خاصی رندھیا گئی تھی۔

"اماں...... میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں میں شروع سے ہی شایان کی اداکاری سے متاثر ضرور تھی مگر اس کے عشق میں گرفتار نہ تھی...... مگر اماں جب میں نے اس کے ساتھ پچیس تیس ڈراموں میں اس کی ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ تو اماں مجھے یوں لگا کہ بار بار کی تکرار سے یہ ساز میرے دل میں بھی بجنے لگا۔ میرا دل میرا نہ رہا۔! اس کی محبت کا والہانہ پن۔ میری رگ رگ میں سرایت کر گیا۔

"اماں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس سے محبت ہے میں اس کے بنا نہیں رہ سکتی۔"

"تو بھی بھاگ جا...... کر لے اس سے کورٹ شپ۔" اماں کا استہزائیہ جملہ۔ بھابی کو بھی رلا گیا۔

"نہیں اماں۔ آپ ایسا نہ کہیئے۔ مجھے آپ کی عزت عزیز ہے۔ میں ساری زندگی اس کے نام پر بتا دوں گی۔ کسی سے شادی نہیں کروں گی......" میرے لہجے کا عزم خاصا مضبوط تھا!

"تو بیٹھی رہے گی ناں...... مگر وہ تو نہیں بیٹھے گا کل کو کسی دوسری سیریز میں کام کرے گا۔ اپنی ہیروئن سے محبت کی تکرار کرے گا۔ تو اس پر عاشق ہو جائے گا بول پھر کیا کرے گی...... پھر اپنے عشق اور محبت کو کس جگہ جا کر دفنائے گی۔"

"اماں جان میرا فنکار بھائی مزدور ہے مگر محبت کا بیوپاری نہیں' وہ ہم سب بھائیوں اور بہنوں میں سب سے بڑے ہیں مگر آج تک شادی کے نام پر بھاگتے رہے درجنوں فلموں میں کام کیا۔ مگر کبھی ان کا سکینڈل بھی نہیں بنا۔ یہ صرف اور صرف وریٰ ہی تھی...... جس نے میرے بھائی کے دل کو تاراج کیا ہے اور وہ اس کے دیوانے ہو گئے ہیں۔"

ارے چھوڑو...... یہ فضول باتیں ...... تم اکبر کے نام پر دیوانی ہو گئیں۔ وریٰ کے نام پر تمہارے بھائی پاگل ہو گئے یہ بھکتا لڑھکتا سا تمہارا خاندان ہے کیا؟ اور ماں باپ ایسے طرح والے کہ پلٹ کر اپنی بیٹی کو دیکھا تک نہیں کہ وہ کس حال میں ہے۔"

"اماں جان آپ مان جایئے میرا بھائی بہت پیارا انسان ہے۔ وریٰ اس کے ساتھ خوش رہے گی۔"

"ارے یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ جب تمہارے ماں باپ نے اپنے داماد کو قبول نہیں کیا تو اس گھرانے کی بہو کو کیسے قبولیں گے۔ بے وقوف ہوتے ہیں وہ لوگ جو صرف خالی لڑکے کی چاہت دیکھ کر اپنی بیٹیاں بیاہ دیتے ہیں۔ لڑکی کا اپنے سسرال سے ہر صورت میں سامنا ہوتا ہے عشق کی تنہائیاں اتنی مشکل نہیں ہوتیں۔ جتنی سسرال کی ہوتی ہیں میاں کو قابو کرنا آسان ہوتا ہے۔"

"شانی اسے الگ رکھے گا اماں...... سسرال سے اس کا رابطہ رہے گا ہی نہیں۔" رابی بھابی التجا آمیز لہجے میں وکالت کر رہی تھیں۔

"میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو اولاد کو ان کے والدین سے کاٹ دیتی ہیں۔ جو اپنے ماں باپ کے حق کو پورا نہ کر سکے وہ بیوی بچوں کے حقوق کیا جانے گا۔" اماں کا اٹل لہجہ بھابی کی تمام باتوں پر پانی سا پھیر گیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ شایان میرے نہیں ہو سکتے اماں کی ضد کو میں ہمیشہ سے جانتی تھی۔ اور اماں کی ضد سے ٹکرانا میری آن کے خلاف تھا۔ ان دنوں بہار کا موسم بھی مجھے خزاں سا لگتا تھا۔

شاید انسان کے اندر کا موسم جب تک اچھا نہ ہو تو اسے باہر کے موسم بھی اچھے نہیں لگتے۔

شانی کے فون اٹینڈ کرنے میں نے بند کر دیئے تھے۔

ٹی وی سے ڈرامے کے لئے کال آئی تو اس کو بھی ٹال دیا۔

تب ایک شام وہ خود چلا آیا۔ شکر ہے اماں کہیں گئی ہوئی تھیں ورنہ وہ تو اس کے لتے لینے سے بھی باز نہ آتیں۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے دھچکہ سا لگا۔ بڑھا ہوا شیو' سرخ سرخ آنکھیں۔ آف وائٹ کرتا شلوار میں وہ بے انتہا تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا آپ کو؟" میں ان کی حالت دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

"ارے مجھے کیا ہونا ہے فراڈی آدمی ہوں۔ عشق کی تجارت کرتا ہوں۔ محبت کی ریڑھی لگاتا ہوں۔ اور ہر کسٹمر سے دل لگاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کھوکھلے پن سے ہنس دیا۔

"میں کیا کروں شانی۔ میرے حالات ایسے ہیں کہ زندہ درگور ہو سکتی ہوں مگر آپ سے کورٹ میرج نہیں کر سکتی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اماں بھابی کو کوئی بھی سکھ نہیں دے سکیں۔ ہمارے چاہنے کے باوجود وہ ان کو بہوؤں کا درجہ نہیں دے سکیں۔ ہمارے قدم اس منزل کی جانب کیسے اٹھ سکتے ہیں جس کی راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہوں اور مجھے نظر بھی آ رہے ہوں یہ ہوش مندی کا راستہ تو نہ ہوا ناں!"

"ہاں تم ہوش کی کلیاں چنتی رہنا۔ اور میں آگاہی کے تمام عذاب سمیٹتا رہوں گا۔" وہ پھر بے دلی سے ہنسا!

"شان تمہاری محبت ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔"

"اچھا؟" وہ طنز سے ہنسا!

"وریٰ احمد کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ آج کل صبح و شام کا پتہ نہیں ہوتا کہ کیا رہے گا کیا بچے گا پھر تم یہ محبت کی آبیاری کرنے کیوں بیٹھ گئیں؟ کسی اچھے سے لڑکے سے جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو اس کے ساتھ بیٹھ کر اس محبت پر ہنس لیا کرنا۔"

من کی جیت ٹی وی کی ایک کامیاب ترین سیریز ثابت ہوئی تھی مگر اس سیریز کے طفیل مجھے من کی شکست نصیب ہو رہی تھی کوئی پہر ایسا نہ تھا۔ جب میرے آنسو شایان کی یاد میں نہ بہتے ہوں۔

جتنا میں انھیں بھولنے کی کوشش کر رہی تھی اتنے ہی وہ تواتر سے یاد آیا کرتے تھے۔

پھر ایک دن اخبار میں یہ خبر خاصی نمایاں شائع ہوئی بلند پایہ فنکار شایان اداکاری سے ریٹائر ہو گئے۔

اپنی زیر تکمیل فلمیں مکمل کرا کے وہ باہر چلے جائیں گے۔ بھابی یہ خبر پڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"وری! میں نہ کہتی تھی۔ میرا بھائی۔ اپنی محبت میں فنا ہو جائے گا مگر اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ اماں جان کو اداکاری بیوپاری لگا کرتی تھی تو اس نے تمہاری خاطر اس سے بھی کنارہ کشی کر لی۔"

شانی کے سرگوشیوں میں بسے محبت بھرے جملے میرے دماغ میں ہتھوڑے سے برسا رہے تھے اور میں خاموش تھی۔

اماں نے شایان کی ریٹائرمنٹ کی خبر سنی اور وہ کچھ خاموش سی ہو گئیں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں برا بھلا نہیں کہا تھا اور نہ ہی بھابی کو صلواتیں سنائی تھیں۔ ورنہ وہ تو اس سارے عذاب کا ذمہ دار بھابی کو ہی ٹھہرایا کرتی تھیں۔ جن کی وجہ سے ان کے گھر کا سکون درہم برہم ہو گیا۔

"وری! وہ جا رہا ہے کبھی نہ آنے کے لیے۔" بھابی جان اخبار کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں اور میرے خاموش آنسو چپ چاپ بہے چلے گئے۔

میں تسلی کا ایک حرف بھی ان سے نہ کہہ پائی اور آخر کہہ بھی کیا سکتی تھی؟

میرے پاس کہنے کے لیئے رہ بھی کیا گیا تھا۔ فیصلہ کرنے کی میں مجاز نہیں تھی۔ حکم عدولی کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

ایسے میں خاموشی ہی میری رفیق ہوتی۔ میں چپ چاپ اپنے پرانے ڈراموں کی تصویریں دیکھتی رہتی جہاں میرا ساتھ پل پل شانو کے ساتھ ہوتا۔

تصویروں کو مسکراتے دیکھ کر میں مسکرانے لگتی۔

اماں میری ناگفتہ سی بہ حالت دیکھ کر بے چین تھیں مگر منہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھیں۔

اخبارات سے شانی کے بارے میں خبریں ملتی رہتی تھیں انھوں نے اپنی فلمیں مکمل کرا دی تھیں۔

اب ان کو فلم اور ٹی وی کی جانب سے الوداعی پارٹیاں کی جا رہی تھیں شایان ہفتے دو ہفتے میں واشنگٹن روانہ ہو رہے تھے۔

اخباری خبروں کے مطابق انھیں جان ہوپ کنس یونیورسٹی میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔ ان کے بیانات سے یہ بات واضح تھی کہ اب وہ کبھی پاکستان واپس نہیں آئیں گے۔

ایسی خبریں پڑھ کر میری حالت مزید دگرگوں ہو جاتی تھی۔ میرا پیار مجھ سے روٹھ کر جا رہا تھا اور اس کو میں منا بھی نہیں سکتی تھی۔ میری قسمت میں شائد اللہ تعالیٰ نے رونا اور سسکنا ہی لکھا

تھا۔

میں رات بھر مصلے پر بیٹھی اپنے اور شانی کے لئے دعائیں مانگا کرتی۔ اپنا فیصلہ میں نے معبود برحق پر چھوڑ دیا تھا!

شاید ان رتجگوں کا ہی صلہ میرے معبود نے مجھے دیا تھا کہ شایان کے والدین اپنے بیٹے کی ضد کے سامنے ہار گئے۔

ایک شام وہ اپنے والدین کے ساتھ ہمارے آنگن میں فخر سے کھڑا تھا۔

ان کے والدین اماں اور چھوٹے بھیا کے سامنے میرے لئے ہاتھ پھیلا رہے تھے۔ بھابی کی چیخیں آسمان تک جا رہی تھیں اور اماں ان کو کلیجے سے لگائے خود بھی سسک رہی تھیں۔

"نہ رو میری بچی۔ اگر میں نے تجھے ستایا تو خود بھی کم پریشان نہ رہی۔"

اور شانی تو بن پیئے مدہوش تھے ان کی آنکھوں کا خمار کی مستی۔ خوب گل کھلا رہی تھی۔

"اب آپ دوبارہ فلم اور ٹی وی کب جوائن کر رہے ہیں؟ میں نے لان میں اپنے پیچھے آتے ہوئے شانی سے پوچھا!

"وہ تو میں نے چھوڑ دیا۔" انھوں نے میرے شانے تھام لئے۔

"مگر کیوں بھئی۔ اب تو آپ کا مسئلہ حل بھی ہونے کو ہے پھر بھی....." میں کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔

"صرف اس لئے وری جان۔ مجھے اپنی ہیروئن مل چکی ہے اور میں دوسری ہیروئن کے ساتھ محبت کا یہ جھوٹا ناٹک نہیں کر سکتا۔"

"اچھا پہلے جو درجنوں فلموں میں کام کرتے تھے وہ سب کیا تھا؟"

"پہلے میرے ڈائیلاگ صرف ڈائیلاگ تھے۔ مگر تمہارے ساتھ کام کر کے ان میں محبت کی اصل روح بھی مل گئی اب میں محبت کے بیوپاری کی کرپان اپنے سینے میں مزید نہیں اتار سکتا۔"

شانی کی محبت میری زندگی کی معراج ہے آج ہماری شادی کو پندرہ برس بیت گئے ہیں مگر مجھے کسی دکھ کا کبھی کوئی احساس ہی نہیں ہوا۔

ان کی محبت وہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جس میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی اماں کی وفات کے بعد ہم بالٹی مور آ گئے ہیں یہاں ان کا اپنا چھوٹا سا بزنس ہے یہاں انھیں بطور فلمی اداکار بھی کوئی نہیں پہچانتا مگر جب کبھی ہم اپنے ڈراموں کی پرانی تصویریں دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔

❀❀❀

کوئی جگنو ہو

"ہائے اللہ میں مرگئی۔" زویا چیخی۔

"ارے واہ یہ طرم خاں۔" قہقہے کا گولا چھوٹا۔

تصویر ابھی چھوٹی کے ہاتھ میں ہی تھی۔ کہ ذاکیہ اُسے لے اُڑیں اور تبصرے سے پہلے ہی وہ کھی کھی کا دورہ پڑا کہ رُکنے میں نہیں آ رہا تھا۔

"کچھ بکو بھی......" سیمی کو غصہ آنے لگا تھا۔

"بیچارہ بڑا چوٹ کھایا لگ رہا ہے۔ چوٹ بھی ایسی ویسی۔ ہائے بے چارہ پور پور دکھی لگ رہا ہے۔ چہرے پر حزن و ملال کے سارے رنگ ہیں۔ باوجود خضاب لگانے کے چہرے مہرے سے عمر کی حقیقت جھلک ہی رہی ہے۔ چچ چچ۔"

"ہاں پنتالیس اور پچاس کے درمیان ہوگا۔" زویا۔ کندھے اُچکا کر بولی۔ "مائی ڈیر سری لنکا کون جائے جو اس۔ کانے کی دوسری آنکھ لگائی جائے۔ بھئی میری سمجھ میں تو ایک ترکیب آئی ہے۔" نغمی بالوں میں رولر لگاتے ہوئے بڑے رازدارانہ لہجے میں بولیں۔

"اب بتا بھی چکو...... بی بقراطن...... تمہاری بھی سمجھ میں کوئی ترکیب آ سکتی ہے۔" زویا پھر ہنسنے کے لیے پر تولنے لگیں۔

"اے زویا...... لینگویج پلیز...... اپنی چھوٹی سی سری پر۔ اترایا مت کرو۔"

"بھئی پھوٹو بھی۔"

"اس کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دو۔" وہ رولر لگاتے ہوئے آنکھیں چڑھاتے ہوئے بولیں۔

"مگر اس بے چارے کے ساتھ ایسا ظلم کیوں روا رکھا جائے؟"

"صاف بات ہے کانے سیاں کو دیکھ کر غصہ آئے گا کہ کم بخت بھی رہ گیا تھا میاں بننے

کے لیے۔ سارے شہر کے خوبصورت لڑکے گروی ہو گئے تھے کیا؟ جو یہ ملا۔ مگر اندھے کو دیکھ کر غصہ نہیں آئے گا' بلکہ رحم آئے گا۔"

"ہاں بھئی نغمی مان گئے تم کو...... جب رحم آئے گا تو ہمدردی بھی ہوگی۔ تھوڑی سی ہمدردی...... بہت زیادہ ہمدردی میں بدل جائے گی۔ اور بہت زیادہ ہمدردی پیار میں...... واہ بھئی واہ...... کیا نکتہ سوجھا ہے تمہیں۔ مان گئے بھئی تم کو۔"

"نہیں بھئی کانے' اندھے میاں کسی صورت میں نہیں چل سکتے۔" سیمی کو پھر غصہ آنے لگا۔

"اے لڑکی غصہ مت دکھاؤ...... اتنی ڈبلی لڑکیاں غصے میں بالکل ہی مریل سی لگتی ہیں۔ بس بے چارہ کانا ہی تو ہے تو ایسا کرتے ہیں کہ ان لوگوں کا پتہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے آنکھ کے سلسلے میں وصیتی کارڈ پُر کیے ہیں۔" زویا نے تسلی دی۔

"اے عقل کی دشمن کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ آپ محترمائیں وصیتی کارڈز پُر کرنے والوں کے پاس جا کر یہ پوچھیں گی کہ کب چل چلاؤ کا ارادہ ہے؟"

"نہیں بھئی...... اب ایسے بھی باؤلے نہیں ہیں...... ہم تو اُن کی خدمتِ اقدس میں جا کر یہ کہیں گے کہ پلیز صرف ایک آنکھ زندگی میں دے دیں اور ایک آنکھ بعد میں۔" زویا نے ایک آنکھ دبا کر شرارت سے کہا۔

"جی ہاں...... آپ کے کہتے ہی وہ اپنا ڈھیلا نکال کر آپ کی ہتھیلی پر رکھ دیں گے۔ ارے ہوش کے ناخن لو...... تمہاری ایسی کی تیسی کر دیں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ مارے غصے کے۔ تمہارے یہ پھٹے پھٹے دیدے ہی پھوڑ ڈالیں۔"

"ارے دفع کرو اس تصویر کو...... نامراد نے جان عذاب میں ڈال دی۔ ارے کم بخت کی ہمت کیسے ہوئی شادی کے لیے اپلائی کرنے کی۔ غور سے دیکھو شکل سے ہی چور لگ رہا ہے۔"

"ہاں واقعی۔" دبی دبی سی ہنسی پھر فلک شگاف قہقہوں میں بدل گئی۔

"مائی ڈیئر...... سُنا ہے کہ بہت پیسے والا ہے۔ اور پیسے والے میں ہمت بہت ہوتی ہے۔ کہیں بھی اپلائی کر...... سکتا ہے۔"

"مگر شکل...... عمر...... کی کیا کوئی اہمیت نہیں ہوتی؟......" سیمی چیخ کر بولی۔

"ڈیئر کزنز...... شکل تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ ویسے سنا تھا کہ موصوف کی کسی ٹریفک حادثے میں ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔ فی الحال پتھر کی آنکھ لگاتے ہیں۔ مگر کہیں سے۔ ڈونیشن ملا تو دوسری آنکھ لگا دی جائے گی۔ اللہ یہ تصویر دیکھ کر شمو خالہ کیا حشر کریں گی...... نہ صرف تصویر کے پرخچے اُڑتے نظر آئیں گے۔ بلکہ تصویر لانے والے کی بھی خیریت نہیں۔"

شمو خالہ واجبی شکل وصورت کی تھیں۔ مگر خیالات بڑے آرٹسٹک تھے۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ ان کے لیے جتنے رشتے آ رہے تھے وہ سب اوندھے سیدھے ہی سے تھے۔ اور اگر کوئی رشتہ بڑوں کو ڈھنگ کا لگتا تو وہ اس میں سو عیب نکال کر رکھ دیتیں۔

"اللہ بے چاری شمو خالہ کا کیا ہوگا۔" زویا ہر شام ان کے لیے سخت پریشان ہو جاتی۔ خالہ سے سب سے زیادہ دوستی بھی تو اسی کی تھی۔ "آج ہم شمو خالہ کے لیے پریشان ہیں...... کل ہم سب کے لیے وہ بھی پریشان ہوں گی۔" نغمی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"اے...... سرفراز نے تم پر مرنا چھوڑ دیا کیا۔"

"ہشت......" وہ سُرخ ہوگئی۔

"بتاؤ نا...... ہم سب کے لیے کیا آفتیں آنے والی ہیں۔ ارے موٹی عقل والیوں...... سنو اور کان کھول کر سنو...... کہ صرف ہمارے خاندان میں بلکہ زیادہ تر خاندانوں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اور لڑکوں کی کم...... اور جو کم لڑکے ہوتے ہیں وہ بھی باہر بدک جاتے ہیں۔ جس لڑکی کی شادی ہوتی ہے وہ اپنے مرد کو کھونٹے سے گاڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ تو پیدا ہوگا۔"

"تو آپ کے خیال میں ہر مرد اگر چار شادیاں کرے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"بالکل درست...... اگر ہر مرد نہیں، تو کم از کم پیسے والے مردوں کو تو ہر صورت میں چار شادیاں کرنی چاہئیں۔ یہ کیا کہ ایک سے کرلی اور لکیر کے فقیر ہو گئے۔ کم بخت مکان تبدیل کر لیتے ہیں۔ فرنیچر سے دل بھر جائے تو دوسرا لے لیتے ہیں۔ مگر صبح، شام...... برسوں تک ایک ہی بیوی کو دیکھ کر۔ دل نہیں بھرتا۔"

"اگر مرد چار شادیاں کرنے لگیں نا...... تو جو ساٹھ سال میں مرنا ہو تو وہ چالیس سال میں ہی مر جائیں۔" زویا نے دانت پیس کر کہا۔

"نہیں بھئی میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ جس کی جتنی اُوپر والے نے لکھ دی۔ وہ تو ہر حال میں جیے گا۔ ٹی بی کے مریض بیس بیس سال اپنی بیماری میں جھولتے رہتے ہیں۔ اور ذرا بخار میں اچھا بھلا چٹ ہو سکتا ہے۔"

"ایک بیوی ہی اچھے بھلے مرد کا دماغ خراب کر دیتی ہے۔ چار تو اس کو دیوانہ بنا دیں گی اور وہ کپڑے پھاڑ کر باہر چیختا ہوا نکل جائے گا۔" ذاکیہ جل کر بولیں۔

"اے پاگل ہو تم...... یہ جلاپا بعض دفعہ بڑا کامیاب بھی ہوتا ہے...... چاروں بیویاں ایک دوسرے کے مقابلے میں ہر دم چوکس رہیں گی۔ ہر کام فرسٹ کلاس ہوگا۔ اور ہر بیوی اپنا آپ

منوانے کے لیے ہمہ دم کیل کانٹے سے تیار ہوگی۔ روزانہ بیس پچیس سنگھار ہوں گے...... جب کہ ایک بیوی ایک آدھ بچے کے بعد تیار ہونا تو خاک روزانہ منہ دھونا تک چھوڑ دیتی ہے...... شادی کے پہلے سال میاں سے محبت کریں گی۔ اور پھر بچوں میں...... اتنی مست ہو جاتی ہیں کہ نہ صرف شوہر بلکہ اپنے آپ تک کو بھول جاتی ہیں۔ سر جھاڑ، منہ پہاڑ...... میلے حلیے میں جب اپنے میاں سے لڑتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی بیویوں کے جھونٹے پکڑ کر گھر سے نکال دوں کہ تم بحیثیت بیوی فیل ہو چکی ہو...... کسی اچھی سی لڑکی کو موقعہ دو کہ اس شریف انسان کی بیوی بن کر وہ اس کو اچھی طرح اٹینڈ کر سکے۔"

"بس نغمی...... بہت اچھی تقریر کر ڈالی...... یہ بتاؤ کہ تم کسی انسان کی چوتھی بیوی بننا پسند کرو گی؟" زویا نے چھیڑا۔

"ارے سرفراز کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ آج تم پر مر رہا ہے۔ کل کسی اور کی آنکھوں میں ڈوب جائے گا۔"

"سوچوں گی۔" نغمی نے مسکرا کر کہا۔

"ہائے کیسے کیسے لوگ ہیں۔" ذاکیہ نے سر پیٹا۔ "غضب خدا کا چوتھی بیوی بننے کو تیار۔ میں تو بھلے سے گنواری مر جاؤں مگر چوتھی سیڑھی پر کبھی نہ کھڑی ہوں۔"

اور پھر وہی ہوا جس کا کہ خدشہ تھا۔ شمو خالہ نے جب تصویر دیکھی تو سارے گھر میں ہنگامہ مچا دیا۔ "اب میری یہ اوقات کہ بڈھے کھوسٹ سے شادی کروں گی۔ تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ اگر باپ سر پر نہیں ہے تو بے آسرا نہیں ہوں۔ اپنا کماتی ہوں اور کھاتی ہوں۔ اللہ سارے شہر کے لڑکے کہاں غارت ہو گئے۔"

وہ تصویر بڑی ممانی کے پاندان کے پاس اس زور سے پھینک کر گئیں...... کہ کتھے کی چھینٹ تصویر کی صحیح آنکھ پر اس طرح گری کہ موصوف درست آنکھ سے بھی گئے۔ ذاکیہ نے آنکھیں بند کر کے ڈنڈا ہاتھ میں لے کر ان صاحب کے چلنے کی نقل اُتاری تو نانی اماں کو بے تحاشا غصہ آ گیا۔

"شمو تجھے خدا سمجھے۔ تو نے تو میری زندگی ضیق کر کے رکھ دی۔ پہلے یہ بھوت دماغ پر چڑھا تھا کہ ذوق والے بندے سے شادی کرنی ہے۔ نصیر بے چارا کسی ادیب کو بمشکل ڈھونڈ کر لایا۔"

"ڈھونڈ کر کیا لایا بلکہ کسی قہوہ خانے سے پکڑ کر لایا ہوگا۔" ذاکیہ نے زویا سے سرگوشی کی تو شمو خالہ بھی مسکرائے بنا نہیں رہ سکیں۔

"تو اُس ادیب کی مفلسی کھلی...... اور محترمہ یہ فرمانے لگیں...... لمّاں آدمی پیسے والا ہونا چاہیے۔ بلا سے بد ذوق ہو۔ ایسے ذوق کو لے کر کیا کریں جس سے توا بھی گرم نہ ہو۔ اب اچھا خاصا رفیق میاں کا رشتہ آیا ہے تو جانے کیا کیا بنا دیا۔ اے ہے تم کون سی ابلا پری ہو...... جو دوسروں کے لیے باتیں بناتی ہو۔ سوائے زبان کے تمہارے پاس ہے کیا۔ بس وہی کندھوں پر پڑی ہوئی ہے۔ جتنی دل چاہے چلوا لو۔"

"نہیں امّاں اس بڈھے کی تصویر تو فوراً واپس کرواؤ۔ جو آنکھوں کو نہیں بھایا وہ من کو کیا بھائے گا؟"

☆☆☆

"شمو خالہ...... جلدی سے آیئے۔" زویا نے آواز لگائی۔ اور وہ ٹیرس کی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی دومنٹ میں زویا کے پاس تھیں۔ جہاں زویا...... نغمی اور ذاکیہ کیریاں نمک مرچ چھڑک کر اس تیزی سے کھا رہی تھیں۔ جیسے انور رٹول آم کھائے جا رہے ہوں۔ ذرا بھی کھٹاس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے کھاتی جا رہی تھیں۔

ذاکیہ نے سی کیا تو تینوں نے اس کو لعنت دکھائی...... "اے فٹے منہ ہار گئی۔ بڑی چلی تھی مقابلہ کرنے۔" اب جب پوری ڈش بھر کے کیریاں چاروں کھا چکیں تو سب کی حالت غیر تھی۔

"زویا کی بچی تُو نے مجھے آواز کیوں دی؟"

"لو بھئی نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے...... ایک تو اپنے پاس سے کیریاں کھلائیں۔ اور پھر بھی ہم بُرے۔"

"ارے میرے سارے جبڑے تک کھٹاس سے سُن سے ہو گئے اور صرف تمہاری وجہ سے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے خالہ......" ذاکیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ذاکی...... بہت بدتمیز ہوتی جا رہی ہو...... آج کل......" شمو خالہ نے بڑا پن جتایا۔

"ارے میں تو اس وجہ سے کہہ رہی تھی۔ کہ آج شاید رحیم کی آپا' امّاں کے پاس دسویں بار آ رہی ہیں آپ کے لیے' آج آپ کے اندر اتنی کھٹاس اُتر گئی ہے کہ ان کے دانت کھٹے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"واقعی...... رحیم کی آپا آ رہی ہیں۔" وہ بولا کر بولیں۔

"ہاں ہاں میں نے خود سُنا ہے۔ لمّاں فون پر کہہ رہی تھیں کہ وہ آپ کو سمجھانے کی کوشش کریں گی۔"

"بھئی میں تو اپنا کمرہ بند کر کے سو رہی ہوں۔ کوئی مجھے پوچھے تو کہہ دینا کہ بڑی بھابی کی طرف چلی گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ سر جھکائے دوپٹہ منڈھے ان کے پاس بیٹھی رہوں...... اور وہ بار بار میری کمر پر اس طرح ہاتھ پھیرتی ہیں کہ جیسے کمر میں کھجلی ہو رہی ہو۔"

اور پھر وہی ہوا جو شمو خالہ چاہتی تھیں...... رحیم کی آپا تین گھنٹے بیٹھی رہیں۔ مگر خالہ ان کے سامنے نہیں آئیں...... ان کے جانے کے بعد نانی امّاں نے جو بے بھاؤ کی انہیں سُنائیں تو ہم سب بھی کونے کھدروں میں جا چھپے...... بقول ان کے خالہ کو بھڑکانے میں ان کی نواسیوں کا پورا پورا ہاتھ ہے۔ اُلٹے' اوندھے مشورے دینے میں سب ایک سے ایک تھیں۔ سب کے دماغ ساتویں آسمان پر تھے۔

رحیم کسی دفتر میں ملازم تھے۔ سات بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ نانی امّاں کو بے حد پسند تھے۔ اتنا سیدھا سادا لڑکا ملنا آج کے زمانے میں بے حد مشکل ہے۔ بے حد شریف' مجال ہے کہ کسی فعل میں ہو۔ سگریٹ وہ نہیں پیتا۔ پان وہ نہیں کھاتا۔ حد تو یہ ہے کہ موا چائے تک نہیں پیتا۔

"کم بخت کھانا بھی رو پیٹ کر ہی کھاتا ہوگا۔ ساتوں بہنیں اللہ' رسول کے واسطے دیتی ہوں گی جب لقمہ توڑتا ہوگا۔" شمو خالہ جل کر بولیں۔

"اے ہے...... کرے جا بکواس...... کم بخت! اتنا سیدھا نہیں مل سکتا۔ جمعہ ہفتہ کی دفتر کی چھٹی ہوتی ہے۔ ڈھائی بجے روزانہ سیدھا گھر آتا ہے۔" امّاں نے اس کی تصویر سامنے رکھتے ہوئے دلار سے سمجھایا۔

"لمّاں پلیز! میرے سامنے سے یہ تصویر اُٹھالیں۔ پلیز فوراً اُٹھائیں۔"

"اے ہے۔ آدمی کا بچہ ہے۔ کوئی جن بھوت ہے جو تو ڈر رہی ہے۔"

"اماں مجھے اس تصویر کو دیکھ کر اس قدر رحم آ رہا ہے کہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو دوں گی۔"

"دماغ خراب ہے تیرا...... تیرے آگے کٹورہ لیے بھیک مانگ رہا ہے وہ' آئی کہیں سے لاٹ صاحبہ۔"

"ارے امّاں جانی! اس قدر دُکھی۔ معصوم سا لگ رہا ہے۔ دانتوں تلے باریک باریک ہونٹ اتنی سختی سے دبائے ہوئے ہیں کہ بائیں مونچھ تھوڑی سی ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ آنکھیں دیکھ رہی ہیں آپ! لگتا ہے کہ تصویر کھینچنے سے پہلے ساتوں بہنوں نے سُرمے کی سلائی اپنے بھائی کی آنکھوں میں ڈالی ہے۔ کیسی قلوپطرہ سی آنکھیں لگ رہی ہیں۔"

"مجھے تو بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نظر آ رہی ہیں۔" امّاں کا حماقت کا دورہ ختم نہیں ہوا تھا۔

"اور یہ رحیم میاں اپنی بہن شہلا سے کتنے ملتے ہیں۔ آپ ان کی مونچھیں مونڈ دیں۔ اور دوپٹہ اڑا کر دیکھیں بالکل رحیمہ بیگم لگیں گے۔"

"تائی لمّاں ان کی آواز تو بہت باریک ہے لگتا ہے کہ گلے کے سیل بالکل خراب ہو چکے ہیں۔" ذاکیہ نے بڑی ہمت سے اپنی ہنسی حلق میں گھونٹ کر کہا۔

"ہشت ایسے مت کہو۔" شمو خالہ نے ڈانٹا۔ "بھئی...... سات بہنوں کے اکلوتے بھائی میں کچھ کچھ زنانہ پن آ ہی جاتی ہے۔ جب پہلی دفعہ ہمارے ہاں آئے تھے تو شہلا نے میری البم چپکے سے انہیں دکھائی تھی۔ تو کیسے گھبرا کر بولے تھے۔ ہائے اللہ کوئی دیکھ نہ لے اور ہر تصویر پر دیکھ کر ایسے شرما رہے تھے کہ پردے کے پیچھے مجھے اپنی ہنسی روکنی مصیبت ہو گئی تھی۔"

"کم بخت۔ وہ بہت شریف لڑکا ہے۔ ان کے پورے خاندان کو میں جانتی ہوں۔"

"شریف آدمی تو بیوی کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ امّاں۔"

"اے ہے...... تو کیا کہہ رہی ہے۔ ہوش میں بھی ہے یا ہو گیا تیرا دماغ خراب؟"

"لمّاں...... ابّا مرحوم بھی بہت شریف تھے۔ جان عذاب کر دی تھی انہوں نے آپ کی۔ جب تک زندہ رہے آپ کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتے رکھا۔ ان کی شرافت کا تو ایک زمانہ گواہ تھا۔ مگر اس شرافت کی آڑ میں انہوں نے کیا کچھ نہین کیا۔ ہم نے تو ہوش سنبھالتے ہی آپ کو روتے سسکتے دیکھا۔"

"ارے کم بخت اپنے مرے ہوئے باپ کو تو ایسا مت کہہ۔ مت گنہگار کر مجھے۔ وہ جیسے بھی تھے، بہت اچھے تھے...... رحیم کا اور تیرے باپ کا کیا مقابلہ۔ وہ بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ کسی فعل میں نہیں ہے۔ ڈھائی بجے دفتر سے سیدھا آتا ہے۔"

"اُف اماں آپ کو تو سمجھانا بے حد مشکل ہے۔ چلیے میں نے مان لیا کہ حضرت بے حد شریف ہیں۔ اتنے گاڑھے شریف آدمی کو تو سوائے بیوی کے کچھ اور سوجھے گا ہی نہیں...... صبح بیوی...... شام بیوی...... ڈھائی بجے پھر بیوی کے سر پر سوار...... میں تو باز آئی ایسی شادی سے میرے تمام معمولات ٹھپ ہو کر رہ جائیں گے۔ اگر رحیم صاحب تھوڑے سے بدمعاش ہوتے تو چل جاتے۔" شمو خالہ ہونٹ دبا کر مسکرائیں۔

"ارے کم بخت...... ناشکری...... تجھے معلوم ہے کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ لوگ شریف آدمی کو پسند کرتے ہیں اور تجھے بدمعاش آدمی چاہیے۔"

"نانی لمّاں...... پلیز آپ شمو خالہ کی بات کا مطلب نہیں سمجھتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ فل ٹائم شوہر افورڈ نہیں کر سکتیں۔ انہیں ایسا بندہ چاہیے جو ہمہ وقت بیوی کا سایہ بن کر نہ رہے۔ بلکہ

اس کی اپنی بھی باہر کی مصروفیات ہوں۔ اگر وہ ہمہ وقت شوہر گیری دکھائے گا تو بے چاری شمو خالہ کا تو دماغ خراب ہو جائے گا۔ ان کی ساری لائف ڈل ہو کر رہ جائے گی۔ اور وہ بس چیاؤں میاؤں میں گھر کر بنڈل ہو جائیں گی۔ ایک دم بور۔" زویا نے خالہ کی طرف داری اچھی خاصی جتائی۔

"ارے بھاڑ میں جائے شمو اور چولہے میں جاؤ تم سب، سب پاگل ہو۔ ایک دم پاگل۔ اپنوں والی بات تمہاری سمجھ میں تھوڑی آتی ہے۔ ہمارا کیا ہے؟ تھوڑی بہت رہ گئی ہے۔ گزار لیں گے۔ روئے گی ناقدری بعد کو۔ اچھے خاصے رشتوں میں ناک بھوں چڑھانا۔ خُدا کو بھی پسند نہیں۔ جو لوگ اچھے رشتے کسی زعم میں لوٹا دیتے ہیں۔ ان کی بیٹیاں ساری عمر دہلیز پر بیٹھی رہ جاتی ہیں اور پھر پچھتاتی ہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ مگر جب وقت گزر جاتا ہے تو کچھ نہیں ہوتا۔

☆☆☆

رحیم کے مسئلے کو ختم ہوئے ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ رشید ماسٹر کا رشتہ خوب دھوم دھڑکے سے آ گیا۔ اب کے امّاں کے ساتھ ساتھ بڑی بھابی بھی بہت خوش تھیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ایک سوبیس گز کے بنگلے میں رہتے ہیں۔"

"لمّاں یہ ایک سوبیس گز کے بنگلے کب سے کہلانے لگے؟" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"بھئی مجھے کیا پتہ ان کی لمّاں اپنا گھر دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ پورا ایک سوبیس گز کا بنگلہ ہے۔ اگر اس میں ایئر کنڈیشنڈ لگ جائے تو اتنی گرمی نہ لگے۔"

"اور کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ تجسس سے بولی۔

"ارے بڑے اچھے لوگ ہیں۔ ان کا سارا گھر اتنا پیارا سجا ہوا ہے۔"

"وہ کہہ رہی تھیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے گھر میں وی سی آر سے لے کر فریج تک سب سامان ہے۔ بس صرف کار نہیں ہے۔"

"اوہ......!" وہ ہنسی۔ "لمّاں۔ تو آپ مجھے جہیز میں کار دے دیجیے گا۔ اور ان کے بنگلے میں ایک اے سی لگوا دیجیے گا۔"

"اے ہے...... باؤلی ہے تو۔ یہ کار کیا آسمان سے اُترے گی۔ جو میں تجھے دے دوں گی۔ جس طرح متوسط طبقے کی لڑکیاں بیاہی جاتی ہیں۔ بس وہی تھوڑا بہت دے دوں گی۔ اے سی وغیرہ کچھ نہیں ملے گا۔"

"لمّاں آپ گھر میں بیٹھی رہتی ہیں نا۔ اس لیے آپ کو کچھ نہیں معلوم...... آپ نہیں جانتیں

کہ متوسط طبقے کی لڑکیاں امراء کے طبقے سے زیادہ دھوم دھام سے بیاہی جاتی ہیں۔ بے چارے غریب تو کچھ دیتے ہی نہیں۔ اور امیر اپنی حیثیت سے کم دیتے ہیں۔ اور یہ مڈل کلاس جو نہ نیچے ہوتا ہے اور نہ اوپر وہ شادی بیاہ میں بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ میں نے سینکڑوں ایسے خاندان دیکھے ہیں جو مقروض ہو کر شادی کرتے ہیں۔ مگر اس شان سے کہ کیا بتاؤں۔ مہندی سے جو مووی بنتی ہے وہ چوتھی چالوں تک چلتی ہے اور مہندیاں اتنی زور دار کہ کیا آج سے دس پندرہ سال پہلے شادیوں میں رونق ہوگی۔ جو کہ آج کی مہندیوں میں ہوتی ہے۔ آپ نے آج سے بیس سال پہلے بڑے بھائی کی بری اور ولیمے پر پانچ ہزار روپے بھی خرچ نہ کیے ہوں گے۔ اب دو ہزار میں تو صرف مہندی تھالوں میں سج کر آتی ہے اور تین ہزار میں صرف دلہن کا میک اپ ہوتا ہے......
آپ کہاں کی باتیں کر رہی ہیں۔ آج کی دنیا کو دیکھیے' سوچیے اور پھر سمجھیے۔ رشید ماسٹر کا رشتہ میرے لیے صرف اس وجہ سے آیا ہے کہ میں بھی سروس کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔ یہ ماسٹر طبقہ ہمیشہ کماؤ بیوی کو پسند کرتا ہے۔ اور زیادہ جہیز کا طلب گار بھی ہوتا ہے۔''

''اے ہے...... تو مت کرنا' نوکری...... جوتے مار کر...... تو کروانے سے رہا بس تو مجھے یہ بتا کہ رشید ماسٹر کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟''

''بہت بُرا......'' وہ ذاکیہ کے ہاتھ پر کون سے مہندی لگاتے ہوئے بولیں۔

''ارے ایک ماں کے سوا اس کا آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے اور ماں بھی رات دن کی بیمار کہ اب ٹلی کہ تب ٹلی۔ آج کل کی لڑکیاں تو ایسے لڑکوں کو بہت پسند کرتی ہیں کہ جہاں سُسرال کا جھنجٹ نہ ہو۔ اب خدا نے گھر بیٹھے ایسا شاندار رشتہ بھیجا ہے۔ تو کاہے کو بھری تھالی پر لات مار رہی ہے۔''

''اماں جانی...... پلیز...... آپ کم از کم ایسی سطحی باتیں مجھ سے نہ کیا کریں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں عام لڑکیوں کی طرح نہیں سوچتی۔ اکیلا تنہا لڑکا۔ جس کے کوئی آگے پیچھے نہ ہو چاہے وہ کس قدر حسین' ذہین اور ریزن ایبل پوسٹ پر فائز ہو۔ میں اس سے ہرگز شادی نہ کروں اور لڑکیوں کا کیا ہے۔ وہ اگر اکیلے لڑکے کو اپنی پسند میں اوّلیت دیتی ہیں تو اس کی وجہ سُسرال کے مصائب ہیں جن سے وہ گھبراتی ہیں۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر یتیم خانے والے اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں اور وہ اچھے عہدوں پر فائز ہو جائیں تو شہر بھر کی لڑکیاں پہلے وہاں لپکیں جن کے آگے پیچھے تو کیا دور دور تک سسرال کا کوئی نشانہ ہو مگر میں ان جیسی نہیں ہوں۔

☆☆☆

نانی لمّاں نے بھی جل کر شمو خالہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ جو ان کا دل چاہتا وہ

کرتیں۔ چھوٹی بھابی کو بھی ان کے دم سے کافی آرام تھا۔ چھوٹے بچوں کو نہلانا دُھلانا...... وہ از خود سنبھال لیتی تھیں۔ اور صفائی کا تو انہیں بے حد شوق تھا۔ شمو خالہ کے دم سے گھر آئینے کی طرح چمکتا تھا۔ اگر کبھی وہ دو چار دن کے لیے بڑی بھابی کے ہاں چلی جاتیں۔ تو چھوٹی بھابی کے گھر کا نظام تہس نہس ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ شمو خالہ کی شادی کے سلسلے میں کبھی چھوٹی بھابی نے دلچسپی نہیں لی تھی۔ ہاں ایک بڑی بھاوج تھیں۔ جن کے دل میں وقتاً فوقتاً اُبال اٹھتا رہتا تھا۔ یا لمّاں بی تھیں جو ان کے وطیروں کو دیکھ کر ہول کھایا کرتی تھیں۔ ایسی منہ پھٹ لڑکی کا بھلا کہیں گزارہ ہو سکتا ہے۔ کہیں نہیں...... جب ہی اس کی شادی نہیں ہو پا رہی۔ شاید خُدا کی یہی مرضی ہے۔ یہی مصلحت ہے۔ اسی میں اس کا بھلا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خود ہی تسلی دے کر مطمئن ہونے کی کوشش کرتیں۔ مگر ماں کا دل بھی کبھی مطمئن ہوا ہے۔ وہ ہمہ وقت شمو خالہ کے لیے کُوھا کرتیں۔

''پتہ نہیں کم بخت کس پر چلی گئی...... اپنے ٹھور ٹھکانے سے لگ جاتی تو بہتر تھا۔ یہ منحوس تو مجھے قبر میں بھی بے کل رکھے گی۔''

لاکھ بہوؤں اور بیٹیوں نے شمو خالہ کے سلسلے میں لمّاں کو کافی تسلیاں دے کر بہلا رکھا تھا۔ کہ جیسے ہی اچھا لڑکا ملا۔ وہ شادی کرنے میں کوئی تاویل نہیں دیں گی۔ مگر یہاں تو مسئلہ ہی ٹیڑھا تھا جو شمو خالہ کی صورت میں تھا۔

بڑی آپا کسی فلائٹ انجینئر کا رشتہ لائیں مگر لڑکے کی ماں کو شمو خالہ پسند نہیں آئیں۔ ''لڑکی موٹی بہت ہے۔'' لڑکے کی ماں جاہل قسم کی عورت تھیں۔ یہ بات انہوں نے شمو خالہ کے کمرے سے نکلتے ہی کہہ دی۔

''آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کی چاروں بیاہی بیٹیاں آپ کے گھر کے قریب ہی رہتی ہیں؟'' زویا نے...... پھر کر پوچھا۔

''ہاں ماشاءاللہ سب قریب ہیں۔ بیٹیاں اور ان کے بچے روز ہی آتے رہتے ہیں۔'' بڑی بی نے بہت خوش ہو کر بتایا۔

''پھر تو آپ اپنی بہو بے حد موٹی سی لائیے گا۔'' زویا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''اے واہ۔ میں کیوں موٹی لاؤں۔ میرے بیٹے کی واحد خواہش یہ ہے کہ لڑکی دبلی پتلی سی ہو۔''

''سنیے۔ جب آپ کی چاروں بیٹیاں اپنی فوجوں سمیت بھائی کے گھر پر روز دھاوا بولیں گی۔ تو بے چاری بہو ان سب کی ماما گیری کرتے کرتے خود ہی دُبلی ہو جائے گی۔ اگر آپ پہلے ہی دبلی لے آئیں تو کیا اس کو ٹیں کر کے دم لیں گی۔''

ان کی بڑی بیٹی جو خاصی چلتر تھی۔ زویا کی بات سُن کر چیخ کر بولی۔ ''اے واہ...... ٹیس ہوتی ہے تو ہو جائے۔ جیوے میرا بھائی گلی گلی بھر جائی۔''

''خاتون تو آپ غلط گھر میں آئیں۔ گلی گلی اور ٹکے ٹکے کا مال یہاں دستیاب نہیں ہے۔ کسی منڈی میں جا کر پسند کریں۔ یہاں تو بہت پیاری عادتوں والی ایک لڑکی ہے۔ جس کا دل محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ جس کے ہاتھ ہنر میں یکتا ہیں اور جس کے خواب بہت گمبھیر ہیں۔ سوری آپ غلط گھر میں آئیں۔ ویسے بھی دھیرے دھیرے آشاؤں کی کلیاں چُننے والی لڑکی کا فلائٹ انجینئر کے ساتھ گزارہ نہیں۔''

زویا کی بات کا بڑی بی نے خاصا بُرا مانا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور احساسِ برتری سے لتھڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''اے بیٹی جہاز کے انجینئر کا نام سن کر تو لڑکیاں دیوانی ہو جاتی ہیں۔ تم کبھی جہاز میں نہیں بیٹھی ہو گی...... تمہیں کیا پتہ آج کل ڈاکٹروں سے زیادہ فلائٹ انجینئرز کی مانگ ہے۔''

''ارے خالہ جان! جہاز میں تو وہ بیٹھے جسے اپنی جان پیاری نہ ہو۔ آپ بتایئے جب جہاز بلندی پر ہوتا ہے تو چاند تک نیچے ہو جاتا ہے اس سے وہ اگر گر جائے تو کفن میں سُرمہ ہی ڈل سکے گا...... جب کہ ریل گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں سر دھڑ تو مل ہی جاتے ہیں اور ہم لوگوں نے کبھی فلائٹ انجینئر کا بھاؤ معلوم نہیں کیا۔''

''اے بی...... جب مرنا ہی ٹھہرا تو سرمہ بنے یا ہڈیاں کٹیں۔ مگر کبھی زمین' آسمان برابر نہیں ہوتے۔''

''ارے میں نے تو زمین آسمان ہمیشہ برابر دیکھے ہیں۔ کہیں ایسا نہیں ہوا کہ زمین ختم ہو گئی ہو اور آسمان کا...... سلسلہ دراز ہو۔'' مگر بڑی بی زویا کی بات سُنے بغیر اپنی گاڑی میں زن سے ہوا ہو گئیں۔ بڑی آپا...... یہ رشتہ لا کر خواہ مخواہ چور ہو رہی تھیں۔ اور لتاں پر ایک چُپ ساکت تھی جب کہ شمو خالہ کی ہنسی کسی طرح رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔

''یار...... زویا...... بہت اچھا بولی۔ مگر یار ذرا مارکیٹ جا کر فلائٹ انجینئر کی گرانی کا اندازہ تو کر کے آتے ہیں جس پر بڑی بی ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ رہی تھیں۔

دبلی لڑکی چاہیے...... دبلی لڑکی بھی کوئی لڑکی ہوتی ہے۔ اونہہ موئی ہڈیوں کی مالا۔ نہ کوئی کپڑا سجے اور نہ ہی دُکھ بیماری برت سکے۔ کم از کم اتنی صحت تو ہو ایک دو بیماریاں اپنا تن برداشت کر سکے۔ سوکھی' مدقوق سی لڑکیوں سے تو مجھے چڑ ہے۔ انتہائی بدذوق سی ہوتی ہیں...... کتنا ہی رسیلا لطیفہ سنا دو مجال ہے کہ لبوں پر مسکراہٹ آ جائے۔ جب کہ موٹی تازی لڑکیاں بے انتہا شگفتہ مزاج

کی ہوتی ہیں۔ اعلیٰ ظرف کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ زندگی کو انجوائے کرنا آتا ہے۔ لوگوں سے میل جول کے طریقے ان کے بے انتہا اچھے ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ ان کی گفتگو کا آغاز اور انجام قہقہے سے ہوتا ہے۔ ایمان سے موٹی عورت اگر ہنستے ہوئے اپنے وجود کو ہلنے سے روک لے تو اتنی خوبصورت لگے کہ تمام کائنات کی خوبصورتی اس کے آگے ہیچ ہے۔''

شمو خالہ کی بات سُن کر نانی اماں کا معصوم چہرہ بھی مسکرا اُٹھا۔ بڑی بھابی تو اتنا ہنسیں کہ اُف خدایا۔ وہ تو ہنس کر چپ ہو گئیں۔ مگر اُن کا تھل تھل کرتا وجود بعد میں بھی پانچ منٹ تک ہنستا رہا۔

''واہ شمو خالہ کیا بات کرتی ہیں۔ موٹے لوگ قہقہہ بعد میں لگاتے ہیں۔ مگر اُن کا وجود پہلے ہی ہلنے لگتا ہے۔ جو کہ بعد میں بھی بہت مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ یاد ہے کہ بڑی تائی جب ہنستی تھیں تو ان کی دونوں بھاوجیں ان کے قل قل کرتے وجود کو کیسے سنبھالا دیا کرتی تھیں۔ کتنا ہانپ جایا کرتی تھیں کہ لطیفہ سُنانے والا بھی چور سا ہو جاتا تھا اور آنکھ بچا کر گھر کی راہ لیتا تھا۔''

''بے چارہ ڈر کر بھاگتا ہو گا کہ کہیں یہ لوگ مار نہ دیں۔'' سیمی ہونٹ دبا کر ہنسیں۔

''شمو خالہ! میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ بہت ہی شاندار قسم کی۔ ایمان سے داد دیں گی آپ۔'' زویا نے کہا۔

''بکو بھی۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''ارے سب ہمہ تن گوش ہو جایئے...... اور خاص طور پر پورے شہر کی لڑکیوں کی مائیں سن لیں۔'' وہ میز پر کھڑی ہو گئی۔

''یار۔ بول بھی چُک...... کرے گی۔ اب کوئی فالتو بات'' سیمی اس کو اس قدر پُرجوش دیکھ کر بور ہو کر بولی۔

''چپ کر سوکھی۔ ورنہ تیری رجسٹریشن نہیں کروں گی۔ روتی پھرے گی میرے پیچھے۔'' اس نے میز پر سے ہی اس کو مکا دکھایا۔

''ہاں بھئی سنیے۔ دل تھام کر سنیے۔ جیسا کہ آپ لوگ اخبار میں پڑھتے ہوں گے کہ اب سرمائے میں شراکت کے سوا کوئی کاروبار نہیں رہا۔ اب تو قسطوں پر پورا جہیز بلکہ قربانی کے بکرے تک دستیاب ہیں۔ لہٰذا میں ایک ایسی کمپنی کھول رہی ہوں جو قسطوں پر لڑکے فراہم کرے گی۔''

''ہٹ باؤلی۔ لڑکے اور بکرے میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ تیرا کوئی فارم ہے۔ وہاں لڑکے اُگ رہے ہیں۔ جن کو تو بیچے گی۔'' شمو خالہ نے پُرزور تردید کی۔

''اوہ...... تو...... آپ لوگ سمجھے ہی نہیں۔ ہماری کمپنی شہر کے مختلف یتیم خانوں سے لڑکے

لے گی۔ اُن کو پڑھائے گی۔ اچھا ہنر مند شہری بنائے گی۔ اور پھر ہم ان لڑکوں کی شادیاں کریں گے۔"

"اتنا کہاں سے پیسہ آئے گا کہ آپ ان کو پڑھائیں گی، لکھائیں گی۔ بے وقوف اس کے لیے روکڑا چاہیے اور وہ بھی بہت سارا۔"

"مائی ڈیر خالہ جان! یہ کمپنی کھولنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگ اس کے ممبر بنیں۔ اپنا آرڈر بک کروائیں پہلے پیسہ دیں۔ بعد میں مال اُٹھائیں۔"

"بھئی میں تو تجھے دوسو روپے مہینہ دے سکتی ہوں۔" ذاکیہ ہنس کر بولی۔

"ٹھیک ہے تجھے ایک جاہل، بے روزگار دے دیں گے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"بکواس میں کر رہی ہوں یا تُو...... دوسو روپے میں تجھے ڈاکٹر چاہیے کیا؟"

"زویا...... مجھے تو اچھا سا ٹی وی کا ہیرو چاہیے۔ پیسہ دینے کے بعد بارہ گھنٹوں کے اندر ڈلیوری ہو...... تا کہ جلد ہی نکاح کر لیں۔" سیمی ہونٹ دبا کر شرارت سے بولی۔

"دیکھو بھئی شروع میں جب یہ سلسلہ چلے گا تو ڈلیوری اتنی جلدی نہیں ہو سکتی۔ مگر جب کاروبار بڑھے گا اور پڑھے لکھے...... باشعور شہری اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرانے۔ ہمارے پاس آنے لگیں گے تو ڈلیوری جلد بھی ہو سکتی ہے۔ قسطوں پر دولہے حاصل کرنے کا بے حد آسان اور منفعت بخش کاروبار ہوگا یہ۔"

"لے پانچ سو روپے کی پہلی قسط...... پچیس سال بعد ایک پڑھا لکھا شریف بندہ چاہیے۔ اب بتا کہ وہ مجھ بڑھیا سے شادی کر سکے گا۔"

"بھئی شادی نہیں کرے گا۔ تو تجھ بڑھیا کی کفالت کی ذمہ داری تو اُٹھا لے گا...... اور اگر اس اثناء میں تیری کہیں شادی ہوگئی تو...... تو اپنی کمیٹی آگے کسی اور کو بیچ دینا۔"

"ہاں بھئی۔ بس اب یہی کسر رہ گئی ہے۔" اماں سب کی ہنسی مذاق کی باتوں کو سن کر بھی پھر سنجیدہ ہوگئیں۔

"ارے نانی اماں۔ آپ تو ہمیشہ۔ سیریس ہو جاتی ہیں۔ آپ کو پتا ہے زویا کی بات گدھے کی لات کی طرح بیکار ہوتی ہے۔"

سیمی شرارت سے بولی۔

"سیمی...... لینگویج پلیز...... یہ میرے اقوالِ عالیشان۔ تجھے گدھے کی لات نظر آ رہے ہیں۔ ذرا اس وقت سے جب میری کمپنی خوب دُھوم دھڑکے سے چل رہی ہوگی۔ اخبارات اس

کے اشتہارات سے بھرے پڑے ہوں گے۔ اور تُو میرے آگے ہاتھ جوڑ کر گھگھیائے گی، تو میں لفٹ بھی نہیں کراؤں گی۔" زویا دانت پیس کر بولی۔

"ارے طوطا چشم تو...... تُو ہمیشہ سے ہی ہے۔ مجھے گھگھیانے کی کوئی ضرورت نہیں...... تیری یہ اینگی بینگی کمپنی چلے گی ہی کب۔"

"لڑکیوں!...... زویا کی کمپنی کو گولی مارو جس نے میرے ساتھ سفاری پارک چلنا ہے چلو۔" شمو خالہ نے دھماکہ کیا۔

یہ شمو خالہ کی ادائے خاص تھی کہ ان کو جس چیز کا جنون چڑھ جاتا، وہ ہر قیمت پر پورا کیے بنا نہیں رہتی تھیں۔ کسی زمانے میں فلاور میکنگ کا کورس کیا تو سارے گھر کو از سر نو ترتیب دے ڈالا۔ گھر میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ کھانا پکانے کا شوق چرایا تو مختلف ڈشز پکاتی رہتیں اور ساری بھانجیاں...... شمو خالہ کے ساتھ اپنے اپنے چٹخارے پورے کیا کرتیں...... زویا کو سوئیٹ ڈشز کا شوق تھا۔ وہ خالہ کو چڑھا کر ان سے خوب لذیز کیک بنواتی...... اور مزے سے سارا دن ٹونگتی پھرتی...... سیمی اور ذاکیہ چٹ پٹے...... کھانوں کی دلدادہ تھیں...... وہ شمو خالہ کو مزید بانس پر چڑھا دیتیں۔ اور خالہ اپنی بھانجیوں کی تعریفوں میں مست ہو کر خوب کھانے پکاتی چلی جاتیں...... اور پوری لڑکیوں کے عیش ہو جاتے۔

آج کل گھومنے کا سودا سمایا تھا...... تو پوری لڑکیوں کی فوج سمیت کراچی کا چپہ چپہ دیکھا جا رہا تھا۔

"اللہ شمو خالہ...... یہ سفاری پارک بھی کوئی گھومنے کی جگہ ہے، یہ تو بچھڑے ہوئے بھاگے ہوئے اور ترسے ہوئے لوگوں کی ملن کی جگہ ہے۔ مجھے تو اس ریت کے صحرا میں جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ کہ خواہ مخواہ چڑھائی چڑھتے جائیں۔" زویا نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"او کے...... تُو...... تو واقعی ڈل قسم کی لڑکی ہے۔ تُو کیا جانے انجوائے منٹ کیا ہوتی ہے۔ باؤلی ہم ایسے لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں...... یاد ہے پچھلی دفعہ ایک جوڑے کو دیکھا تھا۔ وہ صاحبہ۔ اپنی زلفیں اس منحنچو قسم کے انسان کے بازوؤں پر پھیلائے کوئی گیت گا رہی تھیں۔ اکثر لوگ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے چور نظروں سے ان کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ بندہ صورت حال دیکھ کر اچھا۔ خاصا نروس ہو گیا تھا۔ مگر وہ صاحبہ بڑی ہٹ دھرم تھیں۔ مجال ہے کہ ذرا شرمائی ہوں۔ گھبرائی ہوں۔"

"مجھے تو کوئی نفسیاتی مریضہ لگ رہی تھی۔" زویا جل کر بولی۔

"ارے۔ ایسے ہی ابنارمل لوگوں کو دیکھ کر سیمی کو لکھنے کے لیے خاصا مواد ملتا ہے؟"

''ہاں...... ہاں...... پچھلا سارا افسانہ...... بوہری بازار میں جا کر ہو گیا تھا۔ ایک ناولٹ ٹھیلے پر چاٹ کھاتے ہوئے ہو گیا تھا' جب کہ ہماری پلیٹوں کے پیسے بھی وہ اسکوٹر والا ہیرو دے گیا تھا۔ اور ایک افسانہ درزی کی دکان پر ناپ دینے والی خواتین کے تاثرات دیکھ کر ہو گیا تھا اور سیمی کا ایک افسانہ اس وقت ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ جب ایک صاحب نے اپنی بیگم سمجھ کر نغمی کا پیچھے سے کندھا ہلا کر کہا تھا۔ ''جان اب بس بھی کرو شاپنگ۔'' اس سے پہلے کہ نغمی مڑ کر ان کی اس استدعا کا جواب دیتیں۔ ان کی بیگم دُور سے دہاڑ کر بولیں۔ ''ارے بے وقوف...... میں ادھر ہوں......'' بے چاری نغمی غصّے سے سُرخ پڑ گئی تھی۔''

''تم لوگ خواہ کتنی ہی بکواس کر لو۔ میں ایک لفظ نہیں بولوں گی۔ اس وقت میرا ہیرو...... اپنی ہیروئن سے خاصی رنگین مکالمے بازی کر رہا ہے۔''

''ہائے کیا کہہ رہا ہے مجھے بھی سُناؤ۔'' نغمی چہکی۔

''ہشت...... کسی کے پرائیویٹ معاملات میں دخل نہیں دیتے۔'' سیمی نے ڈانٹا۔

''ہائے کم بخت...... اپنا ہیرو...... پتہ نہیں کہاں مرا بیٹھا ہے۔'' ذاکیہ جل کر بولی۔

''ارے تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارا بے وقوف تو زیادہ سے زیادہ پاپوش نگر میں اپنی پھوپھو کی لڑکیوں کو کمپنی دے رہا ہوگا۔ وہی بے مہار باتیں...... اونچے اونچے قہقہے اور شو بازی میں خوب آئس کریم منگوا رہا ہوگا۔ شادی کے بعد اس کا پرس بھی اپنے بیگ میں رکھا کرنا۔ بہت ہی پیسے خرچ کرتا ہے۔''

''ارے اس کا بس چلے تو ابھی سے رکھنا شروع کر دے۔'' نغمی نے چھیڑا۔

''اللہ کس قدر بکواس کرتی ہو تم لوگ۔'' ذاکیہ جل کر رہ گئی۔

''اے لڑکی...... بکواس بھی ان کے بارے میں ہوتی ہے جہاں کوئی بات تو ہو...... ہم سے پوچھو...... کہ ہمارا والا تو ابھی نظر آیا ہی نہیں۔'' زویا نے روہانسی ہونے کی اداکاری کی۔

''بھئی اس معاملے میں ''تُو نہ بولا کر۔ تیرا کیا ہے ''تُو اپنی کمپنی میں ہی سے کسی کو فٹ کر لے گی۔''

''ہمارا کیا ہوگا؟'' شمو خالہ بھی مسکرا کر میدان میں آ گئیں۔

''خالہ جان...... آپ بُرا مت مانیے گا۔ ایک تو اچھے رشتے آپ کے لیے آتے نہیں...... ور جو آتے ہیں۔ ان کو آپ لوٹا دیتی ہیں۔ ہمارے ہاں یہی تو ایک بڑا المیہ ہے کہ ہم لوگ اشکرے بہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نہ شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے کسی وسیلے کو بہتر

سمجھتے ہیں۔'' زویا نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

''زویا...... میں نے اپنی زندگی میں اتنے کڑوے سچ دیکھے ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ ابّا میاں کے مظالم۔ امّاں کا سسکنا تڑپنا...... سب میرُے شعور کی بھٹی میں تپ کر میرا ذہن خاکستر کر گیا ہے۔ بڑے ماموں' بڑے چچا' پھوپھا میاں سب نے عورتوں کو پیر کی جوتی سمجھ کر رکھا۔ عورت کی انا خودداری کو چور چور کر کے رکھ دیا۔ مجھ میں نہ اتنا ظرف ہے اور نہ ہی اتنا صبر کہ کسی ایسے شخص کو برداشت کر سکوں۔'' شمو خالہ نے اتنے دُکھ سے کہا کہ ہم سب ساکت سے رہ گئے۔ ہنستی کھلکھلاتی...... شمو خالہ...... اندر سے اتنی حساس بھی ہو سکتی تھیں یہ ہم لوگ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

نغمی کی شادی خوب دھوم سے ہوئی اور سیمی کی افراتفری میں...... ان دنوں شہر کے حالات بہت ہی دگرگوں تھے...... اور جب زویا بھی پیا دیس جانے کے لیے پر تولنے لگیں تو امّاں...... شمو خالہ کو دیکھ کر شدید بیمار پڑ گئیں۔

''ارے اس کے سامنے کی بھانجیاں اپنے گھروں میں آباد ہو گئیں...... اور یہ شمو یونہی ناٹھی نگوری سی بیٹھی ہے۔''

زویا کی شادی کیا ہوئی کہ سارا گھر سنسان سا ہو کر رہ گیا۔ اس کے ہنستے رسیلے قہقہے سارے گھر میں رونق بپا کیے رہتے تھے۔ شمو خالہ جو اس کے وجود کی اتنی عادی تھیں۔ اس کے بنا بکل سی ہو گئیں۔

''یار...... ذاکی...... زویا کی شادی کے بعد اس گھر میں کتنی ویرانی سی ہو گئی ہے۔''

''آپ کی ہو جائے گی تو گھر کی رہی سہی جو رونق ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔'' ذاکیہ نے ہنس کر کہا۔

''پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم زویا والی کمپنی کھول لینا۔ اگر تمہاری پہلے ہو گئی تو میں کھول لوں گی۔'' شمو خالہ دل کھول کر ہنسیں اور ہنستے ہنستے جو نظر پڑی تو زویا کو آتے دیکھ کر خوشی سے کھل گئیں۔ دونوں بھاگ کر اس کے پاس پہنچیں...... آج وہ بہت دنوں بعد آئی تھی۔

''یار...... بڑا زبردست پرفیوم لگایا ہے۔'' ذاکی گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''اور لگ بھی بہت خوبصورت رہی ہو۔'' شمو خالہ نے تعریف کی۔

''واقعی......؟'' زویا جھینپ کر مسکرا دی۔

''شادی کے بعد کیسا لگ رہا ہے؟'' ذاکیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"فرسٹ کلاس۔ بہت ہی پیارا بندہ ملا ہے...... جس کا کام سوائے میری تعریف کرنے کے کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ بس ہر وقت پیار اور محبت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ چاند، چاندنی اور پھول ان کے خاص موضوعات ہیں۔"

"زویا...... زندگی...... صرف چاند، چاندنی اور پھولوں کا نام نہیں ہے۔ دل کے ساتھ ساتھ، عقل کی آنکھ بھی کھول کر رکھ...... ورنہ تیرا یہ بندہ جب جذبوں کے گورکھ دھندوں سے آزاد ہوگا تو بڑا روکھا ہو جائیگا تب تجھ سے نہ نگلا جائے گا اور نہ اُگلا جائے گا۔ اس لیے شروع سے ہی توازن رکھ۔"

"ارے شمو خالہ...... آپ یہ کس ذاتِ شریف کو سمجھانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ آخر اس نے نفسیات کس لیے پڑھی ہے۔ اس نے سارے ہی پھندے ایک ساتھ اس باؤلے کے گلے میں ڈال دیے ہوں گے۔ وہ بے چارہ آزاد ہوگیا تب نا۔ یہ ذلیل اس کو ہمیشہ ہی جذبوں کی جلترنگ میں قید رکھے گی۔ آپ اس کو نجانے کیوں بے وقوف سمجھتی ہیں۔" ذاکیہ نے ہنس کر کہا۔

اور زویا پھر جھینپ گئی۔

"اے...... یہ تم بار بار شرما کیوں رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔ اس وقت تم اُن کے پاس نہیں...... بلکہ ہمارے پاس بیٹھی ہو کچھ بولو نا۔"

"اللہ خالہ جان...... اب میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ آج کل مجھے بولنے کی بالکل عادت نہیں رہی۔"

"اے بھئی...... یہ کیونکر ہوا...... تم تو رات کو سوتے میں بھی بڑبڑاتی تھیں اور جب بڑبڑاہٹ ختم ہوتی تھی تو اس قدر خوفناک خراٹے لیتی تھیں۔ جب ہی تمہارے شناختی کارڈ میں شناختی علامت خراٹے لینا لکھوایا تھا۔" ذاکیہ نے پھر چھیڑا۔

"کیے جا بکواس...... کمینی...... جب تیرا وقت آئے گا۔ تب پوچھوں گی۔ فی الحال تو مابدولت صرف پیار کی رِم جھم سنتے ہیں۔"

"اے خدا کی بندی۔ کچھ تو ہوش کر۔ کہیں یہ رم جھم بعد کو اُٹھا پٹخ میں تبدیل نہ ہو جائے۔" ذاکیہ نے پھر جملہ مارا۔

"اس وقت میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تیری باتوں کا جواب دوں۔ ذاکی اور شمو خالہ آج تو میں ایک خاص مقصد کے لیے نانی لماں کے پاس آئی ہوں۔" زویا ان دونوں کو شرارت سے دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی۔

زویا کے جیٹھ حارث کا رشتہ...... شمو خالہ کے لیے سب کو بے حد پسند آیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ،

اعلیٰ عہدے پر فائز، پُرکشش شخصیت اور پھر شمو خالہ کا طلب گار۔ واقعی زویا نے دوستی کا رشتہ نبھا دیا تھا۔ اب کے لماں نے شمو خالہ سے کچھ پوچھے بنا ہی بڑے ٹرنک کے کپڑوں کو دھوپ لگانی شروع کر دی تھی۔

اور پھر شمو خالہ بھی اس دفعہ کچھ چُپ چُپ سی تھیں۔ کسی معاملے میں کچھ بھی نہیں بول رہی تھیں۔ حارث کو بڑے بھائی نے بطور خاص کھانے پر بُلایا۔ تو سب اس کی شگفتہ گفتگو کے مزید شیدائی بن گئے۔ یہ سُن کر سب بے حد خوش ہوئے کہ انہوں نے شمو خالہ کو سب سے پہلے زویا کی مہندی پر ستار بجاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اب زندگی بھر ستار سنیں گے تو صرف انہی محترمہ سے۔

ان کے جانے کے بعد ذاکی نے شمو خالہ کو خوب چھیڑا۔ "خالہ جانی آپ اپنے جہیز میں صرف ستار لے کر جائیے گا۔ صبح وہ ناشتہ مانگیں تو آپ ستار کی ٹن ٹن بجا دیا کیجیے گا۔ وہ بے چارے بھوکے دفتر چلے جائیں گے۔ رات کو آ کر کھانا مانگیں تو پھر ستار کی ٹن ٹن بجا دی...... وہ چپ چپ سو جایا کریں گے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ میری ساری شخصیت بس کیا ایک ٹن ٹن میں ڈھل گئی ہے؟ وہ چیخیں تو میں ڈھولکی بجا دوں۔ گھبرائیں تو ناچ کر دکھا دوں۔ ورنہ ہمہ وقت ٹن ٹن کرتی رہوں۔"

"اے ہے کیا ہوگیا...... کیسی چیخا چاخی ہو رہی ہے۔ اری شمو...... کیوں کلیجہ جلا رہی ہے میرا...... اب کیا ہوگیا؟" لماں نے ان کی تیز آواز سن کر بولا کر اپنے کمرے سے پوچھا۔

ذاکیہ نے گھبرا کر...... خالہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "پلیز خالہ جان چُپ ہو جائیے۔ نانی لماں۔ کچھ نہیں ہوا ہم لوگ آپس میں مذاق کر رہے تھے۔ آپ سے کچھ نہیں کہہ رہے۔" ذاکیہ نے وہیں سے چیخ کر نانی کو تسلی دی۔

مگر جب بولنے پر آتی تھیں تو ان کو چپ کرانا خاصا وقت طلب کام ہوتا تھا۔ "اے ہے۔ اب بھی کچھ کہہ لو اُبلا پڑی...... خدا کی نعمتوں کی اور ناشکری کر لو۔ وہ تو اتنا رحیم کریم ہے کہ اپنے ناشکرے بندوں کا بھی اتنا خیال رکھتا ہے...... ان کی آہ و زاریاں سنتا ہے۔ ان کی دل داریاں کرتا ہے۔ مگر ہم اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں کرتے۔"

شمو خالہ کی شادی چونکہ جلدی ہونی تھی۔ اس لیے ان کی منگنی انتہائی سادگی سے ہوئی۔ مگر اس کے باوجود حارث بڑے خوبصورت کنگن بنوا کر لائے تھے۔ حالانکہ اُس کی ماں اور بیاہی بہن سب بے حد خاموش سی تھیں۔ حالانکہ ہنس رہی تھیں مگر یوں لگ رہا تھا کہ یہ ہنسی زبردستی کی ہو۔ مسکراتے چہروں کا حُسن ماند سا تھا۔

"اے سنو...... لڑکا...... گیا ہاتھ سے' ماں' بہنیں ابھی سے آزردہ ہیں۔" نغمی نے مٹک کر سرگوشی کی۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔" زویا نے چپکے سے بتایا۔

"پھر کیا بات ہے؟ جلدی سے بتاؤ؟"

"اس وقت چپ رہ۔ بعد میں بتاؤں گی۔"

اور جب بعد میں اس نے بتایا تو سب اور خوش ہو گئے۔ حارث نے اپنے گھر میں کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ نہیں رہیں گے۔ بلکہ وہ اپنی زندگی کا نیا باب اپنے نئے گھر میں شروع کریں گے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جوائنٹ فیملی سسٹم مہکتی کلیوں کو بھسم کر دیتا ہے۔

"خالہ...... آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ اپنے گھر میں حارث خالو کے ساتھ راج کریں گی۔ یہ سسرال بازی سے تو آپ کو نجات ملے گی۔ ورنہ ہوتا کیا ہے کہ میاں دفتر سے بیوی کے پاس پہنچا نہیں کہ اماں جان اپنی محبت مٹھارنے کے لیے اس کے سر پر سوار ہو گئیں۔ بیوی کو کچھ لا کر دیا...... ساس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ بیوی کو کہیں گھمانے گیا۔ ساس گھر میں تڑپ گئیں اور بیٹا بہو کے آنے تک۔ اتنی شدید بیمار پڑیں کہ الٰہی توبہ۔ کم بخت اگر بیوی کے لیے چپل بھی لایا تو ساس کو یوں لگتا ہے کہ وہ جوتا ان کے سر پر پڑا ہے۔ پتہ نہیں یہ بے وقوف کھوسٹ عورتیں جوان بہوؤں سے مقابلے بازی کیوں کرتی ہیں۔ ایسی حرکتیں کر کے اپنی عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دیتی ہیں۔"

"واقعی اپنی شمو بہت خوش قسمت ہے۔ لڑکا خود ہی الگ ہو رہا ہے۔ شمو پر کوئی بات بھی نہیں آئے گی۔" بڑی بھابی خوش ہو کر بولیں۔

"ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔" بڑی آپا نے ہنس کر کہا۔

سب کی باتیں۔ کافی دیر تک شمو خالہ بڑے صبر سے سنتی رہیں۔ اور جب برداشت سے باہر ہو گیا۔ تو بڑے سخت سے لہجے میں بولیں۔ زویا میرا ایک کام کرے گی؟"

"ارے خالہ جانی۔ حارث بھائی کو کوئی محبت بھرا خط دینا ہے۔"

"نہیں...... بلکہ تم زبانی کہنا...... اگر وہ...... واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو الگ گھر لینے کی ضرورت نہیں۔ میں ان کے والدین کے ساتھ رہنا پسند کروں گی۔"

"اے ہے۔ یہ کیا باؤلے پنے کی باتیں کر رہی ہو۔ خدا نے یہ موقع تمہیں خود دیا ہے۔ کیوں ٹھکرا رہی ہو۔ بعد میں علیحدہ ہونے کے لیے لڑو گی۔" بڑی آپا نے سمجھایا۔

"خالہ کوئی آپ کو بُرا نہیں کہے گا۔ حارث خالو تو ابھی سے آپ کے عشق میں دیوانے پھر رہے ہیں۔" زویا نے خوش ہو کر بتایا۔

"نفرت ہے ایسے عشق سے مجھے۔ جو انسان سے اس کی ذمہ داری کا احساس چھین لے۔ شادی ایک باہمی۔ ذمہ داری کا نام بھی ہے۔ کسی عشق و عاشقی کے روز ناچے کا نام نہیں ہے۔ اور لتاں جانی! میں تو یہ کبھی تصور میں بھی نہیں سوچ سکتی کہ میں ماں بن کر اپنے بچے کو۔ اپنی جوانی کے پچیس تیس سال مٹا کر پالوں اور وہ میری محبتوں' شفقتوں اور ریاضتوں کا یہ حساب دے کہ شادی کے بعد وہ پہلی حرکت یہ کرے کہ وہ مجھے جوتی سے ٹھوکر مار کر اپنی بیوی کے پاس جا کر دم لے۔ اس کی محبتوں' چاہتوں کی واحد امین صرف اور صرف اس کی بیوی ٹھہرے۔ ماں باپ کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔ جو شخص' محبت کی صحیح تقسیم نہیں کر سکتا۔ اُسے میں ایک اچھا شخص کس طرح تسلیم کرلوں۔ ایسی شادی سے تو میں غیر شادی شدہ بھلی۔"

"پلیز خالہ...... آپ انکار مت کیجئے گا۔ میں حارث بھائی کو ساتھ رہنے کے لیے سمجھاؤں گی۔" زویا گھبرا کر بولی۔

"سمجھا لو گی...... تو پھر ٹھیک ہے۔" شمو خالہ مسکرائیں۔

ان کو ہنستا دیکھ کر اماں کی جان میں جان آئی۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ بیٹھے سے لیٹ گئیں۔ "خدایا یہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر کی ہو جائے۔"

شمو خالہ...... حسب عادت گنگناتی ہوئی بال سلجھانے لگیں۔ واقعی ایک بڑا طوفان آتے آتے رہ گیا تھا۔

❀❀❀

نکھرے دل کے موسم

وہ رو رہی تھی

ہولے ہولے اس کا وجود لرز رہا تھا۔

آج لماں اُسے کس قدر یاد آ رہی تھیں یہ وہی جان سکتی تھی۔

اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ لماں اُسے اپنے سینے میں بھر لیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنی آنکھیں موند لے۔

گھر والوں کی ڈانٹ پھٹکار سے بچانے کے لیے۔ وہ اپنی سی کر ڈالتی تھیں۔ کتنا پیار کرتی تھیں وہ اُس سے۔ اتنا تو شاید انھوں نے اپنی کسی اولاد سے نہیں کیا ہوگا۔

اور پھر ان کی باتیں کس قدر صحیح ثابت ہوئی تھیں۔ چاہت کے سچے موتی قدرت نے اس کی جھولی میں ڈالے یہ اور بات تھی کہ اُسے خود انتخاب کا صحیح سلیقہ نہ آیا۔

اس وقت گھر والوں کی باتیں رس بن کر اُس کے کانوں میں گھل رہی تھیں مگر وہ پھر بھی رو رہی تھی حالانکہ اُس کا دل ہنسنے کو بھی چاہ رہا تھا کہ وہ بلند بانگ قہقہے لگائے اور ساری دنیا کو بتا دے کہ وہ اب کبھی نہیں روئے گی۔

زندگی کا ہر نیا قدم مسکراتے ہوئے اُٹھائے گی۔

اُس وقت اس کے آنسو خوشی کا سواگت کرتے ہوئے بہہ رہے تھے۔ تشکر کے احساس سے اُمڈے چلے آ رہے تھے اور پھر رونا اُس کی عادت کا ایک حصہ بھی تھا اور عادتوں سے یکدم پیچھا چھڑانا اُس کے بس میں نہ تھا۔ آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتے ہوئے اُسے اپنی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔

☆☆☆

لماں کو جب کبھی اُس پر لاڈ زیادہ آتا تو اُسے لاجونتی کہہ کر پکارا کرتیں۔ یہ اُس کا لاڈ کا

نام تھا۔ جسے صرف وہی لیا کرتیں...... جہاں اُنھوں نے اُسے لاجونتی کہہ کر پکارا۔ رملہ آپا اور سائرہ باجی کھل کھلا کر ہنس پڑتیں۔

''لماں! یہ آپا لوگ مذاق اڑا رہی ہیں میرا۔'' وہ چڑ کر کہتی۔ تب وہ اپنی ہنسی چھپانے کے لیے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیتیں مگر اپنی مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھ دیکھ کر ہنستیں۔

وہ بہت چھوئی موئی سی تھی۔ حقیقت میں لاجونتی کے پودے کی طرح۔ کس قدر تو دبلی تھی، بالکل سینک سلائی جیسا اُس کا جسم تھا اُسے دیکھ کر یوں لگتا جیسے اپنی ہڈیاں سمیٹے پھر رہی ہو۔

رملہ آپا کا دعویٰ تھا کہ نہ صرف وہ ناغے کے دن کی پیدائش ہے بلکہ جس دن وہ تولد ہوئی۔ تمام قصائی ہڑتال پر چلے گئے تھے مگر اس کے باوجود وہ لماں کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ انھوں نے کسی چھوٹے بچے کے اتنے لاڈ نہیں کیے ہوں گے جتنے وہ اُس کے کرتی تھیں۔ رنگت اُس کی صاف تھی۔ لماں جب اُسے چاندنی کہہ کر پکارتیں تو مارے اتراہٹ کے وہ پھول جاتی۔ ''لماں۔ آپ مجھے بلا رہی ہیں یا آپا کو؟'' وہ اُنھیں چڑانے کے لیے ستاتی۔

''میں تو اپنی چاندنی کو بلا رہی ہوں۔ چاندنی تو صرف تم ہی ہو۔'' لماں آنکھوں میں ستارے بھر کر اُسے کہتیں۔ اور وہ آپا کو انگوٹھا دکھاتی ہوئی لماں کے پاس چھپ جاتی۔

رملہ آپا اور شمعونہ میں کوئی پندرہ سال کا فرق تھا۔ اتنے بڑے گھر میں جہاں سب بڑے ہوں شمعونہ کا وجود کسی گڑیا سے کم نہ تھا۔ اس لیے وہ شمعونہ سے چھمو بن گئیں۔ گھر میں ہر طرف صرف چھمو کی پکار ہوتی۔ ہاں لماں لاڈ میں آ کر کبھی لاجونتی اور چاندنی کہہ کر بھی پکار لیا کرتیں۔

چھمو بی کے وہ وہ لاڈ ہوتے کہ رملہ آپا اور سائرہ باجی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ بعض اوقات تو وہ جل کر کلس جاتیں۔ لماں اُنھیں ہر جگہ اپنی جان کے ساتھ لگائے پھرتیں۔ کون سی نعمت تھی جو اُن کے حلق میں نہ ٹھونسی جاتی ہوگی۔ مگر اُس کے باوجود وہ بے حد کمزور سی تھیں۔ اتنا خیال رکھنے کے باوجود مجال ہے کہ ان پر بوٹی چڑھ جائے۔ نہ صرف وہ چھوئی موئی سی تھیں بلکہ بے حد ڈرپوک اور بزدل بھی۔ بلی کو دیکھ کر اپنی دھونکنی سانس کے ساتھ لماں کے سینے سے چمٹ جاتیں۔

''اری کیا ہوا؟''

''کچھ بتا تو سہی۔'' وہ انتہائی پیار اور لگاوٹ سے پوچھا کرتیں۔

''لماں! ایسی کالی بلی برآمدے میں بیٹھی ہے۔ جیسے کوئی جن ہو۔ ایمان سے سُرخ سُرخ آنکھیں ہیں اُس کی۔'' وہ اپنے لرزتے وجود کے ساتھ کہتیں اور اپنا منہ لماں کے سینے میں چھپا لیتیں۔

''اب مت جائیو وہاں خواہ مخواہ کوئی ایسی ویسی چیز ہو۔ بچی کا خون ویسے ہی بہت ہلکا

ہے۔" وہ اُس کو اپنے پاس سے ہلنے نہ دیتیں۔ چھپکلی اور لال بیگ...... کوئی بی چھمو کو نظر آ جاتا تو ان کی چیخیں دیکھنے کے قابل ہوتیں۔ سارے گھر میں ایک اُودھم سا مچ جاتا۔ ایسے میں اگر ابا میاں گھر میں ہوتے تو وہ ناراضگی سے چھمو کو دیکھتے۔ "اے کیوں شور مچا رہی ہو۔ چپل لو اور مار دو۔ ایسا کون سا ہاتھی آ گیا جو یوں غل مچایا جا رہا ہے۔"

تب لمّاں...... اُس کی وکالت میں اپنے کمرے سے اُٹھ آتیں۔

"اے ہے۔ میری بچی کو کچھ مت کہنا۔ وہ نہیں مار سکتی لال بیگ۔ اُس کا دل نہیں ہے ہاتھی سا۔ چل بیٹی، میرے کمرے میں۔ کیسی لرز کر رہ گئی میری بچی۔ چل، تجھے دودھ میں گلوکوز ڈال کر دوں۔"

تب چھمو گھنٹوں لمّاں کے بستر پر اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی رہتیں۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھیں۔ تو کام کرنے کی کوئی ذمّے داری ان پر تھی نہیں۔ اور لمّاں بھی اپنا پیار اُس پر لٹانے کا فیصلہ کر بیٹھی تھیں۔

جہاں امّاں جاتیں۔ وہ امّاں کا برقع پکڑے ان کے ساتھ ہوتیں......

اگر کبھی مذاق میں بھیا ان کو سُوکھی کہہ کر چھیڑ دیتے تو وہ رو رو کر جل تھل کر دیتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر رونے کا اُنھیں شوق بھی بہت تھا۔ ایسے میں لمّاں بھیا کو بھی پھٹکار دیتیں۔ "اے ہے کیوں میری بچی کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ کس قدر کمزور اور لاغر سی ہے۔ پتہ نہیں کب تک جیے گی۔ جب تک جینی ہے۔ اُس وقت تک اُسے چین سے رہنے دو۔" اختتامی جملے پر لمّاں کا رونا اور مزید مصیبت بن جاتا۔ لمّاں کو روتا دیکھ کر وہ اُن سے زیادہ بازی لے جانے کی فکر میں رہتی۔

بھیا یہ صورتِ حال دیکھ باہر کھسک لیتے۔ تب اُن دونوں کو چپ کرانے کی ذمے داری رملہ آپا لیتیں اور دونوں کو چپ کراتے کراتے وہ خود بھی خاصی ہکان ہو جاتیں۔ لمّاں چھمو کو سینے سے لگا کر بستر پر لیٹ جاتیں اور چھمو لمّاں کے سینے میں منہ چھپائے گھنٹوں کسی معصوم بچے کی طرح سوتی رہتیں۔

ابا میاں چھمو کے اِس طرح کے لاڈ دیکھ کر جل جاتے۔ لڑکی کے بے طرح کے لاڈ کر کے تم نے اُسے دو کوڑی کا نہیں رکھا۔"

"آپ اس کی صحت دیکھ رہے ہیں۔ "انڈر ویٹ" ہے۔ دس سال کی بچی کا وزن چار سال کے بچے کے برابر ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ اگر یہ زیادہ کھائے پیے گی نہیں تو مر جائے گی۔" لمّاں کی سسکیاں پھر شروع ہو جاتیں۔

"رقیہ بیگم۔ یہ بے وقوفی کی باتیں میرے سامنے تو مت کیا کرو۔ ایسے ایسے کمزور۔ میں

نے طویل العمر دیکھے ہیں کہ بتا نہیں سکتا اور بعض صحت مند منٹوں میں چٹ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس کی جتنی زندگی لکھی ہے۔ اتنا تو وہ ہر صورت میں جیے گا۔"

"بعض کا جسم ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کتنا ہی کھالیں مگر ان پر لگا ہوا نظر نہیں آتا۔" بھیا امّاں کو چڑاتے۔

"ہم تو بھئی کھا پی کر حلال کرتے ہیں۔ کھایا پیا نظر تو آتا ہے مگر بعض کا جسم ہی چور ہو تو کیا کریں۔" رملہ آپا بھی بھیا کا ساتھ دینے آ جاتیں۔

"ہاں ہاں۔ سب کو میری چھمو ہی نظر آتی ہے۔ کھاتی کیا ہے میری بچی۔ کچھ خوراک بھی ہو اُس کی۔"

"ہاں لمّاں! صبح ملائی کا پیالہ۔ میں نے فریج میں رکھا تھا۔ شاید بلی فریج سے نکال کر کھا گئی۔ ہم لوگوں نے تو ناشتے میں بالائی کی صورت نہیں دیکھی۔" سائرہ باجی ہنس کر کہتیں۔

"لمّاں! یہ باجی۔ مجھے بلی کہہ رہی ہیں۔" چھمو ہونٹ سکوڑ کر رونے کا بہانہ ڈھونڈتیں۔

"ارے جان عذاب میں آ گئی ہے میری۔ تم لوگ سیاہ کرو یا سفید مگر میری بچی کا پیچھا نہ کیا کرو۔ نہ جانے اس سے اتنی محبت کیوں ہے؟ دل چاہتا ہے کہ ہمہ وقت اسے کلیجے سے لگائے رکھوں۔" نہ جانے کیسی تھی وہ؟

لمّاں اُسے اپنے حلق کا نوالہ بھی کھلا دیتیں۔ تب بھی اُس کا نہ پیٹ بھرتا اور نہ ہی تن پر ماس چڑھتا۔

نہ جانے کس خمیر سے اُٹھی تھی کہ کسی طرح بھی وہ مطمئن نہ ہوتی۔ بعض دفعہ سائرہ باجی جل جاتیں۔

"لمّاں۔ اب آپ اس کے اتنے لاڈ اُٹھانے بند کر دیں...... حد سے زیادہ خراب ہو گئی ہے یہ کسی کو کھاتا ہوا دیکھ نہیں سکتی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ چرتی رہتی ہے۔ پیٹ نہ ہوا۔ بارہ بیگہ ہو گیا۔ ہر وقت خالی ہی رہتا ہے۔"

"ارے بچے ایسے ہی کھاتے ہیں۔ تم لوگوں کو بھی ایسے ہی ٹھنسایا ہے۔ اب بھول بیٹھے ہو۔"

"نہیں لمّاں۔ بہت بدتمیز بھی ہو گئی ہے۔ ذرا سی بات کرو تو کاٹ کھانے کو آتی ہے۔ بڑوں کا ادب لحاظ اس میں کچھ ہے ہی نہیں......"

"اے ہے۔ میری بچی بڑی تمیز والی ہے۔ بس بیماری میں چڑچڑی سی ہو گئی ہے۔"

"لمّاں۔ اتنا تو سب اس کو پیار کرتے ہیں مگر پھر بھی اس کی تشنگی نہیں مٹتی۔ کہاں سے لائیں

اتنا پیار کہ یہ سیراب ہو سکے۔ نہ جانے کس بنجر مٹی سے اس کا خمیر اُٹھا ہے کہ سرسبز ہونا نہیں جانتی ہے۔" رملہ آپا۔ مارے غصے کے اُسے خوب سُنا ڈالتیں۔

"ارے مت پیچھا لیا کرو اس کا۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ ہڈیوں کی مالا ہے یہ......"

"لتاں۔ یہ چھمو قطعی نفسیاتی کیس ہے۔ اور آپ اس کیس کو مزید خراب کر رہی ہیں۔"

"اور کیا لتاں! اس قدر تو سب اس سے پیار و محبت کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ سب سے ناراض رہتی ہے۔ حالانکہ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے۔" سائرہ باجی چڑ کر کہتیں۔

"اری سائرہ۔ تو تو نہ کہہ اس کو کچھ۔ تیرے لاڈ پیار کیا کم ہوئے ہیں۔ تم دونوں کالی بلیوں کے سامنے۔ میرا یہ چاند آ گیا تو رہ گئیں جل کے۔"

"ہاں۔ جلنے کے لیے بھی سُوکھی رہ گئی ہے ہمارے لیے۔" رملہ آپا۔ مُنہ میں دوپٹہ ٹھونس کر اپنی ہنسی چھپا لیتیں۔

"جب گھر والے ہی اس کو نفسیاتی کیس اور پاگل کیس کہیں گے تو باہر والے تو نہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالیں گے۔ تم لوگوں کی یہی بکواس اگر جاری و ساری رہی تو میری بچی کی شادی ہونا مشکل ہو جائے گی۔"

"اچھا ہے بڑھاپے میں آپ کی خدمت کرے گی۔" آپا جل جاتیں۔

"اری نہ نکال منہ سے بدخال۔ خدا اس کا نصیب اچھا کرے۔ تم دیکھنا کہ اس کے چاہنے والوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ اپنی لاجونتی کو اُس میں انتخاب کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ ہار لے کر سب کا موازنہ کرے گی اور کسی ایک کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر منتخب کرے گی۔" رملہ آپا نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بھئی۔ یہ اپنے امیدواروں کے لیے کچھ شرائط پیش کر دے گی۔ جو مائی کا لال اس کی شرطیں پوری کرے گا۔ وہ شادی کا حقدار ٹھہرے گا۔" رملہ آپا سے آگے سائرہ باجی نے چوٹیں کرنی شروع کیں۔

"اے ہے۔ شرائط کیا ہوں گی۔ کچھ بھی تو نہیں مگر پہلے میری دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں کرا دو۔ بے حد کالی ہیں۔ ان سے کوئی شادی کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔" وہ جل کر بولی۔

لتاں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ "اے لو۔ میری چاندنی کس قدر ہنساتی ہے۔ بھئی' شرط بہت اچھی ہے۔ اب کرو کوئی مذاق میری چندا سے۔ کر دی نا اُس نے تم لوگوں کی بولتی بند۔ خواہ مخواہ اُس کو تم لوگ تنگ کیے جا رہی تھیں۔"

"لتاں تنگ کرنے کی بھلا کیا بات ہے۔ ہم تو شرطیں اس لیے رکھوا رہے ہیں کہ بعد میں

آپ کی لاجونتی کو تکلیف نہ ہو۔ مثلاً۔

(۱) یہ پلیں گی نہیں۔ گھر کا سب دھندا دولہا میاں کو کرنا ہو گا۔

(۲) یہ ہنسیں گی نہیں۔ کیونکہ خوش مزاجی کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

(۳) کھانے کی سب چیزیں پہلے یہ کھائیں گی۔ بعد میں دولہا میاں۔

(۴) کوئی بات ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہو گی۔

(۵) ان کا جب دل چاہے گا یہ روئیں گی۔ کیونکہ لوگوں کو پریشان کر کے انھیں بے حد لطف آتا ہے۔"

"اماں دیکھ رہی ہیں آپ' آپا لوگ کو۔ کس قدر مجھے تنگ کر رہی ہیں۔ میری تو دشمن بن جاتی ہیں یہ دونوں۔" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ بچی کے ساتھ بچہ کیوں بن جاتی ہو۔ غضب خدا کا' ہر گھر میں چھوٹے بچوں سے لاڈ ہوتے ہیں' یہاں الٹا ہی حساب ہے۔ برابر کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔"

"اچھا لتاں۔ مقابلہ بازی ختم۔ آپ فکر نہ کریں۔ قرعہ نکال کر اس کی شادی کر دیں گے۔" سائرہ باجی ہنسیں۔

"آج کل کوئی ایک آدھ ہی رشتہ آ جائے تو بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ آپ لڑکیوں کے سامنے اینگی بینگی باتیں مت کیا کریں۔" بھیا بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل جاتے۔ اور لتاں اُس کو اپنے کلیجے میں سمیٹ کر بیٹھ جاتیں۔

موسم ذرا سا بھی تبدیل ہوتا چھمو پر سب سے پہلے اثر پڑتا۔ کوئی بیماری ایسی نہیں تھی جو چھمو نے آزمائی نہ ہو۔

عام دنوں میں بھی وہ بستر پر لیٹی رہتیں اور بیماری کے دنوں میں بھی وہ بستر توڑا کرتیں۔ اس لیے آنے جانے والے ان کو ہمہ وقت بستر پر اینڈتا دیکھ کر کبھی متعجب نہیں ہوتے تھے۔ ہاں اگر وہ غلطی سے کام کرتی نظر آ جاتیں تو ضرور حیرت ہوتی۔

"اے ہے۔ یہ اپنی چھمو کیا ٹھیک ہو گئی؟" چھوٹی خالہ اُس کو نارمل دیکھ کر ہمیشہ حیرت زدہ رہ جاتیں۔ بقول ان کے اس کا وجود صرف بیماریاں سہنے اور علاج کروانے کے لیے دنیا میں آیا تھا۔

"فیروز ایسا نہ کہو اس کو۔ خدا اسے صحت دے۔ لمبی زندگی دے۔ میری عمر بھی اس کو لگ جائے۔" لتاں۔ چھوٹی خالہ کی باتیں سُن کر سراسیمہ سی ہو جاتیں۔ چھمو اگر لیٹی ہوئی بھی ہوتی تو اس کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگاتیں اور چٹا چٹ اُس کی بلائیں لیے چلی جاتیں۔

تب وہ اُن کے شانے پر منہ رکھ کر کسی معصوم بچے کی طرح آنکھیں موند لیتی۔ ایسے سمے آپا اور باجی کو بھی اس پر پیار آ جاتا...... امّاں بی کو ذرا بخار ہی آیا تھا کہ چھمو کی حالت دیدنی ہوگئی۔ امّاں کی پٹی سی لگ کر بیٹھ گئیں۔ آنسوؤں کا ریلا تھا۔ جو اُن کی آنکھوں سے کسی صورت رُکنے میں نہیں آ رہا تھا۔ "اری میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تُو تو آرام کر۔" امّاں سے بیماری میں بھی اُس کی بے چینی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

خدا نے بھی شاید اُس کی آزمائش کرنی تھی۔ امّاں کا بخار ٹائی فائیڈ میں تبدیل ہو گیا اور ٹائی فائیڈ ایسا بگڑا کہ انتہائی صحت مند امّاں بی یوں چٹکی بجاتے ختم ہو گئیں کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

امّاں کے انتقال کا صدمہ سب کے لیے ہی جان گسل تھا مگر چھمو کے لیے تو برداشت سے باہر...... ایک ہفتہ "کوما" میں رہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد دل کا ایک والو انتہائی کمزور ہو گیا۔

اس بچی کو کبھی کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ یہ ہارٹ کے ڈاکٹرز کی متفقہ رائے تھی۔ تب رملہ آپا نے مارے ڈر کے اُسے اسکول سے اُٹھا کر گھر بٹھالیا کہ مبادا فیل ہونے کا صدمہ ہی گراں گزرے۔

گھر میں اس کو پڑھانے کے لیے لیڈی ٹیچر کو انتظام کیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ اُنھیں پرائیویٹ ہی میٹرک کا امتحان دلوا دیا جائے مگر اکل کھری تو وہ ہمیشہ کی تھیں۔ لیڈی ٹیچر کا مٹاپا اُنھیں کسی طور نہ بھایا۔ "اس قدر موٹی عورت کو دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کس قدر تھل تھل کرتا وجود ہے اس کا۔ یقیناً بقر عید کے دن کی پیدائش ہے۔ کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ اس کو دیکھ کر میرا دل گھبراہٹ میں بند ہو جائے۔"

"چندا، تُو کیسی باتیں کرتی ہے۔" رملہ آپا۔ اُس کو سینے سے لگا لیتیں۔ "تجھے پتہ ہے کہ ہم لوگ تجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ ہم لوگ کیا تیرا برا بھی سوچیں گے۔" وہ اس کی پیشانی چوم کر کہتیں۔

"کیا پتہ، اب امّاں تو نہیں رہیں۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے کہتی...... سائرہ باجی۔ اُسے سینے سے لپٹا کر خوب آنسو بہاتیں۔ "چاندنی ایسی باتیں مت کیا کر۔ تو تو ہمارے کلیجے کا ٹکڑا ہے۔ گھر میں پڑھ کر آرام سے امتحان دے دینا۔ تعلیم حاصل نہیں کرو گی۔ تو سب کہیں گے کہ امّاں مر گئیں تو بہنوں نے جاہل رکھا۔ اس لیے تم مس سے پڑھ لیا کرو۔ اتنی محبت سے پڑھاتی ہیں۔ اس قدر عمدگی سے ایک ایک بات تمہیں سمجھاتی ہیں۔ تجربہ بھی ان کا بہت ہے۔ کسی بہت بڑے اسکول میں جا کر پڑھاتی ہیں۔ تم تو بہت خوش نصیب ہو کہ اتنی اچھی ٹیچر تمہیں پڑھانے کے لیے راضی ہو گئی ہیں۔"

"کیا دنیا میں ان سے اچھی کوئی ٹیچر نہیں ہیں۔" وہ ضد سے بولیں۔ "یا سب ٹیچرز ایسی ہی موٹی تازی ہوتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے۔ اتنی کرخت آواز ہے جب یہ بولتی ہیں تو کان میں چھری سی چالگتی ہے۔ کیا کوئی مترنم آواز والی ٹیچر دستیاب نہیں ہوسکتی۔" وہ بدشوقی سے بولی۔ بھیا نے بہت سمجھایا کہ ٹیچر بہت قابل ہے۔ تمہیں بہت عمدگی سے پڑھائے گی۔ مگر وہ کسی طرح بھی اُس سے پڑھنے پر تیار نہ ہوئیں۔ ٹیچر بھی بڑی صابر عورت تھی۔ گاہے بگاہے خود ہی آ جاتی۔ چھمو سے دوستانہ انداز میں بات چیت کرتی۔ تب چھمو اُس کی باتوں کا ایسے بُرے بُرے منہ بنا کر جواب دیتی کہ دیکھنے والوں کو اپنی ہنسی ضبط کرنی مشکل ہو جاتی۔

امّاں کے انتقال کے بعد دونوں بہنیں اُس کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھ رہی تھیں۔ اُس کی تمام تر بدتمیزیاں بڑے صبر سے برداشت کی جا رہی تھیں۔

سائرہ باجی اس کو اپنے سامنے بٹھا کر کھانا کھلاتیں۔ رملہ آپا نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی گڑیوں کے ڈھیروں ڈھیر کپڑے سیا کرتیں۔ گڑیوں کی شادی میں شریک ہوتیں۔ اُس کی بے ڈھنگی سہیلیوں کی اُس کی خواہش کے مطابق خوب خاطر و مدارت کرتیں مگر جب چھمو کا موڈ آف ہو جاتا یا کسی کی بات بری لگتی تو وہ امّاں کہہ کر ایسی زور دار چیخ مارتیں کہ سارے گھر کا دم مٹھی میں آ جاتا۔

"کیا ہوا چھمو جان!" یہ کہہ کر سب اُس کے پاس دوڑے چلے آتے۔ اپنی بے انتہا چاہت اور اس قدر محبت دیکھ کر بعض اوقات وہ جان بوجھ کر، بغیر کسی وجہ کے امّاں کی چیخ مار لیا کرتی۔

ابھی چھمو نے میٹرک کا امتحان پاس بھی نہیں کیا تھا کہ رملہ آپا بیاہ کر سعودی عرب چلی گئیں۔

ان کے میاں کا وہیں اپنا بزنس تھا۔ وہ اور ان کے بھائی مستقلاً وہیں سیٹ تھے۔

رملہ آپا کی شادی کو ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ سائرہ باجی کی شادی امریکا میں مقیم ان کے چچا زاد سے ہوگئی۔ یہ وہی چچا زاد تھے جو سائرہ باجی کے ٹھیکرے کی مانگ تھے۔ مگر امریکا جا کر وہاں رہنے کے چکر میں انھوں نے امریکن لڑکی سے شادی کر لی تھی اور جب امریکن لڑکی کو ان سے بہتر لڑکا نظر آیا تو شادی کے پانچ سال بعد ان کے کِک لگا کر اُنھیں چھوڑ گئی۔ اُس کا جانا باجی کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ تب شہزاد بھائی فوراً پاکستان آئے۔ امریکن لڑکی سے شادی اور طلاق کی کہانی چھپا کر سائرہ باجی کو خوشی خوشی اپنا لیا۔ جو اُن کے انتظار میں اپنے بالوں میں چاندی بھرے بیٹھی تھیں۔ شہزاد بھائی کو مستقلاً پانچ سال رہنے کے سبب امریکن پاسپورٹ مل گیا تھا۔ اب

وہ دوسرے درجے کے امریکہ شہری کہلاتے تھے مگر اس پاسپورٹ کے طفیل سائرہ باجی بھی اپنی شادی کے صرف دو ماہ بعد امریکا چلی گئیں۔ ورنہ وہ تو خاصی پریشان تھیں۔ ان کی سہیلی ثریا کی شادی گرین کارڈ ہولڈر لڑکے سے ہوئی تھی اور دو سال ہو گئے تھے' وہ کسی طرح بھی اپنے شوہر کے پاس امریکا نہیں جا پا رہی تھی۔ کبھی کچھ' کبھی کچھ' قانونی موشگافیاں دو دلوں کے بیچ میں آ رہی تھیں۔ دونوں بہنوں کی شادیوں کے بعد اب چھمو چار سو گز کے وسیع گھر میں اکیلی تھیں۔ بوا کا وجود بھی بیکار تھا۔ ڈھنگ سے بجھائی تک تو اُنھیں دیتا نہیں تھا۔ بس اٹکل سے کام کیا کرتی تھیں یا پھر ان کی بہو ہڑو نگے پن سے کام سمیٹ کر سرونٹ کوارٹر میں بھاگتی تھی۔ مجال ہے کہ دو گھڑی چھمو کے پاس ٹک تو جائے۔

ایک بھیا تھے۔ گھر میں ہوتے تو اُس سے چھیڑا چھاڑی کر لیتے ورنہ ان کا زیادہ وقت باہر گزرتا۔ اپنی منگیتر کی وفات کے بعد وہ ایسے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ شادی کا نام نہیں لیتے تھے۔ حالانکہ وہ تمام بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوبرو مرد تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ' ریزن ایبل پوسٹ پر فائز۔ کوئی بھی اچھی سی لڑکی ایسے مرد کی آرزو کر سکتی تھی۔ مگر وہ اپنی خوش مزاجی کے باوجود شادی کا نام تک نہیں لیتے تھے۔

ابا کو کبھی کسی بچے سے زیادہ بات چیت کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ اماں کی زندگی میں تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی عادت تھی جو اُن کے بعد بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔

اپنا کمرہ ہوتا اور ان کا حقہ۔ جس کو ملازم ہمہ وقت بھرتا رہتا اور وہ حقے کی گڑ گڑ میں تمام مسائل پھونک لیا کرتے۔

آپا اور باجی کے باہر بیاہ کر جانے کے بعد کوئی بھی گھر میں ایسا نہیں تھا جو اس کے نخرے سمیٹتا یا اس کی خواہ مخواہ کی دلداریاں کرتا۔

چھمو کے لیے گھر ہوا بن کر رہ گیا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا ذہن پچی ہو جاتا۔ خواہ مخواہ کی بے تکی سوچیں اُسے ہولاتی رہتیں اور پھر اُسے ایسا دَن دَنا کر بخار چڑھا کہ الٰہی توبہ! کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں تھا۔ ابا میاں سدا کے بے پروا...... دوا لا کر ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ دوا کھائی بھی تھی یا نہیں۔ تب وہ دوا کھائے بنا لوٹ پوٹ کر خود ہی ٹھیک ہو گئی۔

اور جب تنہائی کا زہر اس کی نس نس میں بھر گیا تو اس کی بوریت عروج پر پہنچ گئی۔ ایسے سمے صرف کتابیں ہی تھیں جو اس کو اپنی ساتھی نظر آئیں۔ تنگ آ کر کورس کی کتابوں میں خود ہی دل لگا لیا۔ لیڈی ٹیچر جو اپنے مٹاپے کی وجہ سے نکال دی گئی تھیں پھر بحال کر دی گئیں۔

رملہ آپا کے جب منا ہوا تو اُن دنوں چھمو نے سی گریڈ میں میٹرک بھی پاس کر لیا۔

چھمو کے میٹرک پاس ہونے کی خوشی بھیا نے خوب منائی۔ محلے بھر میں چار چار مکھن بڑے بانٹے گئے۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چھمو میٹرک بھی کر لیں گی۔

"اب کیا ارادہ ہے چھمو بٹی کا۔" انھوں نے بڑے فخر اور لاڈ سے پوچھا۔

کیونکہ چھمو کا میٹرک کرنا۔ ان کو پی ایچ ڈی کے برابر نظر آ رہا تھا۔

"اب ہم کالج میں ایڈمیشن لے کر پڑھیں گے۔ باقاعدگی سے۔" بی چھمو اترا کر بھائی کے سامنے بولیں۔

"پرائیویٹ امتحان دینے میں کیا حرج ہے۔ آنے جانے میں تم خواہ مخواہ تھکو گی۔" انھوں نے سمجھایا۔

"ہم تو گھر میں بے کار بیٹھ کر تھک جاتے ہیں۔ آنے جانے کی بھی کوئی تھکن ہوتی ہے۔ اپنی موٹر میں بیٹھ کر ٹھاٹ سے جایا کریں گے۔ آپ کو کیا معلوم کہ پرائیویٹ امتحان دینے سے کتنا نقصان ہوا ہے۔"

"کیا نقصان ہوا ہے تمہارا' مزے سے سی گریڈ آ گیا' جس کی کم از کم مجھے توقع تک نہیں تھی۔" بھیا نے ہنس کر کہا۔

"مت کریں بھیا ہم سے ایسا مذاق جس سے شرمندگی ہوتی ہے۔"

"تم شرمندہ بھی ہوتی ہو گڑیا۔" وہ مذاق میں اُس کے سر پر چیت لگاتے ہوئے بولے۔

"آپ میری بھی سنیں گے یا صرف اپنی ہی کہتے رہیں گے۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

"اچھا اچھا۔ کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔ ہم سننے کے لیے بے قرار ہیں۔" بھیا شرارت سے منہ بنا کر بولے۔

"آپ اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہیں کہ اگر میں اسکول کی ریگولر اسٹوڈنٹ ہوتی تو میرا یقیناً اے گریڈ آتا' گھر میں اُس موٹو نے بے انتہا خراب پڑھایا۔ اس وجہ سے میرا گریڈ متاثر ہوا۔"

"اوہ یہ بات ہے۔" بھیا سیٹی بجانے کے انداز میں اپنے ہونٹ سکوڑ کر رہ گئے۔

وہ تو سی گریڈ کو بھی ان کے لیے نعمتِ عظمیٰ سمجھ رہے تھے اور وہ اپنی اوقات سے زیادہ بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔

"اچھا تو اپنی بی چھمو میٹرک کے متاثرین میں سے ہیں۔" ابا میاں نے پہلی دفعہ اس معاملے میں دلچسپی لی۔

"ان محترمہ کی اس سلسلے میں کچھ امداد کیجیے۔" بھیا ہنسے۔

"وہ کیسے۔"

"کسی اچھے سے کالج میں کچھ ڈونیشن دے کر ان کا ایڈمیشن کرائیے۔ محلے کی تمام بچیاں وہیں جاتی ہیں۔"

"مگر ہم لڑکوں کے ساتھ ہرگز نہیں پڑھیں گے۔" چھمو نے اپنا فیصلہ سُنایا۔

"نہ پڑھنے کی وجہ۔"

"بے غیرتی سی لگتی ہے۔ ہماری صلاحیتیں نکھر کر زیادہ سامنے نہیں آسکتیں۔ اپنے ہم جنسوں میں پڑھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ تم لوگوں سے ڈرتی ہو۔ فکر نہ کرو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔" بھیا ہنسے۔

"جی نہیں۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" انھوں نے طیش میں آکر اپنی آستین چڑھائی۔

"پھر کیوں نہیں ایڈمیشن لے رہیں؟"

"یہ بات ہے؟ تو اب ہم لڑکوں کے ساتھ ہی پڑھیں گے۔" وہ ایک ایک لفظ خوب چبا چبا کر غصے سے بولیں۔

"ہماری چھمو کس قدر مستقل مزاج لڑکی ہے' ایک منٹ میں اپنا فیصلہ بدلتی ہے۔" ابا میاں اس کی باتیں سُن کر دل کھول کر ہنسنے لگے۔

"ابا میاں۔ کیا ہو رہا ہے آپ کو۔ زیادہ مت کہیں' کہیں پہلے والا فیصلہ بحال نہ ہو جائے۔" چھمو خوب چڑ کر بولیں۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ماشاء اللہ خوب مستقل مزاج ہو۔"

"مگر ابا میاں بغیر آپ کی ایڈ کے ان کا داخلہ شہر کے کسی کالج میں نہیں ہو سکتا۔"

"ارے بھئی دے دیں گے۔ تم ہماری چھمو بیٹی کے داخلے کی پوری پوری کوشش کرو۔"

چھمو کا کالج میں داخلہ کیا ہوا۔ سب حیران سے رہ گئے۔

چھوٹی خالہ نے سُن کر خاصا واویلا مچایا۔

"اے ہے۔ بے ماں کی کمزور سی بچی پر ایسا ظلم...... اس میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ کالج بھی جایا کرے گی۔"

"خالہ بی! کالج میں ایڈمیشن چھمو کی خواہش پر دلایا ہے۔" بھیا روہانسے سے ہو کر بولے۔

"اے لو۔ وہ اتنی قابل کب سے ہوگئی کہ اتنے بڑے بڑے فیصلے بھی خود کرنے لگی۔"

"خدانخواستہ وہ کوئی فارغ العقل نہیں ہے۔" بھیا نے برا سا منہ بنایا۔

رملہ آپا اور سائرہ باجی نے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ اُس کے لیے تحائف بھیجے اور بڑے لمبے لمبے خطوط میں اس کی تعلیم جاری رکھنے کی خواہش میں نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔؟

چھمو ان دنوں بے حد خوش تھی۔

چلنے پھرنے اور اپنا کام خود کرنے کا جذبہ ان میں بیدار ہوا تو ذہنی صحت کے ساتھ جسمانی صحت پر بھی اچھا اثر پڑا۔

گھر میں تو وہ ہمہ وقت لیٹے لیٹے بھکا بھک کھائے چلی جاتی تھیں۔ جس سے ان کا معدہ ٹھیک رہتا تھا اور نہ ہی پیٹ۔ کالج جانے سے سب کھانے پینے کے اوقات بھی متعین ہو گئے۔ مرجھایا ہوا جسم نکھر کر سڈول سا ہو گیا۔

سائرہ باجی۔ جب ایک ماہ کے لیے پاکستان آئیں تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ چھمو کی صحت پہلے سے کہیں بہتر تھی۔ تیکھے نقوش ابھر کر سامنے آ گئے۔ اس کا گورا رنگ جو ہمہ وقت بیماریوں میں کملایا ہوا زرد سا رہتا تھا۔ صحت بہتر ہونے کی وجہ سے شہابی سا ہو گیا تھا۔

چھمو نہ صرف پڑھائی میں اچھی ثابت ہو رہی تھیں بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔

بہترین مقررّہ کا بڑا سا کپ تھامے جب وہ گھر آئیں تو ابا میاں چکرا سے گئے۔

"بیٹا...... سچ سچ بتا کہیں بازار سے خرید کر تو نہیں لائی۔"

"ابا میاں۔ آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" وہ پاؤں پٹخ کر ٹھنکی۔

"ہاں...... ہاں...... بس مجھے چپکے سے بتا دو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ یہ وعدہ رہا۔"

"افوہ...... یہ دیکھیے آپ سرٹیفکیٹ کو۔ کیسا صاف جلی حرفوں میں شمعونہ ابراہیم لکھا ہے۔"

اُس نے سرٹیفکیٹ ابا میاں کی آنکھوں سے لگا دیا۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ!" ابا میاں بے حد خوش ہو گئے۔ تمہاری اماں آج زندہ ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں۔ انھوں نے دل ہی دل میں سوچ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

اور چھمو بوا کی بہو کی خبر لینے چل دیں۔ جو سالن روز بدذائقہ پکا کر رکھ جاتی تھی اور شمعونہ بہ مشکل تمام نوالے حلق سے اتارا کرتی تھیں۔ کالج کی آزادانہ رنگین فضائیں چھمو کو خوب بھائی تھیں۔ کس قدر خوبصورت زندگی تھی۔ وہ اس زندگی کو بھرپور انداز میں گزار رہی تھیں۔ دل چاہتا تو کلاس سے غائب ہو کر نیم کے درخت کے نیچے قلوپطرہ کے پوز میں کینو کھانے کا مقابلہ کیا کرتیں۔ کینو کے چھلکے۔ ان کے پاس ایک پہاڑی کی سی شکل میں جمع ہوتے تو رنگ نکھارنے کی ترکیبیں آزمائی جاتیں۔ چہرے سے لے کر پیر کے تلووں تک چھلکے رگڑے جاتے۔

'اللہ میں کتنی گوری ہوگئی' کی صدائیں ہنسی کی پھلجھڑیوں سے شروع ہوکر فلک شگاف قہقہوں تک جا پہنچتیں۔

چھمو جو اپنے گھر میں سوائے رونے کے کوئی اور ریکارڈ نہیں توڑ سکتی تھیں۔ کالج میں آ کر ان کے لب بھی مسکراہٹ آشنا ہوتے جا رہے تھے۔

ان کے شنگرفی لبوں کی بھیگی بھیگی سی مسکراہٹ' خوبصورت جملے مارنے کی عادت کا ذکر جب زبیر مسعود کو ہوا تو وہ چھمو کو دیکھ کر فریفتہ سا ہوگیا۔ اس کا انداز ہی قدرے بے پروا سا تھا۔ دیگر لڑیوں سے خاصا مختلف تھا۔ پڑھنے میں ذہین لباس میں انتہائی نفاست پسند اور گفتگو میں انتہائی منہ پھٹ جو دل میں آتا' مخاطب کے منہ پر پھٹ سے جملہ مار دیتا۔ جب زبیر نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ شمعونہ کی طرف بڑھایا تو چھمو یکبارگی جھجک کر رہ گئی۔ اس پہلو پر تو اُس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

''میرے خیال سے ہماری دوستی مناسب نہیں ہوگی۔'' اُس نے کچھ سوچ کر اپنے دل کی بات زبیر سے کہہ دی۔

''مگر کیوں' آخر ہم ایک کالج میں پڑھتے ہیں۔'' زبیر خاصا حیران ہوا۔

''لوگ اس دوستی کو مختلف معنی پہنائیں گے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''تم لوگوں سے ڈرتی ہو کیا؟'' وہ دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالتا ہوا اُسے تمسخر سے دیکھتا ہوا بولا۔

''جی نہیں۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے......'' اس کی شخصیت کا بچگانہ انداز اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اُبھر آیا۔

''پھر میری تمہاری دوستی پکی؟'' اُس نے شمعونہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''بالکل پکی؟'' شمعونہ نے اپنا نازک سا دودھیا ہاتھ زبیر کے ہاتھ میں دے دیا۔

ہفتہ بھر بعد اُس کی سہیلیاں یہ دیکھ کر خاصی حیران تھیں کہ زبیر اور شمعونہ ہر جگہ اکٹھے دیکھے جاتے۔ کولڈ ڈرنکس پینی ہوتی یا لائبریری سے کتاب اشو کرانی ہوتی۔ زبیر سائے کی طرح چھمو کے ساتھ رہتا۔ دونوں میں خاص بات ایک یہ بھی تھی کہ دونوں ہی اپنے کالج کے ڈیبیٹر تھے۔

اب وہ دونوں تقاریر کی تیاری میں ایک دوسرے کی مدد کرتے بلکہ وہ دونوں اپنے کالج کی نمائندگی کے سلسلے میں دیگر کالجز میں بھی جاتے اور انعامات لے کر آتے۔

چھمو کا ساتھ سہیلیوں کے مقابلے میں زبیر سے بڑھتا جا رہا تھا۔ چھمو کی گاڑی آنے میں دیر ہوتی تو زبیر اپنی بائیک پر اُسے گھر ڈراپ کر دیتا۔

تقاریر کے پوائنٹس اکٹھے نوٹ کرتے ہوئے۔ ان کی تکرار بعض دفعہ گلابی بھی ہو جاتی۔ لائبریری میں بیٹھ کر ادبی کتب پر تبصرہ ہوتا اور پھر ادبی باتوں کی اوٹ میں پیار کی کھوٹ بھی ملتی چلی گئی...... کچھ ہی دنوں بعد زبیر اُن سے زبردست عشق جتا رہے تھے اور چھمو بھی اپنے آپ میں سوئنی کے جراثیم محسوس کر رہی تھیں۔

''زبیر۔ محبت کا نشہ کیسا ہوتا ہے کہ ہر سو بہار کا موسم نظر آتا ہے۔''

''محترمہ! جون' جولائی کی جھلسا دینے والی گرمی ہے۔ لو چل رہی ہے آج کل لوگ گرمی سے پریشان ہیں اور آپ کو بہاریں گنگناتی محسوس ہو رہی ہیں۔''

''مگر زبیر' مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہر طرف مینہ برس رہا ہے۔ چار سو ہریالی ہے۔ یہ اپنے اندر کا موسم حسین ہو تو ہر چیز ایسی ہی سُندر لگتی ہے۔''

''ہاں' یہ بات تو ہے۔ شمی! میں نے حسن اور ذہانت کا سنگم تمہاری ذات میں دیکھا ہے۔''

تم پہلے شخص ہو جس نے یہ بات کہی۔ چھمو آپ ہی آپ دل میں ہنس پڑتیں۔

''اے' میری بات پر ہنستی کیوں ہو۔'' وہ بُرا مان جاتا۔

''اُفوہ۔ ہنسنا بھی بُرا لگتا ہے کیا۔'' وہ ناز سے آنکھیں دکھاتیں۔ ''نہیں شمی ایسی بات نہیں ہے۔ تم ہنستے ہوئے کتنی پیاری لگتی ہو۔ یہ میرے دل سے پوچھو۔''

''اچھا۔ اچھا۔ پوچھ لیں گے۔'' وہ شرما جاتی۔

''میں اپنی محبت میں ہمیشہ ثابت قدم رہوں گا۔'' زبیر جذباتی ہو جاتا۔

''بہت خوبصورت جملہ ہے۔'' وہ شرارت سے ہنستی۔

''شمی۔ تم میرا دل نہیں توڑنا۔''

''میں تمہارا دل توڑوں گی۔'' وہ حیرت سے زبیر کو دیکھتی۔

''ہاں۔ تم خوبصورت بھی ہو اور ذہین بھی۔ ہر کسی کو اچھی لگ سکتی ہو۔''

ارے میں کیا کسی کا دل توڑوں گی۔ میرا دل تو خود ہی کوئی صدمہ برداشت کرنے کا اہل نہیں ہے۔ وہ سوچ سوچ کر خود ہی نروس ہو جاتی۔

''بولو نا۔ شمی۔'' وہ اس کو یوں ساکت سا دیکھ کر بے چین ہو جاتا۔

''تمہارے پیار کے ساتھ میں ہمیشہ ہمراہ رہوں گی۔'' وہ آنکھیں بند کر کے کہتی۔ ابھی چھمو اور زبیر کی محبت کا طوطی بول ہی رہا تھا کہ سعودی عرب سے رملہ آپا اپنے دیور کی شادی کرنے پاکستان آ گئیں۔ یاور نے چھمو کو دیکھا تو اُس کے معصوم حسن کو دیکھ کر گنگ سے رہ گئے۔ وہ تو اپنی رملہ بھابی سے پیار' چڑ چڑی' نحیف و نزار چھمو کی داستانیں سُن سُن کر بور ہو چکے تھے۔ مگر

یہ چھمو تو قطعی مختلف تھی چاہے اور چاہے جانے کے قابل' گہری براؤن آنکھیں۔ شہد جیسے بھورے چمکدار شولڈر کٹ بال' لمبا قد' اس پر شہابی رنگت۔ اُس کی بات کرنے کا انداز بھی خاصا مسحور کن تھا۔ آدھی بات کر کے جملہ چھوڑ دیتی۔ دوسرا جب مسکراتا تب وہ جملے کو اختتامی رنگ دیتی۔

"چھمو۔" ایک دن یاور نے اُسے بڑی لگاوٹ سے پکارا۔

"دیکھیے مسٹر! شمعونہ نام ہے میرا۔" وہ تمکنت سے بولی۔

"اچھا شمعونہ۔ میرا نام۔ مسٹر نہیں صرف یاور ہے۔ دوست پیار سے یار بھی کہہ دیتے ہیں۔" وہ خاصی شوخی سے بولا۔

"کہتے ہوں گے۔" اُس نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

"میری ایک بات سُنیں گی۔" یاور نے جیسے التجا کی۔

"جی۔ سُنایئے۔" اُسے ہنسی آ گئی۔

"یہ آپ کی آپا تو آپ کے بارے میں بڑی غلط باتیں کرتی تھیں۔"

"مثلاً۔"

"آپ چڑچڑی ہیں' بیمار ہیں' نحیف و نزار ہیں' غصے کی تیز ہیں۔ پڑھنے کی چور ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

"حیرت ہے کہ ان کی غلط باتیں آپ کو صحیح کیسے لگیں۔" وہ متانت سے ہنستے ہوئے بولی۔

"آپ کو دیکھ کر۔"

"مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے۔"

"یہ مجھ سے پوچھیے۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے کالج جانے میں خاصی دیر ہو گئی ہے۔" یاور کی آنکھیں جب اُس کے دل کی چغلی کھانے لگیں تو اُس نے اُٹھنا مناسب سمجھا۔

جب آپا نے یاور کو چھمو کے آگے پیچھے گھومتے دیکھا۔ تو وہ بھی کچھ سوچ کر خوش ہو گئیں۔

"چھمو۔ تجھے یہ یاور کیسا لگتا ہے؟" وہ ابھی کالج سے تھکی ہاری آئی تھی کہ آپا نے اس کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے پوچھ لیا۔

"مجھے کیا پتہ۔" وہ کن سوئیاں لیتے ہوئے یاور کو دیکھ کر مسکرائی۔

"اچھا خاصا خوبصورت بندہ ہے' ٹھیک ٹھاک پوسٹ پر ملازم ہے۔ یاور کی وجاہت کا خاندان بھر میں ڈنکا ہے۔" انھوں نے سلاد بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپا۔ آپ اپنے دیور کی تو اتنی خوبیاں اس روانی سے بیان کر رہی ہیں جیسے آپ کی بہن

کوئی گئی گزری لڑکی ہو۔ میں کیا کم خوبصورت ہوں۔" اس نے اپنے خوبصورت بال ایک ادا سے جھٹکے۔ زبیر سے محبت کے اعجاز نے اس میں خود اعتمادی بخش دی تھی۔

"ہاں...... تو تو بہت پیاری ہو گئی ہے۔ شہزادیوں جیسا تو تیرا بانکپن ہے۔ میں تو تیرے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"کیوں نہیں سوچ سکتی تھیں۔" اُسے آپا پر تاؤ سا آ گیا۔

"اس لیے کہ تُو نے اپنے حسن کا سارا خزانہ ایک ساتھ ہی شو کرایا ہے۔" وہ اُسے ناراض دیکھ کر ہنستی چلی گئیں۔

"اچھا تو کیا پہلے...... میں ایویں سی تھی۔" اُس نے برا منایا۔

"یہ میں نے کب کہا ہے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک سی گئیں۔

"ارے آپا جان۔ آپ کیا میرے بارے میں سوچ سکتی ہیں۔" اُس نے بے پروائی سے اپنے شانے اچکائے۔

"اُفوہ...... تُو تو بے کار میں ناراض ہو جاتی ہے۔ میری جان' میری گڑیا سی بہن۔ اب جو میں تیرے لیے اتنا ڈھیر سارا سوچے چلی جا رہی ہوں' وہ تجھے اچھا نہیں لگ رہا۔"

"جی ہاں۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔" وہ واش بیسن سے ہاتھ دھو کر نیچے قالین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"کیا اچھا ہوا۔" اُس نے کن انکھیوں سے یاور کو دیکھتے ہوئے چندرا کو پوچھا۔

"ارے میری رانی۔ تو مجھے یہ بتا کہ یاور تجھے اچھا لگا یا نہیں۔" آپا نے بھی اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دوٹوک پوچھ لیا۔ "ہاں اچھا تو ہے اور اچھا لگا بھی......" وہ یاور کو کانی نظروں سے دیکھتے ہوئے شرارت سے قدرے بلند آواز میں بولی۔

"پھر تیری شادی کروا دوں اُس سے۔"

"کیوں بھئی؟"

"میری دیورانی بن کر ہمیشہ میرے پاس بھی رہے گی۔ سُسرال کا بھی کوئی جھنجٹ نہیں ہے اور پھر میرا دیور۔ یاور ایک بہترین لڑکا ہے۔ بہت پیاری عادتوں کا مالک ہے۔ بہت نیک ہے' رحم دل ہے' دل بھی بڑا ہے اُس کا۔"

"آپ کی تقریر کب ختم ہو گی۔ آپا آپ کچھ زیادہ نہیں بولنے لگیں؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ شادی سے پہلے اتنے دلائل کے ساتھ تو نہیں بولا کرتی تھیں۔" وہ تمسخر سے بولی۔

"دیکھ چھمو۔ بات کو ٹال مت، صاف صاف جواب دے۔"

"فکر مت کریں۔ دھوبی سے دھلوا کر جواب دوں گی۔ ایک دم صاف ستھرا۔" وہ پھر شوخ ہو کر اینگے بینگے جواب دینے لگی۔

"چھمو...... میں انتہائی سنجیدہ ہوں۔ تجھے لطیفے سُنانے نہیں بیٹھی ہوں...... جو میں پوچھ رہی ہوں اُس کا دوٹوک جواب دو۔" آپا کو بھی غصہ سا آ چلا۔

"جی فرمایئے۔"

"یاور اچھا ہے نا......؟"

"ہاں اچھا ہے؟"

"پھر تیری شادی کرادوں اُس سے......؟"

"جی نہیں......"

"ارے جب اچھا ہے تو منع کیوں کر رہی ہے۔"

"میں منع تو نہیں کر رہی۔" اُس نے اپنی پھوٹتی ہوئی ہنسی چھپائی۔

"منع بھی نہیں کر رہی، ہامی بھی نہیں بھر رہی۔ بھئی تو آخر چاہتی کیا ہے۔" زچ ہو کر آپا بھنا اُٹھیں۔

"بس...... ابھی نہیں۔"

"ارے باؤلی۔ جب لڑکا اچھا ہے اور لڑکا بھی اپنی شادی کے سلسلے میں پاکستان آیا ہے تو دیر کا ہے......؟"

"افوہ...... آپا۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میں پہلے یہ تو دیکھ لوں کہ یاور صاحب میرے عشق میں کتنے درجے محبت افورڈ کر سکتے ہیں۔"

"چلو شادی سال بھر بعد کر دیں گے، اتنے میں سائرہ بھی امریکا سے آ جائے گی۔ فی الحال رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ اتنے تم محبت کے درجے اور زاویے بھی جانچ لو۔" آپا نے ہنس کر کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے آپا۔"

"آل رائٹ بھابی۔" یاور بھی سائیڈ سے نکل کر اُس کے سامنے آ گئے۔ خوشیاں ان کے چہرے پر رقصاں تھیں اور آنکھیں محبت سے معمور...... چھمو کے چہرے پر گڑی تھیں۔ تب وہ بُری طرح شرما کر بھاگی۔ جلد ہی اُس کی یاور کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ جہاں وہ زبیر کے محبت کے تحفے اسٹور کے براؤن بکس میں چھپاتی تو یاور کے تحائف الماری کے سیف میں رکھتی۔ اور خالی اوقات میں دونوں کے تحائف دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ اُن دنوں خوشیاں اُس پر بہت

مہربان تھیں۔ وہ ہمہ وقت چہکتی پھرتی۔ جب سے اُس کی منگنی یاور کے ساتھ ہوئی تھی۔ یاور کے ساتھ خوب گھوم پھر کر ہشاش بشاش سی رہتی تھی۔

"بھابی...... میں تمام عمر آپ کا شکرگزار رہوں گا۔" یاور علیحدہ آپا کا احسان مان رہا تھا۔

اور آپا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چھمو کا رشتہ یاور کے ساتھ ہی طے ہو جائے گا۔ وہ تو سعودی عرب میں بیٹھ کر یاور کے لیے نہ جانے کون کون سی لڑکیوں کے بارے میں گھنٹوں سوچا کرتی تھیں۔

چھمو کی بیماریوں اور اس کے چڑچڑے پن کے قصے انھوں نے یاور کے سامنے اتنی دفعہ دُہرائے تھے کہ اُس کو رٹ چکے تھے۔ اور اب وہی بہن کتنی آسانی سے یاور کے دل کو فتح کر چکی تھی۔

یاور چھمو کے دیوانے سے نظر آ رہے تھے۔

"بھابی۔ نکاح اور رخصتی اسی ماہ کر لیجیے۔ سائرہ باجی جب ایک سال بعد آئیں گی تو ہم ان کے سامنے اپنا ولیمہ کر لیں گے۔"

"اب اتنے بے صبر بھی نہیں بنو۔ ایک سال چٹکی بجاتے ہی گزر جائے گا۔" آپا نے اُسے سمجھایا۔

"آپ کا گزر جائے گا، ہمارا تو اتنی آسانی سے نہیں گزرے گا۔" وہ روٹھ کر بولا۔

"افوہ۔ یہ عاشقوں والی ایکٹنگ میرے سامنے تو کرو نہیں۔" آپا کو اس کے انداز دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

ایف ایس سی کرنے کے بعد چھمو نے بی ایس سی آنرز میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ زبیر بھی اُس کے پیچھے پیچھے۔ یونیورسٹی میں آ گیا اور ایم اے انگلش میں ایڈمیشن لے بیٹھا۔

وہ شمونہ کے بغیر ایک پل بھی گزارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

چھمو۔ اُس کے دل کی رانی تھی...... اور وہ اس رانی کو اپنی دل کی تمام تر صداقتوں سے چاہ رہا تھا۔ اُس کے تمام تر خواب...... شمی کے وجود سے قائم تھے۔ ادھر چھمو کو یونیورسٹی کا ماحول کالج سے زیادہ دلفریب لگ رہا تھا۔ زندگی کی شوخ رنگی یہاں زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

جاذب سیر۔ آنرز فائنل کا سب سے وجیہہ اور ذہین لڑکا تھا۔ جب جاذب نے گہری نظروں سے شمونہ کے دل کے دروازے پر دستک دی تو چھمو نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ تو زبیر اور یاور سے بھی بانکا سجیلا تھا۔ اُس کی نہ صرف کار بہت قیمتی تھی بلکہ اُس کی رہائش بھی انتہائی پوش

علاقے میں تھی۔ اور سب سے خوبصورت بات یہ کہ وہ بھی اُس کی محبت کا طلب گار تھا۔

تب اُس نے زبیر سے چھپ چھپ کر جاذب سے ملنا شروع کر دیا۔

"کہاں ہوتی ہو تم آج کل؟ میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جاتا ہوں۔" زبیر اُس کو دیکھ کر شکووں کے ڈھیر لگا دیتا۔

"اُف۔ ناراض ہو گئے۔ خدا کے لیے اس عادت کو چھوڑ دو۔"

"تم مجھے تڑپاتی رہا کرو۔ تم جانتی ہو کہ روزانہ تمہیں نہ دیکھوں تو دن عجیب بے کلی میں گزرتا ہے۔" وہ ناراضگی سے کہتا۔

"میں جانتی ہوں زبیر! بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔"

"پھر بھی مجھے ستاتی ہو۔" وہ روٹھ جاتا۔

"پلیز ...... پہلے مسکراؤ زبیر! ورنہ میری جان نکل جائے گی۔ میں تمہاری ناراضگی قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ مسکرا دیتا۔

تب وہ اپنی دلفریب باتوں سے اُس کی تمام شکایات کا انتہائی متانت سے جواب دیتی۔

"اللہ زبیر...... سوچو تو۔ تم صرف میرے دیوانے نہیں ہو۔ میں بھی تمہاری دیوانی ہوں۔ مگر یہ تو سوچو میرے ٹیسٹ ہو رہے ہیں...... لائبریری میں پڑھتی رہتی ہوں۔ گھر میں آپا آئی ہوئی ہیں۔ وہاں معروفیت بہت زیادہ ہے۔ پلیز! میری معروفیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مجھے معاف کر دو۔" وہ اُس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیتی۔

"ہُش۔ یہ ہاتھ نہ جوڑا کرو۔" وہ اس کی سفید ہتھیلیاں اپنی آنکھوں سے لگا لیتا۔

"پھر۔ تم ناراض جو ہو جاتے ہو۔" وہ ملال بھرے لہجے میں کہتی۔

میں اپنی زندگی سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔"

"ایمان سے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی۔

"تمہاری قسم۔" تب وہ شرما سی جاتی۔

"زبیر! کل جمعہ ہے۔ میں افروز کے ہاں جاؤں گی۔ تم بھی وہیں آ جاؤ۔" وہ اُس کو مزید خوش کرنے کے لیے پروگرام بناتی۔

"مجھے اپنی آپا اور بھائی سے ملواؤ نا۔ امی کو میرا سہرا دیکھنے کی جلدی ہے۔"

"ابھی نہیں زبیر۔" وہ گھبرا جاتی۔

"کب تک ٹالتی رہو گی۔ اگر امی نے کوئی لڑکی منتخب کر لی تو تم تاپتی رہ جانا۔" وہ جل جاتا۔

"نہیں زبیر۔ ایسی باتیں۔ آئندہ مجھ سے مت کرنا۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر لاتی۔

"اُفوہ۔ اب رو تو مت۔" وہ اُس کے آنسو پونچھتا ہوا کھسیا جاتا۔

"تمہیں پتہ ہے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟" وہ سسکیاں بھرتی۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔"

"پھر وعدہ کرو۔ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کرو گے۔"

"آل رائٹ مادام!"

"کل افروز کے ہاں مل رہے ہو؟"

"بالکل! آپ کہیں اور میں نہ آؤں۔" وہ سر جھکا کر شرارت سے کہتا۔

"پھر میں بھی شاکنگ پنک سوٹ میں آ رہی ہوں۔"

"وری گڈ۔ سو کائنڈ آف یو۔" وہ اپنے من پسند رنگ کا ذکر سن کر جھوم جاتا۔

"تو اپنی پسندیدہ پرفیوم۔" خوبصورت ریپر میں پیک بیش قیمت پرفیوم اس کے پرس میں منتقل ہو جاتا۔

تب وہ خوشی خوشی اُسے خدا حافظ کہہ کر جاذب کی طرف چل دیتی۔ جو لائبریری میں ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کر رہا ہوتا۔

"شمونہ......"

"ہوں۔"

"میری باجی نے تمہاری تصویر دیکھ لی۔"

"کیوں دکھائی تم نے اُنھیں میری تصویر؟"

"بس میری مرضی۔" وہ شرارت سے ہنستا۔

"پھر اب کیا بات ہے؟"

"اب میری باجی کا فرمان ہے کہ اس تصویر والی کو کان سے پکڑ کر گھر لے آؤ۔" وہ شوخی سے کہتا۔

"اے، بکواس نہیں کرو زیادہ۔ میرے نوٹس لاؤ۔ پڑھائی کا بہت نقصان ہو گیا ہے۔ فیل ہو گئی تو کرکری ہو جائے گی۔ اور اس کے سارے ذمے دار صرف تم ہی ہو گے جاذب! صرف اور صرف تم۔"

"ہاں ہاں...... سارا الزام میرے سر دے دو۔ پورے دن میں بہ مشکل ایک دو گھنٹے تم سے بات ہوتی ہے۔"

"اللہ! یونیورسٹی میں آ کر۔ دو گھنٹے آپ کے لیکچرز سننا کیا آسان کام ہے بھلا۔ فیل نہیں ہوں گی تو اور کیا ہوں گی؟"

"مجھے پورا یقین ہے کہ ہماری شمی ماشاء اللہ اتنی ذہین وفطین ہے کہ ہرگز فیل نہیں ہو سکتی۔"

"اور کیا کیا یقین ہے۔" وہ اس کو دیکھ کر ہنستی۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ میری باجی کے تمہارے گھر جاتے ہی ہماری شادی کے جلد ہونے کی کوئی سبیل نکل آئے گی۔"

"بھئی جاذب! بور نہیں کرو۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے' وہ اُسے ٹالتی۔"

"میں نے تمہاری تصویر جب باجی کو دکھائی تو معلوم ہے کہ ہماری باجی جان نے کیا کہا۔"

"کیا کہا؟"

"وہ کہہ رہی تھیں کہ شمی صاحبہ بہت پیاری پیاری سی ہیں۔ ہمارے پیارے سے بھائی کے ساتھ خوب جچیں گی۔ لہٰذا فوراً منگنی یا نکاح کر دیا جائے اور رُخصتی تمہاری تعلیم کے اختتام پر ہو جائے گی۔ تب تک میں بھی پاپا کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹانے لگوں گا۔"

"ابھی نہ میں کہیں جا رہی ہوں اور نہ تم...... پھر ایسی جلد بازی سے فائدہ؟"

"پتا نہیں' تم کیسی عجیب لڑکی ہو۔ یہ جلد بازیاں تو لڑکیوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔ تم تو بہت عجیب ہو شمعونہ۔" جاذب کو غصہ ہی تو آ گیا۔

"ہاں' میں عجیب وغریب قسم کی لڑکی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"بہت نقصان اُٹھاؤ گی۔" وہ کلس کر بولا۔

"میں محبت میں نفع ونقصان نہیں سوچتی۔"

"اب بے کار کی باتیں مت کرو۔ بس کسی بھی دن باجی تمہارے ہاں آئیں گی۔"

"میری بات سمجھا کرو جاذب۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"تمہاری باتوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ تم کبھی وقت اور موقع کی نزاکت کا خیال نہیں کرتی ہو۔"

"میں تو یہ جانتی ہوں کہ جلد بازی کسی چیز کی بھی اچھی نہیں۔"

"یہ جلد بازی نہیں ہے۔ یہ اپنی زندگی کا فیصلہ ہے۔"

"اُفوہ۔ اب اتنی سی بات پر ناراض تو مت ہو۔" وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"شمی جی! یہ بات تمہارے لیے اتنی سی ہو گی۔ میرے لیے بہت بڑی ہے۔" وہ غصے میں' کی رنگ' اٹھا کر فوراً چل دیا اور غصے کی بات بھی تھی۔ وہ جب شادی کا ذکر کرتا۔ شمعونہ آئے ٹالے

میں اُسے اصل موضوع سے ہٹا دیتی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

"ایک شام وہ لان میں آپا اور یاور کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے چائے پی رہی تھی کہ جاذب کے گھر والے آ گئے۔

چھمو ابھی اُنھیں صحیح طرح پہچان بھی نہیں پائی تھی کہ ان کی اماں نے چھمو کو پیار کرتے ہوئے مٹھائی کی ٹوکری آپا کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" آپا حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

"اپنے جاذب کا رشتہ لائی ہوں۔ شمعونہ کے لیے۔" وہ مسکراتی نظروں سے چھمو کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

یاور۔ خواتین کو دیکھ کر پہلے ہی کمرے میں جا چکا تھا۔ چھمو نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اندر بھاگنے کی ٹھانی۔

"شمعونہ کے لیے آپ رشتہ لائی ہیں مگر میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔ کس کے توسط سے آپ ہمارے ہاں آئی ہیں؟"

جاذب کی ماں انتہائی استعجاب سے ان کو دیکھتے ہوئے بولیں۔" کمال ہے آپ جاذب کو نہیں جانتیں۔" ان کی حیرانی بجا تھی۔

"معاف کیجئے۔ میں یہ نام پہلی دفعہ سُن رہی ہوں۔"

"حیرت ہے مجھے...... شمعونہ اور جاذب دونوں ایک یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ بچوں کی دل کی بات ہم بڑے بھی مان لیں اور فی الوقت ان دونوں کا نکاح کر دیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" آپا حیرت اور شرمندگی سے زردسی پڑ گئیں۔

"کیوں' آپ کو شمعونہ نے کچھ نہیں بتایا کیا۔ میرا بھائی جاذب تو ہر روز کی روداد مجھے سُناتا تھا۔" جاذب کی باجی بڑے فخر سے بولیں۔

تب چھمو اپنا فق چہرہ لیے اندر بھاگ گئی۔

"اس کی تو منگنی ہو چکی ہے۔" آپا اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

"اچھا...... یہ کیسی منگنی ہے کہ شمعونہ نے کبھی جاذب سے اس کا ذکر تک نہیں کیا' کیا آپ نے زبردستی یہ رشتہ طے کیا ہے؟" ان کی باجی نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"جی نہیں۔ یہ سب اس کی پسند پر ہوا ہے۔" آپا نے یہ کہتے ہوئے اپنی نظریں جھکائیں۔ مارے شرمندگی کے ان کا برا حال تھا۔

"کمال ہے۔ اب تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ پہلے لڑکے فلرٹ کرتے تھے۔ اب لڑکیاں کرنے لگی ہیں۔"

"اے ہے! بے وقوف بنانے کے لیے میرا بچہ ہی رہ گیا تھا۔" جاذب کی ماں، بہن کے جملے تھے کہ پتھر۔ آپا لہولہان سی ہوگئیں۔

جاذب کے گھر والے بغیر چائے پیے۔ نخوت سے بکتے جھکتے چلے گئے اور چھمو نے مارے ندامت کے آپا کے سامنے آنا چھوڑ دیا۔

"بھابی۔ یہ مٹھائی کا ٹوکرا...... ! کون خواتین آئی تھیں۔" یاور نے گم صُم سی آپا سے پوچھ ڈالا۔

تب جاذب اور شمعونہ کے عشق کی بات گول کر کے صرف رشتے کے بارے میں بتا دیا۔

"آپ نے بتا دیا نا کہ ان محترمہ کے جملہ حقوق محفوظ ہو چکے ہیں۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں نے بھی کہہ کر ان سے اپنی جان بہ مشکل چھڑائی ہے۔"

"مگر آپ اتنی چُپ چُپ سی کیوں ہیں؟"

"ارے وہ کم بختیں میری جان کو آ رہی تھیں کہ چھمو کا رشتہ ان کو دوں۔ اُنھیں وہ بے حد پسند آ گئی تھی۔"

"جب ہی تو کہتا ہوں کہ فوراً ہماری شادی کر دیجئے۔ یہ کیا ایک سال کی بیخ لگا دی ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کی کل کل سے موڈ علیحدہ آف ہوتا ہے۔" وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولا۔

"اب اتراؤ نہیں تم۔ بس صرف ایک سال کی بات ہے۔ انشاء اللہ سائرہ کے آنے پر ہم چھمو کے فرض سے فارغ ہو جائیں گے۔ یہ سب سے چھوٹی بہن ہے ہماری۔ ہم لوگ خوب چاؤ سے اس کی شادی کرنے کے تمنائی ہیں۔"

ابھی جاذب والے واقعے کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک شام زبیر کے گھر کے لوگ۔ اُس کا رشتہ لے کر ان کے ہاں آ گئے۔

اُس شام بھیا بھی گھر پر تھے۔

"جب لڑکی، لڑکا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں، بلکہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہ کریں تو گھر والوں کو اُن کی خواہش کو مقدم رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ شریعت کا بھی تقاضا ہے اور صحیح اصول بھی ہے۔" اُن کے والد نے بڑی متانت سے بھیا سے بات شروع کی۔ تب آپا اور بھیا اُن کا مفہوم سمجھ کر ایک ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئے۔

بھیا کو آپا نے جاذب کے رشتے کی تفصیل سے آگاہ پہلے ہی کر دیا تھا۔ اب زبیر کا رشتہ

ایک مزید تازیانہ بن کر آیا تھا۔ شمعونہ۔ اس قدر عشق میں خود کفیل ہوگی یہ بات بھیا اور آپا نے سوچی بھی نہ تھی۔ کہ وہ خوب دھڑلے سے ایک ساتھ تین تین عشق نبھائے جا رہی تھی۔ زبیر کے گھر والوں کو تو فی الوقت آپا اور بھیا نے بہ مشکل ٹالا۔ مگر بعد میں چھمو کی کھنچائی خوب کر ڈالی۔

"چھمو! تم نے عشق و محبت کو کیا گاجر مولی سمجھ رکھا تھا۔ کیوں بے وقوف بنایا۔ تم نے لوگوں کو......؟"

تب وہ روتے ہوئے بولی۔

"آپا۔ میرے دل کا ایک والو خراب ہے۔ میں کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔"

"دل کے خراب والو کا عشق سے کیا تعلق......؟" بھیا نے جھاڑ پلائی۔

"بہت گہرا تعلق ہے۔" وہ مسلسل سسکتے ہوئے بولی۔ "میں نے سوچا کہ عشق کروں تو کم از کم دو تین سے تو کروں کہ ایک دغا دے جائے تو دوسرا سنبھالا دے دے، دوسرا کم ظرف نکلے تو تیسرا مجھے سنبھال لے۔"

"اُفوہ۔ اگر یہی بات تھی تو ایک درجن کرتیں تاکہ جب عاشقوں کی تاریخ مرتب کی جاتی تو تمہارا نام سب سے پہلے اس میں درج ہوتا۔" آپا جل کر بولیں۔

"مگر میں بیوفائی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتی تھی نا۔"

"اب یہ بے عزتی کون سمیٹے گا۔ یاور کو پتہ چلے کہ اُس کی منگیتر ایسی خوش فعلیاں کرتی پھر رہی ہے تو وہ بھی منگنی کی انگوٹھی تمہارے منہ پر مار کر چلا جائے گا۔"

"ایسا نہ کرنا آپا۔ یاور کو پتہ نہ چلے۔"

"حد ہوگئی بے غیرتی کی کہ یاور بھی پسند ہے۔"

"زبیر بھی برا نہیں لگتا۔"

"اور جاذب کے لیے بھی دل دھڑکتا ہے۔"

"آپا...... پلیز...... مجھے شروع سے ہی اتنی محبتیں ملیں کہ میں محبتیں بٹورنے کی عادی ہوگئی تھی۔"

"اس کی فوراً یاور سے شادی کر دو۔" بھیا نے فیصلہ سُنایا۔

"ہاں یہی اس کے لیے بہتر ہے۔"

"مگر سائرہ باجی تو امریکا ہیں سال بھر بعد آئیں گی۔" وہ پھر بیچ میں بول پڑی۔ حالانکہ چہرہ گلگوں ہو رہا تھا۔ کچھ تابڑ توڑ ڈانٹوں سے۔"

"پھر بیچ میں بولیں تم۔ اب پردہ کرو یاور سے۔ یونیورسٹی میں بہت پڑھ لیا۔ اب کے جمعے

کو تمہاری شادی ہو رہی ہے۔"

"اس جمعے کو......!" وہ پھر حیران ہوئی۔

"ہاں اور کیا۔ شادی میں دیر ہوئی تو اور نہ جانے کتنے رشتے دار آ جائیں۔ پُرانے حوالہ جات کے ساتھ۔"

"اللہ! آپا' اب ایسا بھی نہیں کہیں۔" وہ کھسیائی۔

"اور کیا...... تمہارے دل کا ایک والو خراب ہے۔ صدمہ تم برداشت نہیں کر سکتیں۔" آپا نے طنز کیا۔

"مجھے تو حیرت ہے کہ بیماری کے زمانے کی اُلٹی سیدھی باتیں یاد ہیں۔ یہ نہیں سوچا کہ اب محترمہ ماشاء اللہ خوب صحت مند ہیں۔ ایسی اوندھی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔" بھیا نے غصے میں سنائیں۔

"اللہ۔ آپ لوگ معاف کر دیجئے نا۔" وہ پھر رونے کے لیے پر تولنے لگی۔

"اب بے کار میں رونے کی ضرورت نہیں ہے' جو تمہیں کرنا تھا۔ وہ تم کر چکیں۔ غضب خدا کا! ایسے بھی کوئی کرتا ہے۔" آپا کا جلال کم نہیں ہو رہا تھا۔

"پلیز آپا! میں معافی مانگ رہی ہوں نا۔" وہ چپل کی نوک سے دوسرا پیر کھجاتے ہوئے بولی۔

"لڑکیوں سے بے جا پیار۔ ان کی شخصیت کو یکدم تباہ کر دیتا ہے۔" بھیا ملال بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیوں کیں۔ آپ لوگوں نے مجھ سے اتنی محبتیں۔ کیوں لٹانے محبت کے دریا مجھ پر۔؟" وہ چڑ کر بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ واقعی غلطی ہماری ہے۔ ہر چیز کی انتہا' واقعی نقصان دہ ہوتی ہے۔"

"رملہ آپا! آپ میری شادی اتنی جلدی نہ کیجئے۔ سائرہ باجی کا تو انتظار کر لیجئے۔" اُس نے خوشامد کی۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے' اگر ہم نے ایسا کیا' تو یہ ہمارا غلط فیصلہ ہوگا......؟"

"کیوں بھلا؟"

"تمہاری شادی اب جتنی جلدی ہو جائے۔ نہ صرف تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ بلکہ ہمارے لیے بھی۔" بھیا انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

"اب تو شادی کے موضوع پر تقریری مقابلہ کرتی رہے گی' یا اپنے کمرے میں جائے گی۔"

آپا نے ہنس کر کہا۔

تب یاور کو سامنے سے آتا دیکھ کر وہ بے طرح اپنے کمرے میں دوڑ گئی۔ اُس کو اس انداز میں بھاگتا دیکھ کر وہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔ اٹیچی کیس رکھ کر' پہلا جملہ جو اُس نے کہا۔ وہ یہی تھا۔

"بھابی۔ یہ شمی کو کیا ہوا۔؟"

"کچھ نہیں ہوا اُسے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"نہیں کوئی بات ہے ضرور۔"

"تمہارے لیے زبردست خوش خبری ہے۔"

"پھر مجھے بتایئے۔ آخر ایسی کیا بات ہے۔؟"

"یہ خبر تمہیں بھیا سنائیں گے۔ فی الحال سفر کی تکان دور کرو۔"

گھر میں ہر شخص خوش تھا۔ اس فیصلے سے۔ سب بے حد مگن تھے۔

ابا میاں جو اپنے کمرے کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بھی خوشی خوشی کام میں حصہ لے رہے تھے۔

وہ سوات کی سیر سے ایک ہفتے بعد لوٹا تھا۔ گھر میں بڑھتی ہوئی چہل پہل سے حیران تھا اور جب بھیا نے اُسے خوشی کی خبر سنائی تو وہ اچھل اُٹھا۔ بھابی کا منشور تو قطعی تبدیل ہو گیا تھا۔ کہاں تو رملہ بھابی سال بھر سے پہلے مان کر نہیں دے رہی تھیں۔ اور اب وہ ایک ہفتے کے اندر شادی کرنے پر تیار تھیں۔

"سویٹ بھابی جان! آپ نے تو واقعی حیران کر دیا۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"اپنے اچھے سے دیور کی بے تابی دیکھی نہیں گئی۔" وہ شرارت سے بولیں۔

"واقعی......؟"

"اور کیا......!"

"مگر یہ شمونہ کہاں چھپ گئی ہے۔ کل سے نظر ہی نہیں آ رہی۔ بس آتے سے دیکھا تھا۔ محترمہ مجھے دیکھ کر قلانچیں بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ گئی تھیں۔"

"اب وہ تم سے پردہ کرے گی۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں بھلا۔"

"یہ پردے کی کیا تُک ہے بھلا۔ ایک گھر میں رہ کر بھی کہیں پردہ ہوتا ہے۔"

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں ہوتا۔ کرنے والے کر لیتے ہیں اور تمہیں تو اب خوش ہونا چاہیے کہ اب شادی تمہاری خواہش کے مطابق جلدی کی جا رہی ہے۔ یاد رکھنا۔ بھابی کا یہ احسان!"

"ایمان سے بھابی...... آپ نے خوش کر دیا۔ اور آپ کا یہ احسان تو تا زندگی یاد رکھوں گا۔"

"یاور! احسان کی بات نہیں ہے۔ تم مجھے اپنے بھائی کی طرح عزیز ہو چھمو کے لیے تم سے بہتر لڑکے کا انتخاب ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ تم بہترین ہو اور لوگ اُس کے لیے رشتے لیے چلے آ رہے تھے۔ منگنی شگنی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے تھے اس لیے ہم سب نے یہی سوچا کہ کیوں نہ ہم اس کی شادی سے ہی نمٹ جائیں۔"

"بالکل صحیح فیصلہ کیا آپ نے...... یہ لیں بٹوا میرا۔ میری جانب سے آپ جو چاہے شاپنگ کریں۔" وہ فراخدلی سے بولا۔

"میرے خیال سے زیادہ پیسے خرچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے بھی تمہارے ساتھ سعودی عرب جانا ہوگا۔ بس کپڑے اور زیور لے لیتے ہیں۔ خواہ مخواہ گھر داری کی چیزیں لینے سے پیسوں کا ضیاع ہوگا۔"

"آپ کی مرضی۔ مگر کپڑے آپ ٹھیک ٹھاک لیجیے گا۔ کہیں پیسوں کے ضیاع کے چکر میں چالو کپڑے لے لیں اور شمی میری جان کھائے۔" وہ ہنستا ہوا بولا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔" رملہ آپا سنجیدگی سے بولیں۔

"میرا مطلب یہی ہے کہ آپ جو بھی شمو کے لیے شاپنگ کریں اُس کو ساتھ لے کر جائیں۔"

"بھئی! میں نے صرف ایک دفعہ اُسے اپنے کمرے میں جانے کو کہا تھا مگر اب وہ جا کر ایسی بیٹھی ہے کہ وہاں سے اُٹھنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ بہت ضدی ہے وہ۔"

"اچھا تو پھر آپ خوب شوخ رنگ کے پانچ' سات غرارے' خوب بھاری بھاری کام کے لائیے گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال سے اتنے بھاری جوڑے غیر ضروری ہوں گے۔ لڑکیاں کہاں پہنتی ہیں۔ یونہی پڑے رہ جاتے ہیں۔"

"بھابی! پھر آپ رہنے دیجیے۔ کپڑے میں خود خرید لوں گا۔ مجھے زیادہ معلوم ہے کہ شمو کو کیسے کپڑے پسند ہیں اور میں یہ ارمان اُس کا پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جو دل چاہے کرو۔ تم جانو اور شمو۔ مجھے کیا پتہ کہ تم لوگوں کی پسند کس کس نوعیت کی ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو چھمو کو اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے جاؤں۔؟" یاور اُسے

کبھی شمو اور کبھی چھمو کہتا تھا۔

"پوچھ لو۔ اگر وہ جاتی ہے تو چلی جائے۔"

تب یاور...... دستک دے کر اُس کے کمرے میں آ گیا۔ یاور کو دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"چھمو۔ اس قدر پردہ۔" وہ پاس آ کر سرگوشی میں بولا۔ لہجے سے محبت امرت کی طرح ٹپک رہی تھی۔

"آپ یہاں سے جائیے۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"مگر میں تو بھابی کی اجازت سے یہاں آیا ہوں۔"

"پلیز چلے جائیں نا۔" وہ ہاتھ ہٹا کر نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

"اپنی پسند کا 'سرخ ٹشو کا' کامدانی غرارہ نہیں خریدو گی؟" وہ ہنسا۔

"ہم نے اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلنا۔ اب آپ بھی باہر جائیے۔" وہ شرم سے سُرخ ہوتے ہوئے بولی۔

"بعد میں شکایت نہیں کرتی پھرنا کہ ایسا لا دیا۔ ویسا لا دیا۔" یاور شرارت سے آنکھیں دکھاتا ہوا بولا۔

"آپ جو چیز' جیسی بھی لے آئیں گے۔ وہ میرے لیے پسندیدہ ہوگی۔" وہ شرمیلے لہجے میں بولی۔

"ہُرّا! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ بیوی اس قدر فرماں بردار ملے گی ایسا تو سوچا بھی نہیں تھا۔" وہ خوشی سے چلایا۔ وہ پھر سر نہوڑا کر بیٹھ گئی۔ یاور اُس پر گہری نظریں ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ مزید کوئی بات کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔

"بی بنو نے کتنی بڑی فہرست بنا کر دی۔؟" رملہ بھابی نے اُسے چھیڑا۔

"بھئی' بہت فرماں بردار ہیں وہ۔ پورا اختیار ہمیں دے دیا ہے کہ جو ہمیں پسند ہے وہی لے آئیں' وہ شاپنگ کرنے نہیں جائیں گی۔"

"واقعی۔" رملہ آپا حیرت سے بولیں۔ "بھئی میرا تو یہ خیال تھا کہ ابھی دندناتی ہوئی باہر نکلے گی۔ دو چار برش بالوں پر مار کر اپنا بیگ کندھے پر لٹکائے گی اور تمہارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ہوا ہو جائے گی۔"

"بھابی! یہ لڑکیاں جیسی نظر آتی ہیں۔ دراصل ایسی ہوتی نہیں ہیں۔ یہ لڑکیاں ساری کی ساری بے حد معصوم' الھڑ اور بے حد جذباتی سی ہوتی ہیں......"

"ہاں یاور۔ یہ جھمو بھی بے حد جذباتی لڑکی ہے۔"

"جھمو کیا ہے۔ یہ آپ میرے دل سے پوچھئے۔ اس نازک سی لڑکی نے چھ فٹ چھ انچ کے بندے کے دل کو کیسے تاراج کیا ہے۔ اس کے سوا۔ میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔"

"یاور۔ یہ بہت لاڈ میں پلی ہے۔ اس لیے کچھ اکھڑ بھی ہے اور کچھ بدتمیز بھی۔" رملہ آپا نے اُسے ذہنی طور پر پہلے ہی تیار کرنے کی کوشش کی۔

"بھابی جان! بندے کے دل میں اتنی وسعت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی محبوب ہستی کو اس کی خامیوں سمیت قبول کرے۔ اور پھر شمی تو اتنی معصوم اور الھڑ لڑکی ہے کہ اُسے دیکھ کر تو صرف در محبت ہی وا ہوسکتا ہے۔"

"تم محبت کے گیت گاؤ۔ میں لوگوں کو انوائیٹ کرلوں۔" آپا ٹیلی فون قالین پر رکھے سب کو شادی کا بلاوا دینے بیٹھ گئیں۔

یاور۔ پاؤں پھیلاتا ہوا صوفے پر دراز ہوگیا۔ پاس رکھے ہوئے ڈیک میں اُس نے تیز میوزک لگا دیا۔ ویسے بھی خوشی میں انسان کو ہر لمحے کی شوخی ہی بھاتی ہے۔

"شکر ہے کہ تم نے اسپیکر فل والیوم پر نہیں رکھے۔" بھیا نے یاور کو چھیڑا۔

"میوزک اچھا لگ رہا ہے اس وقت......" وہ مسکرایا۔

"ایسے وقت...... سب کو ہی اچھا لگتا ہے مگر پہلے کے لوگ یہ گیت محلے والوں کو پہلے سنوایا کرتے تھے۔ جہاں شادی کا دن آیا۔ لڑکے والوں نے ریکارڈنگ کرنی شروع کی۔ بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔ یا عبداللہ دیوانہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ ان بے چارے محلے والوں کا کیا قصور ہوتا تھا کہ ان کے کان پھاڑے جائیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" یاور نے آواز مزید کم کرتے ہوئے کہا۔ بُوا کی بہو اور اس کی بیٹیاں ڈھولک لے کر جھمو کے کمرے میں بجانے لگیں۔ میکے سے جدائی کے گیت اُسے رلا رہے تھے۔

چل ری سجنی اب کیا سوچے
کجرا نہ بہہ جائے روتے روتے
بابل پچھتائے ہاتھوں کو مل کے
کاہے کو دیا پردیس دل کے ٹکڑے
آنسو لیے سوچ رہا دور کھڑا رے
چل ری سجنی اب کیا سوچے

چھوٹی بڑی سکھیاں گھر گلی انگنا
ممتا کا آنچل گڑیا کا کنگنا
چھوٹ گیا چھوٹ گیا چھوٹ گیا رے
چل ری سجنی......................

گیت سن کر اُس کی سسکیاں مزید بڑھ گئیں۔ اور بھیا اُس کے کمرے کے سامنے رک سے گئے۔ خوبصورت شہابی چہرہ' رونے سے اور سُرخ ہوگیا تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں بڑی حسین لگ رہی تھیں۔

'ماشاء اللہ اپنی جھمو نے کیسا رنگ روپ نکالا ہے۔' وہ اُسے غور سے دیکھنے لگے۔ کس قدر پیاری ہوگئی تھی وہ۔ اُسے دیکھ کر کوئی یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بچپن میں لاغر و بیمار رہی ہوگی۔ بھیا کو یوں محویت سے دیکھتا پا کر' اُس نے اپنا منہ گھٹنوں میں چھپالیا۔

ان کا اس طرح دیکھنا۔ اُسے محجوب سا کر گیا تھا۔ بُوا کی بیٹیاں ایک کے بعد دوسرا گیت چھیڑ رہی تھیں۔ میکے سے جدائی کے گیت خواہ کسی زبان میں ہوں۔ مگر سب کے جذبے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میکے سے محبت کی شدت...... ان گیتوں کو سُن کے سوا ہو جاتی ہے۔ پُرنم آنکھوں میں آنسوؤں کی قطاریں رکنے میں نہیں آتیں۔

بُوا کی بیٹیاں اب سرائیکی زبان میں کوئی گیت گا رہی تھیں اور وہ اُس کے دل کو جھنجوڑے دے رہا تھا۔ اُس کا ایک ایک لفظ اُس کے دل کو لہولہان کر رہا تھا۔ وہ اب بھی دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ مگر سب اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ کوئی اُس کے رونے کی ذرّہ برابر پروا نہیں کر رہا تھا۔

"جھمو کے رونے کی عادت کب ختم ہوگی؟" ابا میاں اُس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رملہ آپا سے بولے۔

"رونے دیں ابا۔ اُس کو...... ایسے میں تو سب ہی روتے ہیں۔" آپا فون نمبر ملاتے ہوئے بے پروائی سے بولیں۔

"مگر ہماری جھمو کا تو یہ پارٹ ٹائم شوق ہے۔ یہ تو بے وجہ بھی روتی ہے۔ کتاب رکھ کر بھول جاتی' تب روتی۔ ہاتھ میں مہندی نہ رچتی تو اُس کے پھیکے رنگ کو دیکھ کر روتی۔ کسی ضروری جگہ جانا پڑتا تو مارے آلکس کے رو پڑتی۔" ابا میاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جتنا یہ بچپن میں روئی ہے شاید ہی اتنا کوئی بچہ رویا ہو۔" بھیا ملول سے ہو کر بولے۔ اس وقت اماں کی یاد اُن کے دل میں طوفان سے پیدا کر رہی تھی۔ کاش' وہ اس وقت زندہ ہوتیں۔ تو

ان کی خوشی کا کیا عالم ہوتا۔ جگنو کو اس وقت روتا دیکھ کر وہ سب سے زیادہ کرب محسوس کر رہے تھے۔

"بھیا۔ یہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اب جگنو کی آنکھ میں ایک آنسو نہ آنے دوں گا۔" یاور نے بھیا کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے جذب سے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" آپا اور بھیا کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ آپ سب انشاء اللہ دیکھیں گے کہ وہ میرے ساتھ ہمیشہ مسکراتی رہے گی۔ میں اُس کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں آنے دوں گا۔"

تب جگنو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمڈ آئے مگر وہ اُن کو پونچھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ نئی زندگی کی ہر منزل پر وہ یاور کے ساتھ مسکراتے ہوئے قدم بڑھائے گی۔

شاداں اور فرحاں۔

❀❀❀

مہکتے رشتے

"سُوت نہ کپاس' جولاہے سے لٹھم لٹھا" والی مثال صادق آ رہی تھی...... جب کہ یہ طے تھا کہ ارسلان کی شادی میں صرف لتاں اور ابا جان شرکت کرنے جائیں گے...... مگر روبی نہ صرف شادی کے پروگرام بنا رہی تھیں بلکہ وہاں جا کر بور ہونے کے مصائب بھی یہاں بیٹھے بیٹھے برداشت کر رہی تھیں!

اللہ تایا ابا کی اتنی محل نما بڑی کوٹھی میں جا کر کس قدر گھبراہٹ ہوگی۔ یہاں تو سب کے ساتھ چاندنی پر بیٹھ کر کھانے کی عادت ہے...... وہاں میز کرسیوں پر بندروں کی طرح چڑھ کے کھانے میں پیٹ بھی نہیں بھرے گا۔ اور پھر ان کے بچے کس قدر شرارتی...... کبھی پلیٹ سے بوٹی غائب' کبھی آم...... کبھی کباب...... ایک تو مہمان بن کر جاؤ...... پھر ندیدے پن سے کھاؤ...... کس قدر بُرا لگتا ہے...... اپنا تو کسی کے ہاں دعوت میں جا کر پیٹ نہیں بھرتا...... وہاں ایک ہفتہ رہ کر تو بالکل سینک سلائی ہو جاؤنگی...... اللہ سارے کپڑے بھی بیکار ہو جائیں گے...... بیچاری اماں کو دوبارہ کپڑے بنوانا پڑیں گے...... اپنے گھر میں کھانا کھاؤ تو مزے سے آم کی پھانک چوسو...... چانپ کی ہڈی چباؤ...... وہاں تو بس شرما حضوری میں تھوڑا بہت کھایا جائے گا...... اللہ لتاں آج مجھے اکٹھی چھ بوٹیاں دے دو...... اکٹھا ہی کھا لوں...... ورنہ دیکھو...... میرا وہاں کس قدر برا حال ہوگا...... پہلے ہی ہڈیوں کی مالا ہوں...... بعد میں جانے کیا ہوگا؟"

"اے ہے...... یہ قیامت تم پر توڑ کون رہا ہے...... جو تم اس قدر پریشان ہو رہی ہو......" اماں نے کلس کر کہا...... بیکار کی بے تکی باتیں سن کر انہیں ہمیشہ غصہ آتا تھا...... اور روبی کو تو بکواس کرنے کی سدا کی عادت تھی۔

"اللہ اماں...... میں تو وہاں ضرور جاؤنگی...... پیلا سوٹ کب سے سلا...... الماری میں چار چار آنسو رو رہا ہے...... منحوس کو پہننے کی نوبت ہی نہیں آ رہی...... وہ بھی روز صلواتیں سناتا ہوگا کہ

کس کم بخت کے پاس آیا جس نے تن پر ڈال کر نہ دیا۔۔۔۔۔۔اب اتنے دنوں میں تو کوئی شادی آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ارسلان بھائی کے مایوں میں آرام سے پہن لونگی۔۔۔۔۔۔ورنہ ہو سکتا ہے کہ الماری میں پڑے پڑے ہی بیکار ہو جاتے۔۔۔۔۔۔خواہ مخواہ آپکا نقصان علیحدہ ہوگا۔۔۔۔۔۔اور مجھے نہ لے جا کر آپکو علیحدہ پشیمانی رہے گی۔!"

"اے بی پشیمانی کس بات کی۔۔۔۔۔۔آپ جا کر میرے کیا بھاگ لگائیں گی۔" لتاں کو غصّے کے ساتھ ہنسی بھی آ گئی۔!

"اللہ لتاں!۔۔۔۔۔۔ ہر چیز تو آپ رکھ کر بھول جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔وہ شادی کا گھر ہوگا۔۔۔۔۔۔جانے کہاں کہاں اپنی چیزیں گماتی پھریں گی۔۔۔۔۔۔میں ساتھ جاؤنگی تو آپ کی چیزیں کم از کم سمیٹ کر رکھتی تو رہونگی۔۔۔۔۔۔اور پھر مہندی مایوں کے ہنگامے۔۔۔۔۔۔سارے گھر کو تتر بتر کر دیتے ہیں۔ آپ تائی لتاں کا بھلا کہاں ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔۔۔۔۔۔میں جا کر کچھ نہ کچھ ان کے کام میں سہارا تو دے سکتی ہوں۔"

"کام۔۔۔۔۔۔اور روبی۔۔۔۔۔۔دو متضاد چیزیں ہیں۔۔۔۔۔۔" بڑی آپا نے ہنس کر کہا۔! "گھر کا دھندا کرنے میں تو جان جاتی ہے' دوسرے کے ہاں جا کر اپنا سلیقہ دکھائیں گی' جو دیکھے گا وہی ہنسے گا۔۔۔۔۔۔" اماں جل کر بولیں۔۔۔۔۔۔!

"اگر غلطی سے تائی اماں کے ہاں روٹی پکا لی۔۔۔۔۔۔اور وہاں سعید نے دیکھ لی۔۔۔۔۔۔تو سیدھا بھاگے گا۔۔۔۔۔۔" چھوٹی باجی نے بھی گرہ لگائی۔!

"ہونہہ۔۔۔۔۔۔آپ سے تو اچھی پکاتی ہوں۔۔۔۔۔۔اور سعید اتنا تھڑدلا نہیں ہے کہ وہ میرے ہاتھ کی موٹے کناروں کی روٹی کھا کر۔۔۔۔۔۔مجھ سے بدظن ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔!"

"نہیں بھائی۔۔۔۔۔۔وہ تو آپ کے ہاتھ کے نان کھا کر بے حد خوش ہوگا۔۔۔۔۔۔بلکہ بارہ عدد پکوا کر بھی لے کے جائے گا۔ نشانی کے لیے۔۔۔۔۔۔روز تینوں وقت نکال کر آہیں بھرا کرے گا۔۔۔۔۔۔" بڑی آپا نے شرارت سے اُسکا مذاق اُڑایا۔۔۔۔۔۔!

لتاں آپ دیکھ رہی ہیں آپا کو کیسا کیسا جی جلاتی ہیں۔ ہم نے تو انکے زمانے میں کبھی دولہا بھائی کا مذاق نہیں اڑایا۔ حالانکہ انکی شخصیت ایسی تھی کہ شکل دیکھ کر قہقہہ ابلتا تھا عجیب واہیات ہنسنے سے ہنستے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ ہچکیوں میں سُر تال بھی شامل ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔!"

"بس ہو چکی بکواس۔۔۔۔۔۔یا ابھی اور جاری رہے گی۔۔۔۔۔۔ارسلان کی شادی کے بعد۔۔۔۔۔۔سعید اپنی اماں کے ساتھ یہاں آ رہا ہے تم لوگ گھر کی صورت ٹھیک ٹھاک کرو۔ منگنی کے بعد وہ ویسے بھی پہلی دفعہ آ رہا ہے۔۔۔۔۔۔کسی کو میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

سعید کی آمد کا سنتے ہی۔۔۔۔۔۔روبی کے گالوں پر شفق سی پھیل گئی۔۔۔۔۔۔کہاں کا جانا اور کس کی شادی۔۔۔۔۔۔سب اس کو بے کیف نظر آنے لگا۔ سعید یہاں آئے گا۔۔۔۔۔۔کس قدر اچھا لگے گا۔۔۔۔۔۔اس کا منگیتر۔۔۔۔۔۔اُس کی خوشیوں کا محور۔۔۔۔۔۔جس کے نام کی انگوٹھی پہنتے ہی وہ یوں محسوس کرتی تھی۔۔۔۔۔۔جیسے وہ زندگی کے ایک چھوٹے دائرے سے دوسرے بڑے دائرے میں داخل ہو گئی ہو۔۔۔۔۔۔یہ دائرہ۔۔۔۔۔۔جو چکا چوند روشنیوں سے منور ہوتا۔ اُسے ایسا لگتا جیسے یہ منگنی سے پہلے اور منگنی کے بعد والی زندگیوں کے درمیان ایک ایسی "نومین لینڈ" کا تصور پیش کرتا ہے جس میں تمام تر وابستگی کے باوجود وہ اپنی آزادی' خود مختاری اور رائے کو برقرار رکھ سکتی تھی۔۔۔۔۔۔تب وہ رعایا ہوتے ہُوئے بھی اپنے آپکو حکمران سا محسوس کرتی۔۔۔۔۔۔!

سعید کیا آیا۔ اس کے دل میں تو پنکھے لے لگ گئے تھے۔۔۔۔۔۔کس قدر دھڑکنے لگا تھا یہ دل۔۔۔۔۔۔پہلے تو اس کی یہ دھڑ دھڑاہٹ ایسی محسوس نہ ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔خدایا۔ یہ منگنی کی انگوٹھی بھی اپنے ساتھ کیا وابستگی کا احساس لاتی ہے۔۔۔۔۔۔ساری دنیا اُسکے نگینوں میں سجی نظر آتی ہے۔ زندگی کا حُسن اپنا تمام تر بانکپن سمیٹے اسی دور میں نظر آتا ہے۔۔۔۔۔۔پھولوں میں مہک اور گالوں پر شفق اسی زمانے میں پیدا ہوتی ہے۔ اپنا آپ بھی بیگانہ سا لگتا ہے۔۔۔۔۔۔یہ حقیقت تھی' انگوٹھی کا گھیرا۔۔۔۔۔۔اس کے پورے وجود کو خیرہ کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔اور منگنی کے بعد۔۔۔۔۔۔ایک لمحے کیلئے۔۔۔۔۔۔بھی اُس نے انگوٹھی کو اپنے سے جدا نہیں کیا تھا۔ سعید۔۔۔۔۔۔اُس کو اس طرح انگوٹھی کے حصار میں دیکھتا تو شرارتوں سے باز نہ آتا۔۔۔۔۔۔اور وہ کھول کر رہ جاتی۔

آج بھی اس نے شبو کے ساتھ مل کر شرارت کی تھی۔ شبو۔۔۔۔۔۔روبی کی انگوٹھی لے کر بھاگی۔۔۔۔۔۔ایسے میں روبی کی چیخیں دیکھنے کے قابل تھیں۔ ہائے۔۔۔۔۔۔میری منگنی کی انگوٹھی۔۔۔۔۔۔اللہ شبو کی بچی دے دے نا۔۔۔۔۔۔نہیں تو میں تیرا بھرکس نکال دونگی۔۔۔۔۔۔خدا کے واسطے دے دے۔ وہ شبو کے پیچھے بھاگتے ہوئے بری طرح چلا رہی تھی۔ مگر شبو بھی ایک چھلاوہ تھی۔۔۔۔۔۔ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں اُسے نچائے نچائے پھر رہی تھی۔۔۔۔۔۔اب تو اُسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کو اپنے اسکول کے فنکشن میں پہن کہ ضرور جائے گی۔۔۔۔۔۔!

اُس کی منگنی کی انگوٹھی۔۔۔۔۔۔اس کو کوئی دوسرا پہنے۔۔۔۔۔۔یہ احساس ہی اس کے لئے اذیت ناک تھا۔۔۔۔۔۔گو شبو اُسکی پیاری سی چھوٹی بہن تھی۔۔۔۔۔۔جس کو روبی بے انتہا چاہتی تھی۔ جی بھر کر لاڈ اُٹھاتی تھی۔۔۔۔۔۔مگر اُس وقت اُس کی یہ حرکت اُسے زہر لگ رہی تھی۔۔۔۔۔۔وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ اس کی انگوٹھی کہیں گرا کر ضرور آئے گی۔۔۔۔۔۔کم بخت بے ڈھنگی تو شروع سے ہی ہے۔۔۔۔۔۔ہائے میری انگوٹھی کہیں کھو گئی تو پھر کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔؟

شبو میری انگوٹھی دے دے..... پلیز دے دے نا...... وہ چیختی چلاتی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ پاؤں بری طرح پھسلا' سعید جو سامنے دو قدم پر کھڑا تھا...... بجائے اس کے کہ اُسے سنبھالتا...... جلدی سے سامنے سے ہٹ گیا..... اور وہ چاروں شانے چت گر پڑی..... اپنی چوٹ سے زیادہ اُس کی بدتمیزی پر غصہ آیا......!

''بڑے ذلیل ہو......'' وہ غرائی......!

''کیوں' کیا ہوا..... منگیتر صاحبہ......'' وہ بڑے انداز سے ہاتھ باندھ کر بولا۔

''شرم تو نہیں آتی..... اگر مجھے پکڑ لیتے تو...... میں گرتی تو نا......!''

''جی ہاں...... آپ واقعی نہ گرتیں...... مگر پھر ہمیں شرم آ جاتی......'' ہم آپ کو یونہی گود میں لئے بیٹھے رہتے...... زمین پر اتارنے کو بھی دل نہ چاہتا......'' اس نے اپنی پھوٹتی ہوئی ہنسی کو دانتوں تلے دبا کر اداکاری دکھائی......

''سعید......'' وہ غصے سے فل والیوم میں چیخی......!

''جی فرمایئے...... آپکے منگیتر شہزادے ہمہ تن گوش ہیں......'' اُس نے پھر ہاتھ باندھ لیے...... اور سر کو مسخروں کی طرح جھکا کر کہا۔ اس کے انداز دیکھ کر وہ جل ہی تو گئی کس قدر خبیث تھا وہ۔''اللہ کرے مرو......'' وہ بد بدائی...... مگر شائد اس نے اس کی بات سن لی تھی......! دانت نکوس کر بولا۔''ارے......ارے...... ہم مر گئے تو تم منگنی کے بعد ہی منگوہ ہو جاؤ گی۔''

''یہ منگوہ کیا ہوتی ہے......؟'' اُسے ہنسی آ گئی......!

''بیوہ کی سوتیلی نواسی ہوتی ہے......'' وہ چبا چبا کر بولا۔

''اچھا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سخت غصہ آ رہا ہے۔'' وہ تنک کر بولی۔

''ارے محترمہ...... پہلے میری بات تو سنو...... میں مر گیا تو...... ساری عمر ایسی ہی بیٹھی بوڑھی ہو جاؤ گی...... کوئی پوچھے گا بھی نہیں...... وہ تو مجھے ہی یہ سوچ کر رحم آ گیا تھا کہ کرو مہربانی تم اہل زمین پر' خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر......''

''ارے مہربان تو دیکھو...... گھونچو قسم کے ہیں...... اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمیاں ہیں۔'' وہ جل کر بولی۔''ارے روبی خانم...... ہم نہ رہے...... تو تمہیں ہماری قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ انگوٹھی...... دیکھ کر اب جو تمہاری باچھیں کھلتی ہیں...... بعد میں ایک وقت میں پانچ کلو آنسوؤں سے رویا کرو گی...... کہ ہائے...... ابھی ہماری شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ جدا ہو گئے...... مرحوم ایسے تھے۔ مرحوم ویسے تھے......'' اس نے باقاعدہ رو کر عورتوں کی سی آواز نکالی کہ پاس کھڑی ہوئی شبو بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی......! شبو کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی اور آن کی

آن میں اُس پر جھپٹی اور اُس کے ہاتھ سے انگوٹھی چھین لی......!

وہ ہنستے ہوئے بولی۔'' آپی...... ہم سے سعید بھائی نے مذاق کرنے کو کہا تھا۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو گئیں۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی آپکی انگوٹھی پہننے کی......!''

اُس کے اقدام سے سعید کمینہ تو اترا ہی گیا...... اُس کے ہاتھ سے انگوٹھی لیکر بغور دیکھتا ہوا بولا......''روبی...... بہت پسند ہے یہ انگوٹھی تمہیں......؟''

''ہاں' بہت'' وہ صاف گوئی سے بولی......!

''منگنی سے بہت خوش ہو......'' اس کا لہجہ بہت تیکھا تھا......!

''بہت خوش ہوں......'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جھومتے ہوئے کہا......!

تب وہ...... پٹاخ سے آنکھیں کھول کر اُسے آتش نظروں سے گھورتے ہوئے چیخی۔''سعید صاحب...... میری پسندیدگی سے مراد...... آپ کی ذاتِ شریف ہرگز نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اوور ہوتے جا رہے ہیں۔'' روبی ناگوار لہجے میں بولی۔!

''تو پھر کون ہے وہ مردود...... وہ بھی غصے میں مٹھیاں بھینچتا ہوا بولا۔!''

''صرف یہ دو تولے کی نگینے والی منگنی کی انگوٹھی......'' وہ انگوٹھی اُس کے سامنے نچا کر بولی۔

اوہ...... یہ بات ہے' مگر بڑی لالچی ہو تم......'' اُس کی آنکھیں خوشی سے مستیاں کر رہی تھیں۔

''ہاں چلو اسی طرح سہی' مگر تمہاری کنپٹی پر کس نے پسٹل رکھا تھا۔ جو تم ہمارے ہاں آ کر منگنی رچا بیٹھے تھے۔'' وہ کلس کر بولی۔

تب وہ بڑبڑا کر بولا۔

''وہ۔ وہ...... تم میری بچپن کی مانگ ہونا۔ بس اس لیے ہی کر لی...... ورنہ......!''

''ورنہ...... کیا......؟'' وہ چیخی......!

''بھئی میرا ارادہ...... یہ منگنی کرنے کا نہیں تھا۔ بس سیدھے سادے شادی کرنے کا تھا...... یہ منگنی رچانے کا تمہیں ہی خبط تھا۔ کیوں ممانی کی بات نہیں مانی...... اب تڑپنا...... تم بھی سال بھر......'' وہ زچ ہو کر بولا......!

''اوہ...... بڑے آئے تڑپانے والے۔ ہمیں یہ شادی کا شوق نہیں ہے۔ ہمیں تو بس منگنی اچھی لگتی ہے...... خدا کرے...... ساری عمر صرف منگنی ہی رہے۔'' اس نے خوشی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی انگوٹھی کو دیکھا......!

''بی بقراطن...... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کی خاص وجوہات کیا ہیں؟'' وہ جل کر بولا۔

"ہاں ہاں سنو اور کان کھول کر سنو...... انسان نے کسی دور میں بھی شادی کی خواہش نہیں کی......

شادی کا جواء...... محض منگنی کی لذتوں سے ہمکنار ہونے کیلئے ہی کھیلا جاتا ہے جنت کی گندم کا دانہ کھانے سے قبل آدم اور حوا کی مثالی زندگی بھی اس دور کی نشان دہی کرتی ہے لیکن بدقسمتی سے وہ اس دور کی لذتوں کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکے' گندم کا دانہ چکھتے ہی منگنی کی انگوٹھیاں پھسل گئیں اور انکی جگہ شادی کی انگوٹھیوں نے لے لی...... اور اس آبادی سے ایک ایسی بربادی کا آغاز ہوا جس کے لئے انسان کو ہائیڈروجن بم تک ایجاد کرنے پڑے......!"

"واہ بھئی مان گئے تم کو...... اچھی ڈیبٹر ہو...... مگر تمہارے خیالات سن کر دھچکا سا لگا...... تم شادی کے بجائے فرینڈ شپ کی قائل ہو۔ یہ کرو...... لندن یا امریکہ میں رہائش اختیار کرلو...... وہاں شادی کے بجائے فرینڈ شپ چلا کرتی ہے۔" سعید خاصے تاؤ میں آ گیا۔

ارے سعید جی...... ! آپ کسی باتیں کر رہے ہیں۔ مغرب میں فرینڈ شپ کو آپ منگنی کی ایک میکانکی صورت تو ضرور کہہ سکتے ہیں لیکن یہ بات آپکو وہاں رہ کر بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ مغرب چونکہ مکمل طور پر مشین کی گرفت میں آ چکا ہے' اس لیے ان کی ہر سماجی' معاشرتی اور اقتصادی دوستی سے مشین کے تیل کی بو آتی ہے۔

فرینڈ شپ...... مشینی دور کی پیداوار ہے۔

اور منگنی...... فطرت کی کوکھ سے جنم لینے والا جذبہ......

صاف ستھرا......

خوشبودار

اور نکھرا ہوا عظیم جذبہ......!"

"بی بقراطن...... آپ کا یہ نکھرا ہوا عظیم جذبہ...... اپنے منگیتر سے شادی کرنے کو کیوں منع کرتا ہے۔" سعید اُس کی باتوں کی ہنسی اڑاتا ہوا بولا......!

"اس لیئے سعید صاحب...... شادی وہ کتبہ ہے جو منزل کی پیشانی پر کندہ ہے...... اور جہاں پہنچ کر سفر تمام ہو جاتا ہے اور گھر کا مقبرہ مسافر کو نگل لیتا ہے۔

شادی سے پہلے ڈل لائف اور شادی کے بعد ہنگامہ اور چق چق کے دنوں کے درمیان منگنی کا زمانہ موسم بہار کی ایسی سانولی سلونی شام ہوتی ہے...... جب ہوائیں عطر بیز ہوتی ہیں اور سانس مہک پرا!

"روبی جان...... ! میری یہ رائے ہے کہ تم اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرلو...... زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بس بُری طرح فیل ہو جاؤ گی...... کیونکہ تمہیں یہ نہیں معلوم کہ منگنی کے زمانے میں

بقول تمہارے ہوائیں عطر بیز ہوتی ہیں اور سانس مہک پرور...... ایسی ہی کسی سہانی شام میں آپکی منگنی کے برابر کے شریک آ جائیں تو اُن سے آپ گلابی باتیں کرنے کے بجائے بری طرح دھتکارتی ہیں...... جن کے طفیل آپ خیر سے منگنی یافتہ ہوئی ہیں۔" آپا نے بھی شائد ساتھ کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے انکی تمام باتیں سن لی تھیں۔ سعید کے جانے کے بعد...... وہ باہر آ کر روبی پر خوب گرجیں۔ اور بقول انکے اُسکو کسی سے بات کرنے کی رتی بھر بھی تمیز نہیں تھی...... ایسی باتیں بھی کوئی منگیتروں سے کیا کرتا ہے؟

کبھی کسی لڑکی نے ایسے کھُرتل لہجے میں اپنے منگیتر کو مخاطب کیا ہے؟

اب وہ آپا کو کس طرح سمجھائی کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور اُس کے ماحول کا تھا......!

آنکھ کھولی تو اپنے چاروں طرف لڑکیوں کی ہی کھیپ دیکھی۔ ہوش سنبھالا تو پہلی آواز کان میں منگنی کی ہی پڑی...... اُسے اب بھی اچھی طرح یاد تھا کہ جب بڑی آپا کی منگنی ہوئی تھی تو سارے گھر میں ایسی گہما گہمی تھی کہ کیا عید بقر عید پر ہوتی ہے...... سب لمّاں کو مبارکباد دے رہے تھے کہ لو آدھا فرض پورا ہو گیا...... اور آپا تو بغیر ڈور کے ہوا میں اڑ رہی تھیں......!

منگنی کے بعد کیسے ٹھسے سے کہا کرتی تھیں۔

"بہت بیکار رہے ہم' جب ہم چلے جائیں گے تو ہماری قدر معلوم ہوگی۔" مگر لمّاں تو ان کے جانے سے پہلے ہی ان کی قدر کرنے لگی تھیں۔

"ارے قدسیہ بیٹی! یہ جوس کا گلاس تو پی لے...... بڑی کمزور ہو رہی ہے آجکل......"

حالانکہ وہ شروع سے ہی ڈبلی پتلی تھیں۔

"ارے قدسیہ رانی...... ! دھوپ میں نہ بیٹھا کر رنگ جل جائے گا...... ارے کام نہ کر' تھک جائے گی......" اور پھر چٹا پٹی غرارے' بھاری بھاری کام والے سوٹ دھڑا دھڑ سل رہے تھے' مگر سب قدسیہ آپا کیلئے......!

تب وہ منہ بسور کر لمّاں سے کہتی۔

"اللہ لمّاں جان...... ہمارے غرارے پر بھی "کارچوب" کروادونا......!

"وہ جھلا کر کہتیں...... چل پرے ہٹ تیری کونسی منگنی ہوئی ہے......؟"

تب وہ منگنی یافتاؤں کو بڑے رشک سے دیکھتی...... اور ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتی۔ ریحانہ آپی کی منگنی ہوئی تو وہ بھی اترا گئیں...... اُس کو وہ اپنی باتوں میں بھی شریک نہ کرتیں۔ وہ ڈھیٹ بن کر گھستی تو ان کی ہونے والی نند بڑے نخرے سے کہتیں۔ روبی بھاگو یہاں سے' بڑوں میں نہیں

گھتے اچھے بچے...... جب تمہاری منگنی ہو گی نا...... تب ہمارے ساتھ باتیں کیا کرنا......! اُن کی باتیں سن کر' اُس کا دل جل جاتا' اور وہ سوچتی...... جب ہماری منگنی ہو گی نا...... ہم تم کو ذرہ بھر بھی لفٹ نہیں کرائیں گے' اپنے پاس نہیں آنے دیں گے...... گلابی مہکتا رشتہ جب ہمیں اپنے حصار میں لے لے گا خود ہی مسحور ہوتے رہیں گے' اس کی خوشبو بھی کہیں جانے نہیں دیں گے۔ ریحانہ آپی کی منگنی اُن کے چچا زاد بھائی سے ہوئی تھی۔ جن کا گھر ان کے گھر کے قریب ہی تھا...... سو آپی کے اور بھی مزے آ گئے۔ خالد بھائی نے انہیں ڈھیر سارے تحفے دیئے' مگر روبی کے لئے اتنے کنجوس تھے کہ مجال ہے کہ کبھی آئس کریم ہی کھلا دیں۔ آپ اُن کی سوغاتیں چھپا چھپا کر رکھتیں اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں۔ اور پھر ان کے مہکتے ہوئے خط تھے۔ کہ رومان پرور افسانے جن کو روبی چوری چھپے پڑھ ہی ڈالتی اور حیران ہو جاتی...... کہ خالد بھائی کی دنیا...... صرف اور صرف آپی میں سمٹ کر آ گئی تھی......!

اور سب سے بڑا فائدہ منگنی کا جو روبی کو نظر آیا تھا وہ یہ تھا کہ ہر عید' بقر عید پر آپاؤں کے بھاری جوڑے آتے' ڈھیر ساری عیدی آتی...... اللہ کتنے مزے ہیں ان لوگوں کے ایک ہم ہیں کہ لتاں عید پر بھی ہزار نخروں سے لالوکھیت کے بدھ بازار سے ایک ریڈی میڈ سوٹ لا کر فارغ ہو جاتی ہیں اور ایک یہ آپائیں ہیں کہ ان کے لیئے ان کی ساسیں جھل مل کرتی قمیض' چم چم کرتے تاروں بھرے دوپٹے' میک اپ کا خوب سارا سامان' بھاری بھر کم پرس سمیت لے کر آتیں اور اس پر ہی بس نہ چلتا بلکہ جب یہ ''آپائیں'' امتحان میں کامیاب ہوتیں تو تحائف چلے آتے' بیمار ہوتیں تو ایک خلقت دوڑی چلی آتی اور روبی دل مسوس کر رہ جاتی......!

ہونہہ...... موٹی چھلا سی انگوٹھی کے اتنے فائدے اٹھا رہی ہیں...... ہائے کتنی خوش قسمت ہیں' حقیقت میں خوش بخت......!

آپاؤں کی شادیاں ہوئیں تو وہ کچھ عرصے خوب خوش رہیں' مگر ڈھیر سارے اوپر تلے کے بچوں میں ساری خوشیاں پس منظر میں ڈوب گئیں اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا آپاؤں کی وہ اہمیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دفعہ اُس نے اماں سے بھی کہہ ڈالا۔

''یہ آپا لوگ اپنے سسرال میں اتنی خوش نہیں ہیں جتنی کہ ابتدائی دنوں میں تھیں۔ یا منگنی کے زمانے میں' آخر بات کیا ہے......؟

تب وہ بھی بڑی آزردگی سے بولیں۔

''اری اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے...... لاکھ وہاں خوش رہیں مگر اپنے گھر کی سی بات تو نہیں ہو

سکتی نا...... اور یہ مرد شادی سے پہلے جو چاؤ چونچلے کرتے ہیں' بعد میں تھوڑی کرتے ہیں' گھر کی مرغی دال برابر ہو جاتی ہے۔''

''ہوں یہ بات ہے۔'' اُس کے معصوم سے دل نے سوچا' اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ فائدے صرف منگنی کے ہوتے ہیں' باقی سودا قطعی نقصان دہ ہے۔ میٹرک پاس کیا' تو بہت خوش ہوئیں کہ چلو اب منگنی ہونے کا وقت آیا' مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ انکے معاملے میں کوئی نہیں بول رہا تھا جب کہ دونوں بڑی بہنوں کی منگنیاں چھٹی اور آٹھویں جماعتوں میں ہو گئی تھیں...... اب وہ گھر میں بڑی تھی۔ اس کا نمبر تھا...... گلابی عمریا میں تو ویسے بھی چھوٹے چھوٹے ارمان بہت بڑے بڑے لگتے ہیں...... مگر ابا میاں نے بھی ساری قدامت پرستی ختم کرنے کا فیصلہ اُس کے ہی دور میں کیا تھا کہ ''چیچو کی ملیاں'' چھوڑ کر لاہور میں مکان خرید لیا اور وہاں ہی سیٹ ہو گئے...... اور اس پر بس نہیں کیا بلکہ روبی کو کالج تک میں ایڈمیشن دلوا دیا...... اب تو اس کا دماغ بھائیں بھائیں کرنے لگا کہ اللہ ہمارے ابا میاں کو کیا ہو گیا......؟ انکو ہماری فکر ہی نہیں...... اتنا بھی نہیں ہوتا کہ منگنی ہی کر دی......!

ایک دن اس نے ہمت کر کے اماں سے کہا تو وہ سسکی بھر کے بولیں۔

''ہائے میں کیا کروں؟ کم بخت خاندان میں تجھ سے بڑا کوئی ہے ہی نہیں۔ یا تو بہت چھوٹے ہیں کہ اُن منحوسوں کو بیٹھ کر پہلے پالو...... یا اتنے بڑے ہیں کہ موئے بڈھے کھوسٹ۔''

''مگر آپ تو کہتی تھیں کہ شکیلہ پھوپھو نے اپنے بیٹے سعید کیلئے بچپن میں ہی مجھے مانگ لیا تھا...... اُس نے انہیں یاد دلایا......!

''مگر سعید تو اب لندن میں ہے۔'' وہ جھلا کر بولیں...... جیسے لندن ایسی خوفناک جگہ ہو جو کنوارے لڑکے کو سب سے پہلے ڈکار لیتا ہو۔

''اُن کو لکھ دو نا کہ بس آ جائیں۔!''

''جی ہاں...... میرے کہنے سے بھلا وہ آ جائے گا۔ اری اُس مقناطیسی شہر سے اچھے اچھے نہیں آتے' خدا بخشے تیرے تایا کو...... ادھیڑ عمر میں بزنس کے چکر میں صرف تین مہینے کے لیے گئے تھے۔ مگر میموں کے چکر میں ایسے آئے کہ تین سال بعد تباہ و برباد ہو کر لوٹے' مگر پھر بھی گن ان کا ہی گاتے ہوئے آئے......'

سعید تو وہاں پڑھ رہا ہے یا کسی کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہا ہے...... جنگل میں مور نا چا کس نے دیکھا...... یہاں بیٹھ کر اس کے بارے میں کیسے حتمی رائے دی جا سکتی ہے۔!''

''اللہ کیا وہ پاکستان کبھی نہیں آئے گا؟'' اماں کی روکھی باتیں سُن کر وہ اچھی خاصی روہانسی

ہو گئی۔!

"ارے بیٹی...... یہ تو وقت بتائے گا کہ وہ آتا بھی ہے یا نہیں۔ اتنی دور بیٹھے لڑکے سے ہم کیسے ناطہ جوڑ لیں۔ آج کل تو یہاں کے لڑکوں کے لچھنوں کا ان کی ماؤں تک کو پتہ نہیں ہوتا۔! اور سعید تو پھر بہت دور بیٹھا ہے!"

اماں کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر اُسے اپنی بد قسمتی کا یقین آ ہی گیا...... یہ اماں بھی عجیب مراقن قسم کی تھیں۔ کسی بات کا مجال ہے کہ روشن پہلو دیکھ تو لیتیں...... ہمیشہ ہر چیز کے تاریک پہلو دیکھتیں...... اب سعید کے بارے میں اوندھی الٹی باتیں کر کے اُس کے دل کے جگمگاتے دیئے کو بری طرح بجھا دیا تھا۔ وہ تو اس کی آمد کا ایک اک پل گن رہی تھی اور اِدھر اماں کو سعید سے کسی قسم کی توقع ہی نہیں تھی۔

تب وہ بے دلی سے پڑھائی میں جت گئی...... اپنے آپ کو مصروف رکھنے کیلئے بیچاری لڑکیوں کے پاس بھلا ہوتا بھی کیا ہے...... انکے بھل بھل کرتے آنسوؤں کو یا تو تکیہ اپنے اندر سینت کر رکھتا ہے۔ یا کورس کی کتابیں جو چہرے سے لگی لگی بھیگ جاتی ہیں۔ مگر مجال ہے کہ کسی سے کچھ کہہ تو دیں۔

روبی کو جیولری پہننے کا بچپن سے ہی بہت شوق تھا۔ اور چوڑیوں کی چھن چھن پر تو اسکی روح ہمکتی تھی۔ جانے کیوں عورت کی سنواتیں اُسے چوڑیوں کی نغمگی میں نظر آتی تھیں۔ ان کی چھن چھناہٹ اسے ہر ساز سے زیادہ پیاری تھی۔ کلاس میں اس کی سہیلیاں کلائیاں بھر بھر کے چوڑیاں پہن کر آتیں۔ کانوں میں ٹاپس اور گلے میں نہایت خوبصورت لاکٹ ہوتا۔

ایک دن پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے اُس نے اُن سے پوچھا......!

"مشفق تم نے کہاں سے خریدی ہیں یہ چیزیں۔"

تو وہ شرما کر مگر بڑے فخر سے بولیں۔

"وہاں سے آئی ہیں۔"

"وہاں" اور "وہ" جیسے الفاظ کالج لائف میں بڑے "پاپولر" ہوتے ہیں مگر وہ ناواقف تھی اس لیے دوبارہ پوچھا کہ۔

"کیا حیدری مارکیٹ سے لائی ہو یا مینا بازار سے......"

تو وہ اس پر ہنس کر بولیں۔ "ارے روبی جان! تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ میں منگنی یافتہ ہوں۔"

روبی کو یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ بے وقوف تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ میں شہزادی

ہوں...... اور تم سزا یافتہ ہو۔ خوشیوں کے پھول' ابھی تمہارے لیے نہیں کھلے...... ہنستی مسکراتی آشائیں...... تم تک نہیں آئیں۔ تم ابھی خول میں بند ہو...... اور میں آکاش پر چہلیں کر رہی ہوں تمہارا میرا بھلا کیا مقابلہ...... میں تم سے سینئر ہوں۔ "ارے کس سوچ میں ہو......" انہوں نے ہنس کر چھیڑا......!

"نہیں' کچھ بھی تو نہیں...... میں تو تمہاری ہنستی مسکراتی چوڑیاں دیکھ رہی تھی۔"

"انھوں نے تو بھیجی ہیں یہ سب چیزیں......" وہ پھر اترائیں۔!

"اچھا"۔ روبی کے گلے میں گولا سا پھنسا......!

"تمہاری نہیں ہوئی ابھی تک کوئی منگنی وگنی......" انہوں نے ترس کھاتے ہوئے بڑے دُکھ سے پوچھا......!

"نہیں ابھی تک نہیں ہوئی ہے......" یہ کہتے ہوئے اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے دام مارکیٹ میں بے حد نیچے گر گئے ہوں......!

"اللہ پر بھروسہ رکھو......" انہوں نے رحم کھاتے ہوئے اس کے دیئے روشن رکھے......!

"دیکھا جائے گا" گو بڑی لاپرواہی سے کہا...... مگر جس طرح دل خون کے آنسو رویا تھا۔ وہ خود جانتی تھی۔ سانس جس مشکل سے سما رہی تھی...... اس کا احساس ہو رہا تھا۔ کالج میں سہیلیوں کے سامنے نکو بن کر رہنا کتنا مشکل تھا۔ اچھی خاصی شکل ہوتے ہوئے بھی کتنی معمولی ناک نقشے کی لڑکیوں کے سامنے کس قدر ہیٹی ہو رہی تھی۔

اس واقعے کے بعد وہ اپنے کالج کی جس لڑکی کے ہاتھ میں' کان اور گلے میں کوئی چیز پہنے دیکھتی' تو دل مسوس کر رہ جاتی...... ہائے کم بخت ماریاں کس قدر خوش بخت ہیں۔ کیسے لشکارے مارتی پھرتی ہیں......!

اور جب عید پر اماں نے پانچ روپے درجن والی چوڑیاں لا کر دیں تو اُس نے مارے غصے کے اُنہیں دیوار پر دے مارا۔

"اری پاگل ہوئی ہے کیا۔" اماں جھلا کر بولیں۔

"یہ کوئی وہاں سے تھوڑی آئی ہیں جو ہم ان کو پہنیں۔" اُس نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔ مگر اپنے بستر پر جا کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ساری رات تکیہ اُس کے آنسو اپنے سینے میں جذب کرتا رہا......!

اس کے بعد وہ پکی نمازی بن گئی۔ اماں دیکھ کر خوش ہوتیں کہ چلو نماز کی اہمیت اس کے دل میں اجاگر تو ہوئی۔ ورنہ وہ کسی قدر اُٹھایا کرتی تھیں نماز کے لیے۔ اور وہ کروٹ بدل کر سو جاتی

تھی۔مگر اب وہ ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر آنسوؤں سے تر چہرے کو سجدے میں ٹکا کر اللہ میاں سے کہتی۔اے پاک پروردگار...... یا تو منگنی کروا دے ورنہ اس دنیا سے ہی اٹھا لے۔کیا فائدہ ایسی زندگی کا...... جو بغیر منگنی کے گزر جائے۔منگنی نہیں تو کچھ بھی نہیں...... زندگی گزارنے کیلئے کچھ رنگ چاہئیں......!

اور منگنی نام ہے رنگینیوں کا......!

زندگی کا بانکپن...... مسکراہٹ میں ہے......اور منگنی...... قہقہوں کا دریچہ تھی۔!

اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی دعائیں سن لیں اور اُس کے چمن میں چپکے سے بہار آ گئی۔یعنی لندن سے سیدھا سعید انکے ہاں لاہور آیا اور پھوپھا کا کوئٹہ سے ٹرانسفر بھی لاہور کا ہو گیا اور یوں شکیلہ پھوپھی انکے ہاں ایک عرصے کے بعد آئیں......!

ان سب کو دیکھ کر اُس کا دل جھوم سا گیا......!

دعائیں اتنی جلدی بھی پوری ہو جاتی ہیں۔اُس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا...... ورنہ وہ تو سوچ رہی تھی کہ نمازوں کے ساتھ ساتھ روحانی وظائف بھی منگنی کے لیے کرے گی۔

اُن دنوں وہ ہر لمحے پھولوں کی طرح اپنے آپ کو سبک محسوس کر رہی تھی۔سعید کو دیکھ کر قدسیہ آپا اس سے کہنے لگیں۔

''ہائے !لندن میں بھی رہ کر کالا کا کالا ہی رہا۔کالے مرد کم بخت کس قدر ڈراؤنے سے لگتے ہیں۔یہ نہیں ہوتا اُن سے کہ خواتین کے سامنے پاؤڈر لگا کر آیا کریں۔کم از کم ان کو دیکھ کر طبیعت کو اختلاج تو نہ ہو......!

آپا کی باتیں سن کر وہ کھول ہی تو گئی۔''آپا۔تمہارے صاحب بہادر سے تو اب بھی گورا ہے!''

''ان سے گورا تو ہرگز نہیں ہے......''وہ شرارت سے ہنسیں۔

میری آنکھوں سے دیکھو نا۔مجھے تو سُرخ وسفید نظر آ رہا تھا۔!

''کیا تیری آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے۔''وہ پریشان ہو گئیں۔!

''افوہ...... میری آنکھوں میں موتیا اترے یا گلاب۔آپکو اس سے کیا...... بڑی آئیں...... ہمارے سعید کو کالا کہنے والی...... اب یہ بیچ میں رخنہ ڈالیں گی' تو ہو چکی ہماری منگنی......'' وہ بڑبڑائی......!

''روبی تو نے غور سے دیکھا۔سعید کی ٹانگوں میں کچھ لنگ ہے۔'' ریحانہ آپی نے اپنے چہرے کی شرارت چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔

''نہیں آپی!ایسی تو کوئی بات نہیں۔''وہ یکدم پیلی پڑ گئی......!''ارے تو نے غور سے نہیں

دیکھا' اپنی ٹانگ کو اچھا خاصا کھینچ کر چلتا ہے۔مگر چال ٹپے دار ہو جاتی ہے......!''

''اچھا' میں نے تو محسوس نہیں کیا۔'' اس نے بظاہر خوش دلی سے کہا مگر دل ڈوبا جا رہا تھا...... کہ ہائے یہ باتیں اگر اماں کو پتہ چل گئیں تو وہ منگنی سے ہی بدک جائیں گی۔یہ بھی نہیں سوچیں گی کہ خاندان کے لڑکوں میں ایسی چھوٹی چھوٹی خامیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی......

''میرا تو یہ خیال ہے کہ کسی میم نے پٹائی کی ہوگی......اس غریب کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہوگی۔وہاں پردیس میں اسکی کون دیکھ بھالا کرتا۔ٹانگ کی ہڈی تو جڑ گئی......مگر لنگ سا رہ گیا......'' ریحانہ آپی نے قدسیہ آپا کو دیکھتے ہوئے مسکراتے لبوں سے کہا۔!

''اور ایک آنکھ جو چھوٹی بڑی ہے اس کا کیا ہوگا......'' قدسیہ آپا...... ہراساں ہوتے ہوئے بولیں......!

''چلو چشمہ لگوا دیں گے......'' ریحانہ آپی نے سوچ کر جواب دیا......!

''بالوں کی وگ تو اتنی اچھی لایا ہے کہ بالکل اصلی بال لگتے ہیں۔'' آپا لوگ قہقہہ لگاتے ہوئے بولیں۔

تب وہ کھڑے قد سے نیچے گر گئی...... اور جب ہوش آیا۔تو سب سے زیادہ مضطرب سعید تھا......!

اس نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے غور سے دیکھا۔

''نظر لگاؤ گی کیا؟'' وہ بولا......!

''ہاں......اب تم جیسوں پر بھی نظر لگے گی۔'' وہ کلسی۔!

''کیا مطلب۔؟''

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم لندن سے اس قدر ٹوٹ پھوٹ کر آؤ گے......!''

''کیا کہہ رہی ہو روبی......'' وہ پریشان تھا......!

''بال تمہارے نقلی' آنکھیں تمہاری خراب' پیروں میں تمہارے لنگ۔!''

''کون کہہ رہا ہے' یہ باتیں تم سے......؟''

''کہے گا' کون...... یہ آپا لوگ بتا رہی تھیں مجھے۔!''

''اوہ...... یہ بات ہے...... وہ......!

مگر میں اب کیا کر سکتا ہوں۔جیسا بھی ہوں۔تمہارے سامنے حاضر ہوں۔!''

''ہاں...... یہ تو ہے...... وہ اس کے بال کھینچتے ہوئے بولی۔کتنی اچھی وگ ہے...... اترتی بھی نہیں ہے۔!''

"بھئی گوند سے چپکا کر پہنتا ہوں۔" اُس نے اپنے قہقہے پر بمشکل قابو پایا۔

"اللہ...... اتارتے وقت تکلیف ہوتی ہوگی۔" اُسے افسوس ہوا۔!

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ وہ......!"

"مت پہنا کرو......" وہ بولی......!

"شادی کے بعد...... اسے صرف آنے جانے میں استعمال کیا کروں گا......!"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس گرم ٹوپی کو استعمال کرنے کی......!"

"اے زیادہ جذباتی مت بنو...... تمہارے گنجے میاں کو دیکھ کر' تمہاری سہیلیاں مذاق اڑائیں گی۔!"

"مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہوگی...... جناب۔!"

"ایمان سے......!"

"تمہاری وگ کی قسم......" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی......!

"اے...... اتنی بڑی قسم نہ کھاؤ......!"

"وہ کیوں......؟"

"اگر قسم جھوٹی پڑ گئی...... تو میری وگ کے بال جھڑنے لگیں گے۔ اس بیچاری پر نہ کوئی دوا کارگر ہوگی اور نہ ہی کوئی آزمودہ قسم کا شیمپو فائدہ پہنچا سکے گا۔؟"

"میری قسم سے' اس قدر خطرہ کیوں ہے حضرت کو......؟"

"بھئی...... تمہاری طبیعت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا...... گھڑی میں کچھ' گھڑی میں کچھ...... میں تو اس کو بعد میں بڑے ٹرنک میں بند کر کے رکھ دوں...... جب ذرا طبیعت گھبرائی دیکھ لی' اوڑھ لی...... اپنے کو بھی خوش کر لیا اور اپنی بیگم کو بھی......!"

"بھئی میں کہہ رہی ہوں کہ اس کو باہر پھینک دینا...... میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے ہو......!"

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا ناں......!"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔!"

"روبی...... سوچو اور غور کرو...... چاہے میں کتنا ہی ٹوٹا پھوٹا سا ہوں۔ مگر میرا دل ثابت و سالم ہے...... اس کو میں نے نہ کہیں ٹوٹنے دیا اور نہ ہی پھوٹنے دیا...... ایک مرغی کے انڈے کی طرح حفاظت سے یہاں تک لایا ہوں۔ یہ وگ اور ان آنکھوں کے نقص سے پریشان مت ہونا......!"

"ہاں بس' اس میں کوئی نقص نہیں ہونا چاہیئے۔" وہ ہنسی۔

"فکر نہ کریں سرکار...... اس میں صرف اور صرف تمہاری تصویر جڑی ہے۔" وہ سینے پر ایک دو ہتھڑ مار کر بولا۔!

"آپا کہہ رہی تھیں کہ تمہاری ٹانگ میں بھی لنگ ہے۔ مگر مجھے تو نہیں لگتا۔!"

"ہاں بھئی محبت کرنے والوں کو تھوڑی نظر آتا ہے۔ یہ سب تمہاری محبت کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ مابدولت تمہیں حسین شہزادے کے موافق نظر آتے ہیں۔" وہ شرارت سے بولا تو وہ جھینپ کر رہ گئی۔!

"اے ہے کس کی ٹانگ میں لنگ ہو گیا......" پھوپھو۔ اُس کی آدھی بات سنتی ہوئی جو صحن میں آئیں۔ تو وہ نو دو گیارہ ہو چکا تھا......!

اور جب اُس نے پھوپھو کو اُس کے عیب گنوائے تو وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئیں۔

اف...... یہ سب مذاق تھا...... وہ انکے قہقہے سن کر بھی ہکا بکا سی تھی!

آپا لوگوں نے تو جھوٹ بول کر اُسے جلایا ہی تھا...... مگر سعید نے جھوٹ بول کر اُسے کلسا ڈالا......!

ہائے...... وہ کیسے کیسے ڈائیلاگ...... اس کم بخت کے سامنے بول گئی تھی۔ اُس بہروپیے کے کتنی زور زور سے تو اس نے بال نوچے تھے۔ اور وہ کہہ رہا تھا کہ گوند سے وگ چپکا رکھی ہے...... اللہ کس قدر بے وقوف بنی تھی وہ...... اور وہ ذلیل کس قدر خوش ہو رہا تھا......!

بعض لوگ شائد خود ہی خوش ہو کر...... اُسے خوشی کی معراج سمجھتے ہیں...... اب یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی کہ ایک دن وہ بیڈمنٹن کھیلنے کے دوران اُس سے بڑی سنجیدگی سے خوب گھنا بن کر کہہ رہا تھا۔

"روبی...... میں تمہیں کیسا شہزادہ لگتا ہوں۔!"

"اے' کیا اپنی کیٹیگری پوچھنا چاہتے ہو......" وہ جلی......!

"کسی حکومت کے شہزادے تو ہو نہیں......" وہ شٹل پر پوری طاقت سے ریکٹ مارتی ہوئی بولی......!

"اے ناسمجھ...... نادان لڑکی...... میں دل کی حکومت کی بات کر رہا ہوں۔" تب اس کا دل چاہا کہ صاف کھری کھری سنا دے۔!

'بڑے کمینے لگتے ہو۔ بڑے ذلیل لگتے ہو۔' کیونکہ اُس نے اُس کو نہ صرف بے وقوف بنایا تھا بلکہ لندن سے بھی اس کیلئے کوئی چیز نہیں لایا تھا۔ مگر یہاں سوال' اُس کی اپنی منگنی کا تھا۔ اس لیے وہ کوئی سچی بات کہہ کر اپنے لیئے کسی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

اس لیے دل پر پتھر رکھ کر کہہ دیا۔

''اللہ سعید تم مجھے اتنے اچھے لگتے ہو کہ میں بیان نہیں کر سکتی......!''

''کوئی بات نہیں' لکھ کر دے دو...... میں کیمسٹ سے پڑھوالوں گا......!''

''اے...... اتنے قابل مت بنو...... تمہاری ٹھٹھرتی سی مریل رائٹنگ بھی میرے سامنے ہیں...... جانے قلم استعمال کرتے ہو کہ تلوار...... سارے لفظ...... کاغذ پر کٹے پڑے نظر آتے ہیں۔ جن میں شہید کم...... جرائم پیشہ مقتول زیادہ......!''

''سارے رومانس کا ستیاناس کرنا تو' کوئی تم سے سیکھے......!''

''اوہ...... ہیرو تو دیکھو...... چڑی مار کہیں کے...... میٹھی بات کر نہیں سکتے...... دل جیتے گا کسی کا......!''

''ارے وہ تو جیت چکے' کب کا......'' وہ ہنسا......!

''خواہ مخواہ ہی......'' وہ جھینپی......!

''اے...... بے ایمان لڑکی...... تم ابھی پانچ منٹ پہلے...... یہ اقرار کر چکی ہو کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں۔''

ہاں سو دفعہ کہہ دیں گے...... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

''اے لڑکی...... تمہیں تو اقرار کرنے کے بھی آداب نہیں آتے...... معلوم ہے کہ باہمی پسندیدگی کا انجام شادی ہوا کرتا ہے۔'' اُس نے اُسے شوخ شوخ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔!

''سعید...... پہلے تو میں' تم سے اپنی منگنی کروں گی۔'' وہ بڑی بے صبری سے بولی......!

''واقعی......؟'' اس کی آنکھیں' اُسے شرابیوں کی سی لگیں!

''کیا لکھ کر دے دوں۔'' وہ جھینپی......!

''ہاں۔ دستخط تو کرنے پڑیں گے ہی...... وہ بھی گواہوں کے سامنے......'' وہ ہنسا!

''اے...... ابھی اتنا آگے نہ بڑھو......!''

''کیوں...... شادی میں بھلا دیر کیوں ہو۔!''

''مجھے بس۔ منگنی اچھی لگتی ہے......!''

''مگر مجھے اچھی نہیں لگتی......'' اُس نے برا سا منہ بنایا۔

''نہ لگے...... مجھے کیا......'' وہ کاندھے اُچکا کر لاپرواہی سے بولی......!

''کیسی عجیب لڑکی ہو...... تمہیں میری پسند یا ناپسند کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

''ضروری نہیں' کہ ایک بات ہم دونوں کو پسند بھی ہو...... کچھ ناپسند سے بھی گزارا کرنا

پڑے گا۔!''

''اوہ...... ایسا بھی ہوگا......!''

''بالکل ہوگا...... مجھے معلوم ہے کہ آپ کو پائے کا سالن پسند نہیں ہے۔ بقول آپ کے کہ بھینس کے جوتے بھی کوئی کھانے کی چیز ہیں۔ نوالہ ڈبوؤ تو...... یوں لگتا ہے کہ کیچڑ سے لگا کر کھا رہے ہیں...... مگر یہ ڈش میری فیورٹ ڈش ہے۔ سردیوں کے موسم میں' آپکو ہفتے میں دو دن مجبوراً کھانی پڑے گی......!''

''میں قضاء روزے رکھنے کو اولیت دونگا...... مگر کیچڑ سے روٹی نہیں کھا سکتا۔''

بہر حال مجھے تو منگنی بے حد پسند ہے...... کیونکہ یہ سب لڑکیوں کا پسندیدہ فنکشن ہوتا ہے۔ سب اتنا انجوائے کرتی ہیں۔ لڑکے تو اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''ارے بے وقوف لڑکی...... منگنی تو ڈھنگنی ہوتی ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''لڑکی کے ڈھنگ دیکھے جاتے ہیں...... اور ہم نے تمہارے سارے بے ڈھنگے' ڈھنگ پہلے ہی دیکھ رکھے ہیں اور مزید دیکھنے کی تاب ہے نہ......؟''

''اے...... لینگویج پلیز......'' وہ برہم ہوگئی۔!

''سیدھی بات...... تم جیسی کوڑھ مغز کی سمجھ میں ہی نہیں آتی تو کیا کریں......؟''

''پلیز...... صرف منگنی کرلونا......'' وہ خوشامد کرتے ہوئے بولی۔

تب وہ اُس کے اِس انداز کو دیکھ کر' دیر تک خوشدلی سے ہنستا رہا......!

اور وہ اپنے کمرے میں بھاگ آئی...... آپا لوگ اُس کو چھیڑتی رہیں اور وہ شرماتی رہی...... سوچتی رہی...... ہنستی رہی...... اُن دنوں...... سب سے چھپ کر...... اپنے ہاتھ دیر تک ابٹن سے رگڑ رگڑ کر دھوتی کہ انگوٹھی پہن کر ہاتھ خوبصورت معلوم ہوں......! مگر نہ جانے سعید کمینے نے پھوپھی سے کیا کہا کہ انھوں نے اماں سے منگنی کے بجائے یکدم شادی کا کہا...... اور اماں بھی جیسے مان لینے والی تھیں۔ کہ اُس نے رو رو کر گھر سر پہ اُٹھا لیا۔ صرف منگنی ورنہ کچھ بھی نہیں......!

''اری کیوں باؤلا پنا کر رہی ہے...... اچھا ہے ایکدم شادی کر کے' میری جان بھی جلدی چھوٹتی......'' اماں اس پر جھلا کر آتیں......!

''اماں...... بہت بھاری ہوں......؟''

''اری...... یہ میں کب کہہ رہی ہوں......'' وہ الجھ جاتیں۔

''پھر کیوں...... اتنی جلدی پھینکنا چاہ رہی ہیں۔'' وہ رو کر سب کو ڈراتی...... ! آخر وہی

ہوا...... جو وہ چاہتی تھی۔ اُس کے آنسوؤں کے ڈھیر کے سامنے...... سب نے ہتھیار ڈال دیئے...... اور پھوپھو نے بڑے چاؤ سے اُس کو انگوٹھی پہنا دی......! سعید نے پوری تقریب کی مووی بنوائی۔ اور وہ خوب پوز مارتی رہی...... سعید تو اُسے سارا وقت دیکھ کر مسکراتا ہی رہا۔ کتنی شوخ اور کتنی پیاری لگ رہی تھی وہ...... کتنے خوبصورت کلوز اپ آئے تھے اُس کے...... کبھی مسکراتے' کبھی شرماتے...... حد تو یہ تھی کہ...... سعید کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے اور زبان چڑاتے ہوئے بھی کیمرے نے وہ شوخ لمحے قید کر لیئے تھے...... مووی دیکھ کر سب ہنس رہے تھے اور وہ...... ساتویں آسمان پر پہنچ گئی تھی۔ انگوٹھی کی چکا چوند اُسے مہکتی فضاؤں میں لے آئی تھی...... اور وہ ان معطر فضاؤں میں بہت ہلکی پھلکی ہو کر اڑ رہی تھی......!

منگنی یافتہ ہونا...... اسے ایک اعزاز سا لگ رہا تھا...... یہ احساس اُسے ایک غرور سا عطا کر گیا تھا۔

سہیلیوں کے سنگ میں بھی سینہ تان کر چل سکتی ہوں۔ اُس کی بے نام چوڑیوں کو ایک نام مل گیا تھا۔ یہ مہکتے رشتے کس قدر حسین ہوتے ہیں۔ ان کے دم سے زندگی میں کیسا حسن اُمڈا چلا آتا ہے۔ بے نام جذبے...... کتنے مدھم اور رسیلے ہو جاتے ہیں...... تب ہوائیں بھی گیت گاتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور سرسبز و شاداب درخت بھی رقص کرتے نظر آتے ہیں......!

اُس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو نیا نیا سا لگا...... وہ کس قدر خوبصورت تھی۔ یہ آگاہی اُسے پہلی بار ہوئی۔ آنکھوں میں کس قدر نشہ سا تھا...... سعید کی چاہت کا سارا خمار اُس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا...... رسیلے لبوں پر گیت مچل رہے تھے۔ تب بے اختیار وہ گنگنانے لگی۔ اپنی آواز اُسے خود ہی شہد آفرین لگی......!

''ویل ڈن...... ویل ڈن......'' سعید تالیاں بجاتا ہوا اُسے گستاخ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا......!

اور وہ شرما کر رہ گئی......!

''کہو تو ٹی وی پر چانس دلا دوں...... ماشاء اللہ خاصی تیز نوکیلی آواز ہے......'' وہ مذاق اڑاتا ہوا بولا......!

''اے...... تمہیں معلوم بھی ہے کہ کالج میں گلوکاری میں مجھے فرسٹ پرائز ملا ہے......'' اس نے اترا کر بتایا۔

''بھئی مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ منصفین میں تمہاری آپا لوگ کی دوستیں تھیں...... ظاہر ہے کہ اگر وہ تمہیں انعام نہیں دلواتیں' تو گھر آ کر انہوں نے پٹنا تھوڑی تھا۔ کیسی جنگجو قسم کی تمہاری

''واقعی آنچل مجھے مار والا محاورہ تمہیں ہی دیکھ کر کہا گیا ہوگا۔'' وہ پانی پیتے ہوئے بولے۔ ورنہ اُن کا دل تو چاہ رہا تھا کہ صبو کے گلاس کھینچ ماریں۔

اور وہ انتہائی بے دلی سے اٹیچی کیس میں کپڑے بھرنے لگی۔

''میرا پنک غرارہ لے جاؤ۔ شادی میں پہن لینا۔ تم پر اچھا لگے گا......'' پھوپو نے اُسے چپ چاپ بیٹھا دیکھ کر کہا۔

''میں نے رکھ لیا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کیا کہا؟ بغیر پوچھے ہی رکھ لیا۔'' وہ غصے میں بولیں۔

''ہاں' فیروزی ساری اور آپ کا شادی کا شرارہ بھی رکھ لیا ہے۔ میرون کلر کا......'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''صبو تم بہت بدتمیز ہو۔ اتنے قیمتی کپڑے بغیر اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی پتا ہے میرا شرارہ اٹھارہ ہزار روپے کا آیا تھا۔''

''پھوپو جی...... آپ اُسے اٹھارہ دفعہ بھی نہیں پہنیں گی۔ اور میں اُسے پہن کر آپ سے زیادہ خوبصورت لگوں گی۔''

''اے۔ اتنی خوبصورت بننے کی کیا ضرورت ہے۔'' نوما باجی نے اُسے چھیڑا۔

''یار باجی! میں اپنی ننھیال میں پہلی دفعہ جا رہی ہوں کیا پتہ کوئی پسند آ جائے۔ کوئی محبت پیار ہو جائے تو میں کیا کروں گی۔ میرے پاس محبت کرنے کے لیے چار جوڑے تو ڈھنگ کے ہونے چاہئیں۔''

''ارے تم محبت کرو گی۔'' نوما باجی اُسے دیکھتے ہوئے ہنس کر بولیں۔ ''تم تو ہر جگہ ٹارزن بنی پھرتی ہو...... یاد ہے' عامر نے پیار سے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا اور تم نے اُس کی کلائی توڑ دی تھی۔ اُس بے چارے کو کیا پتا کہ تم اس قدر جلاد ہو...... پیار کی زبان تک نہیں سمجھتی ہو۔ فرقان کے محبت بھرے خط کی تم نے پورے خاندان میں مٹی پلید کر دی تھی کہ وہ بے چارا کہیں سے بھی گزرتا ہر شخص اُس کے خط کی تحریر سنانے لگتا۔ جو تم نے سب کو رٹا دی تھی۔''

''ارے نوما باجی! یہ دل ہی تو ہے۔ کیا پتا کس پر آ جائے۔''

''بہت مشکل ہے۔ تمہارا دل تو کسی جن کا دل ہے کسی جن بھوت پر ہی آ جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہاں انسانوں پر آنا مشکل ہے۔؟''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ جاوید بھائی کے ساتھ آج میری ڈیٹ ہے۔'' اُس نے اُن کو چڑایا۔

"واقعی......!" نوما باجی کے پسینے چھوٹ گئے۔

"ہاں' وہ کل کہہ رہے تھے کہ میری براؤن آنکھوں میں وہ ڈوب چکے ہیں......" وہ اپنا ہونٹ کاٹ کر ادا سے بولی۔

"اچھا...... یہ بات ہے......" وہ چکرا کر وہیں بیٹھ گئیں۔ اور وہ ہنستی ہوئی نو دو گیارہ ہوگئی۔

پرسوں اُسے کراچی جانا تھا اور وہ کراچی جانے کے لیے شاپنگ پر شاپنگ کیے چلی جارہی تھی...... نانی' ماموں' خالاؤں کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی امی کے لیے بھی تحفے خریدے تھے......وہ ماں جس کو اُس نے ہوش سنبھال کر ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہاں' اتنی ڈھیر ساری محبتیں پا کر بھی اُس کے دل میں ایک ہوک ضرور اٹھتی تھی۔ اُن کے لیے تحفہ خریدتے وقت وہ کھوسی گئی تھی۔

"میری ماں ہوتیں تو یہ کرتیں۔ میری ماں میرے پاس ہوتیں تو وہ کرتیں...... لامحالہ سوچیں اس کو اکثر اپنے شکنجے میں کس لیا کرتی تھیں۔

تب وہ اپنا کمرہ بند کر کے گھنٹوں روئے چلی جاتی۔ رو رو کر آنکھیں سُوج جاتیں' گلا بیٹھ جاتا مگر اُس کا دل ہلکا ضرور ہو جاتا تھا نہ جانے کیا بوجھ تھا جو کبھی کبھی پوری طاقت کے ساتھ اُس کے دل پر آ جاتا تھا۔ تب وہ دل بھر کے رو کر اس بوجھ کو پرے کھسکا دیتی۔

☆☆☆

نیاز احمد ہمیشہ سے شوخ طبیعت کے حامل تھے۔ کسی بھی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا کرتے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ ماں نے اُن کی منگنی زبردستی اُن کی خالہ زاد سے کردی تھی تب بھی سنجیدہ نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی اس کو کوئی اہمیت دی تھی۔

ایک شب وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کسی کی شادی میں گئے۔ وہ میرج ہال نیا بنا تھا اور ہزاروں آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ مرد وعورت کی نشستیں ساتھ ساتھ تھیں بلکہ کھانا پینا بھی یکجا تھا۔ وہاں کھانا کھاتے وقت اُن کے پیچھے سے آواز آئی۔

"اے مجھے بھی بروسٹ دو نا۔ خود ہی اتارے جا رہے ہو۔"

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اُس پری وش کو جب انھوں نے پلیٹ اوپر تک بھر کر تھمائی تو وہ حیران ہو کر انھیں دیکھتے ہوئے بولیں...... "ارے' آپ رضا بھائی جان نہیں ہیں......" نیوی بلیو سوٹ دیکھ کر میں سمجھی' بھائی جان اس طرف ہیں۔"

"خدا نہ کرے' میں آپ کا بھائی جان ہوں اور پھر ہر نیوی بلیو سوٹ والا آپ کا بھائی تو نہیں ہوسکتا۔"

سوری کہہ کر وہ جان چھڑانے ہی والی تھی کہ ان کے بھائی رضا بھی سامنے سے آتے دکھائی دے گئے...... وہ ایک قلانچ میں اُن تک پہنچ گئی۔ اور وہ اپنے بچپن کے دوست کو دیکھ کر ٹھہر گئے۔

"نیاز......تم یہاں کہاں؟" رضا اُسے دیکھ کر لپٹ گئے۔

"ایک دوست کے ساتھ آیا ہوں۔ واللہ بن بلایا نہیں ہوں۔"

"فریال' ان سے ملو۔ یہ میرے بہت پُرانے دوست ہیں اور بہت بڑے آدمی ہیں۔ اس لیے دوستوں سے بہت کم ملتے ہیں۔"

"میری مصروفیات کو غلط رنگ مت دو یار۔" وہ فریال کو دیکھتے ہوئے معذرت بھرے انداز میں بولے۔

"اگر آپ دوستوں سے ملتے ہیں اور بھائی جان کا دعویٰ غلط ہے تو کل شام کا ڈنر غریب خانے پر کیجیے۔" فریال ان کی جانب دیکھ کر بولی۔

تب وہ کچھ جھجکے' کچھ چونکے۔ فریال پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور رضا سے وعدہ کرلیا کہ وہ اُن کے گھر ضرور آئیں گے۔

اور پھر واقعی انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ ایک عجیب سی کشش تھی جو انھیں رضا کے گھر کھینچے لیے چلی لے گئی۔ رضا کا گھرانا بھی اچھا خوش حال تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ جدید تہذیب سے آراستہ بھی۔ نیاز احمد کے گھرانے میں پیسے کی ریل پیل کے باوجود وہی پُرانی اقدار کارفرما تھیں۔ عورتیں برقعے اوڑھتی تھیں اور سب کی گز بھر سے بڑی چوٹیاں تھیں۔ اور رضا کے گھرانے میں اُن کی بہنوں کے ساتھ ساتھ نانی دادی بھی اپنے زمانے کی خاصی ماڈرن تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بلاؤز میں اپنے مرجھائے ہوئے وجود کا نظارہ کراتے ہوئے قطعاً نہیں شرماتی تھیں۔ جبکہ نیاز احمد ایسے مناظر دیکھ کر اپنی نظریں قطعاً اوپر نہیں کرتے تھے۔

"فریال کو نیاز احمد بہت بھائے تھے۔ نہ صرف پہلی نظر میں بلکہ جب سے اُن کا حسب و نسب معلوم ہوا تھا۔ وہ مزید متاثر کر گئے تھے۔

حُسن جب شوخی کے ساتھ گھائل بھی کر جائے تو خاصا وزن دار بھی ہو جاتا ہے۔

نیاز احمد نے عشق کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے قطعاً یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ اُن کی منگنی اُن کی کزن رضیہ سے ہو چکی ہے۔

فریال کا حسن...... اور اُس کا شوخ انداز انھیں اس قدر بھایا کہ اُس کی چھوٹی چھوٹی دو پونیاں دیکھ کر انھیں رضیہ کی ڈیڑھ گز کی چُٹیا بھی یاد نہیں آئی۔

اُن کی ملاقاتیں چار یا چھ ہوئی تھیں کہ نیاز احمد نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ شادی کریں گے تو

صرف فریال سے ہی کریں گے۔ ایم اے پاس بیوی کا تصور ہی اُن کے من میں شگوفے کھلانے لگا تھا۔

اُن کا یہ اعلان گھر کی چار دیواری سے ٹکرایا تو سب گم صُم سے رہ گئے۔

اُن کی ضد اور ہٹ سے سب واقف تھے۔ مگر اس کے باوجود ماں بہنوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اُن کو اس امر سے باز رکھا جائے۔

مگر ایک شام جب نیاز احمد گھر میں داخل ہوئے تو اُن کے پہلو میں سجی بنی فریال بھی ہمراہ تھی۔

''اماں' یہ آپ کی بہو ہیں۔ آج سہ پہر نکاح ہوا ہے۔'' وہ انتہائی بے پروائی سے کہتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چل دیے۔

اماں اور بہنوں نے حیرت سے فریال کو دیکھا اور ڈبڈبائی نظروں سے جاتے ہوئے نیاز احمد کو دیکھا اور ماں اور بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو پڑیں۔ فریال نے ایک اچٹتی سی نظر روتی ہوئی ساس نندوں پر ڈالی اور اپنی ساری کی فال چٹکی میں پکڑ کر نیاز احمد کے کمرے میں چلی گئیں۔

رو کر جب بھڑاس نکل گئی تو دو چار دن بعد انھوں نے فریال کو قبول بھی کر لیا۔ مگر فریال کو اپنا روکھا پھیکا سواگت بھی یاد تھا۔ انھوں نے اُن کی آؤ بھگت کو خیال خاطر ہی نہ جانا۔ شام ہوتی اور وہ سج سنور کر نیاز احمد کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر بنا برقع گھومنے نکل جاتی۔

دو چار دن اماں خاموش رہیں۔ بعد میں نیاز احمد سے کہا۔ ''بیٹا' ہمارے پورے خاندان میں سب برقع اوڑھتے ہیں۔ تم دلہن کو بھی برقع میں باہر لے جاؤ۔ وہ اس انداز میں باہر جاتی ہیں کہ گھر کے نوکر چاکر اُن پر ہنستے ہیں۔''

شادی کے صرف ایک ماہ بعد نیاز احمد کی فریال سے لڑائی صرف برقع کی وجہ سے ہوئی تھی۔

فریال کی طبیعت خاصی تیز تھی۔ ساس نندوں کی روک ٹوک اس کو غیظ وغضب میں مبتلا کر دیتی اور وہ بے جہت سُنا دیتی کہ نیاز احمد بھی متوحش سے ہو جاتے۔ صوبیہ کی پیدائش کے بعد وہ گھر بیٹھ گئی۔ سسرال آنے کی اس کی واحد شرط یہ تھی کہ نیاز احمد اپنے خاندان والوں سے کوئی ناتا نہیں رکھیں گے اور اس کے ساتھ الگ رہیں گے۔

نیاز احمد نے اس سے اُن کی شرط مسترد کر دی۔ کئی روز اماں کے بلانے پر بھی نہ آئی تو ضدی نیاز احمد نے اسے طلاق دے دی۔ عدت کے فوراً بعد فریال کی شادی دوسری جگہ ہوگئی تو نیاز احمد نے بھی اپنی سابقہ منگیتر سے شادی کر لی۔

صبو۔ اپنی دادی پھوپھی کے کمرے میں پلنے لگی۔ ماں باپ اپنے نئے رشتوں میں ڈوب کر اُسے بھولتے چلے گئے۔ صبو جب سامنے پڑتی تو انھیں یاد بھی آ جاتی ورنہ دوسری بیوی سے چھ بچوں کے ہونے کے بعد اُس کی یاد اتنی ہلچل نہیں مچاتی تھی۔

اُدھر فریال کا بھی یہی حال تھا۔ شروع شروع میں ایک آدھ بار صبو سے ملنے ملانے کی کوشش بھی کی۔ پھر وہ اپنے نئے گھر اور بال بچوں میں ایسی پھنسیں کہ صبو اُن کے ذہن سے بھی اُترتی چلی گئی۔

اب سولہ سال کے بعد اُس کی ننھیال سے شادی کا کارڈ آیا تھا۔ صبو کے ماموں کی شادی ہو رہی تھی جس میں نانا نانی نے اپنی نواسی کو بڑی چاہت سے بلایا تھا۔

صبو کو ہرگز اُس شادی میں نہیں جانا چاہیے۔ ان سولہ سالوں میں اُس کی ننھیال میں اس طرح کی کئی تقاریب ہوئی ہوں گی...... جب انھیں یہ بچی یاد نہیں آئی۔ کبھی عید بقرعید پر اس بچی کو دیکھنے کے لیے اُن کا دل نہیں تڑپا۔ اب ایسی کون سی خاص شادی آ گئی جس میں صبو کی شرکت ضروری سمجھی جا رہی ہے۔'' بڑی پھوپھو نے اُس کے جانے کا بائیکاٹ کیا۔

''امی آپ کو اصل بات کا پتا ہے نہیں۔ بیکار میں بولے چلی جا رہی ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچ رہیں کہ بے چاری صبو کتنے اہتمام سے جانے کی تیاری کر چکی ہے۔'' فیروز نے ماں سے کہا۔

''اللہ۔ کیا بات ہے فیروز بھائی؟'' وہ فیروز کی شہ پا کر اُس کے قریب آ کر پوچھنے لگی۔

''بات یہ ہے محترمہ کہ آپ کے ماموں اپنی بھانجی کے بغیر سہرا نہیں باندھ رہے ہوں گے بلکہ چیخ چیخ کر رو رہے ہوں گے۔ میری پیاری پیاری بھانجی کو بلاؤ۔ سولہ سال سے میں نے اُسے نہیں دیکھا۔'' فیروز نے اُس کا مذاق اُڑایا۔

اس کی بات سُن کر اُس کا کلیجا پھٹنے لگا۔ دل چاہا کہ فیروز کی زبان کاٹ دے۔

''بھئی صبو' وہ لوگ تمھیں پہچانیں گے کیسے؟'' فیروز نے اسے مزید جلایا۔

''ہمیں اس سے کیا' بس پہچان لیں گے......'' وہ تلخ ہو کر بولی۔

''ارے اتنے زعم میں مت آؤ...... میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر تمھاری چھوٹی امی کی سعدیہ چلی جائے تو تمھاری نانی چیخ کر اُسے بھی گلے سے لگائیں گی کہ ہائے میری بچی آ گئی۔ جبکہ سعدیہ اُن کی بیٹی کی سوکن کی لڑکی ہے۔''

''فیروز۔ تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے۔'' بڑی پھوپو نے اُسے پہلی دفعہ جھاڑ پلائی۔

''فریال بہت خوبصورت تھیں۔ مگر شاید ہمارے نصیب حسین نہیں تھے۔ جب وہ روٹھ کر اپنے میکے بیٹھ گئیں تو میں نیاز احمد کے منع کرنے کے باوجود انھیں کئی دفعہ منانے گئی تھی۔ مگر وہ نہیں

آئیں۔'' نانی نے کہا۔

''آخر وہ ہمارے ماموں کے ساتھ کیوں نہیں رہیں؟'' فیروز نے نانی سے پوچھا۔

''انھیں ہمارا گھر' ہمارا رہنا سہنا سخت دقیانوسی لگتا تھا۔ تمہارے ماموں اُن کو برقع اوڑھانا چاہتے تھے مگر اُن سے دوپٹے کا بوجھ بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔''

''اب چھوٹی امی کون سا برقع اوڑھتی ہیں۔'' صبو چیخ کر بولی۔

''بیٹا۔ سولہ سترہ سالہ پہلے نہ اوڑھنے والے بھی اوڑھتے تھے۔ حالات سے سمجھوتے وقت ساتھ ساتھ ہوتے جاتے ہیں۔ مگر فریال بہت ضدی تھیں۔ اپنی ہر بات فوراً پوری کرنے کی خواہش مند تھیں۔''

''آپ کیسی ساس تھیں۔ اپنی بہو کو سمجھا بھی نہیں سکیں۔'' فیروز سنجیدگی سے بولا۔

''ارے' میں نے تو اُن کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنے گھر میں آجائیں۔ مگر اُن میں ذرا لچک نہیں تھی اور نہ ہی کسے رشتے ناتے کا احترام اُن کے دل میں تھا۔ اور آخر کار اُن کا یہی تناؤ علیحدگی کا سبب بنا۔''

''بہت بُری تھیں میری امی......؟'' صبو نے نمناک لہجے میں طنزاً پوچھا۔

''یہ ہم کب کہہ رہے ہیں۔'' پھوپھو اُس کے لہجے کی درشتگی سے چونک سی گئیں۔

''اور کس طرح کہا جاتا ہے......؟''

''بیٹا تم نے پوچھا......اس لیے بتادیا......'' دادی نے تاسف سے کہا۔

''اماں' میں آپ کی بات نہیں کررہی۔ ان سولہ سالوں میں میرے پوچھے بغیر اس گھر کا ہر فرد مجھے وہ کچھ سُنا رہا ہے جسے میں سننا تک نہیں چاہتی۔''

''ہم نے تو کچھ نہیں کہا تم سے۔'' بڑی پھوپھو اپنے گال پیٹتے ہوئے بولیں...... فیروز کو الگ آنکھ کا اشارہ کردیا کہ باہر چلا جائے۔

''ہم نے بھی اگر کہا ہو تو اللہ سمجھے......'' چچی نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''اللہ تو سب سے سمجھے گا۔'' وہ آنسو پیتے ہوئے اندر چل دی۔

''توبہ ہے۔ لڑکی ہے یا آفت۔ مجال ہے کہ کسی سے تمیز سے بات تو کرلے۔'' چھوٹی امی جو سُن گن لیتے ہوئے اندر آرہی تھیں' اُسے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

صبو اُنھیں ایک آنکھ پسند نہیں تھی' بدتمیز' خودسر اور اکھڑ سی......اور پھر اُس کی ماں اُن کی خوشیوں کی ڈائن بھی تھی۔ فریال کا گھر بیٹھنا اُن کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا۔ ورنہ ان کی زندگی تو اُجڑ چکی تھی۔ نیاز احمد جیسا رئیس بندہ انھیں پورے خاندان میں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ جب بھی صبو

کو دیکھتیں تو اُن کے ماتھے کی تیوری چڑھ جاتی۔

صبو نے بھی کبھی سوتیلی ماں کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں سوتیلے بہن بھائیوں کو کولھے پر چڑھائے پھرتی۔

صبو اپنی دادی اور پھوپیوں کی لاڈلی تھی۔ ورنہ چھوٹی امی کا تو بارہا یہ دل چاہا تھا کہ اُس کے جھونٹے پکڑ کر اُس کا منہ طمانچوں سے لال کردیں مگر بھری ہوئی سسرال سے وہ ڈرتی تھیں۔

جس دن وہ کراچی جارہی تھی...... اُسی صبح جاوید آگئے۔ سلمان تایا کے بیٹے۔

پھوپھو اور چچاؤں کی اولادیں اُن کا گھیرا تنگ کیے بیٹھ گئیں۔ اور وہ آرام سے اپنا بیوٹی بکس ترتیب دیتی رہی۔

''صبو۔ تم واپس کب آؤ گی؟'' فیروز نہ جانے کب بھیڑ سے نکل کر اُس کے کمرے میں آ گیا۔

''ابھی تو میں گئی بھی نہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ تم چلی بھی گئیں۔'' وہ اس کے بندھے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اور کیا لگ رہا ہے؟'' وہ اُس کے لہجے پر ہنس دی۔

''لگ رہا ہے کہ اب تم نہیں آؤ گی۔'' لہجہ مغموم سا تھا۔

''کاش' ایسا ہو جائے۔'' صبو نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔'' دو آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر پھسل آئے۔

''اے' رو کیوں رہی ہو......؟'' وہ بے چین ہو کر بولا۔

''میں اپنی ماں کی محبت سے اتنے عرصے سے محروم رہی ہوں۔''

''اب تو تم اپنی امی سے ملنے جارہی ہو۔''

''دل چاہ رہا ہے کہ کبھی واپس نہ آؤں۔'' وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''ایسا کیوں سوچتی ہو......؟''

''چھوٹی امی مجھ سے سخت نفرت کرتی ہیں۔''

''اتنے سارے لوگ گھر کے' تم سے اتنی ڈھیر ساری محبت کرتے ہیں' اس بارے میں کبھی نہیں سوچا؟''

''نفرت' حقارت اور کدورت کے جذبے اتنے حاوی رہے کہ مجھے اس کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا۔''

"کچھ بھی نہیں!" وہ حیران ہو کر بولا۔

"ہاں' کچھ نہیں......"

"صبو...... میں بھی نہیں......" فیروز اُس کا ملائم دُودھیا ہاتھ تھامتا ہوا بولا۔

"نہیں......" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"دیکھو...... رونے کی نہیں ہو رہی......" وہ زبردستی اُس کے آنسو اپنے رومال میں سمیٹتے ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ بتاؤ' جلدی سے آ جاؤ گی نا......"

"خوب دل بھر کے رہوں گی۔" وہ نین برساتی آنکھوں سے ہنستے ہوئے بولی۔

"مگر آ جانا......" وہ شوخی سے بولا۔

"کیوں' آپ کو ایسی کیا جلدی ہے......؟"

"مابدولت تمہارے بغیر بے کلی سی محسوس کریں گے۔"

"اوہ......" وہ ہونٹ سکوڑ کر مارنے کو دوڑی۔

اور وہ مسکراتا ہوا نو دو گیارہ ہو گیا۔

☆☆☆

ریاض چچا اُسے کراچی نانا کے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ نانی' نانا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ مگر جو چاہتیں وہ لیے بیٹھی تھی' وہاں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اُس کا دل چاہا تھا کہ وہ نانی کے سینے سے لگ کر آنسوؤں کے دریا بہا دے۔ مگر اُس کی نانی پکی عمر میں بھی بالوں میں خضاب لگائے مدقوق بالوں کو جوڑے کے انداز میں سمیٹے ہوئے انتہائی ماڈرن سی تھیں۔ سفید سلیولیس بلاؤز میں انھیں دیکھ کر اُس کے دل میں بزرگی کا احترام ہوا سا ہو گیا۔ فریال بہت خوبصورت تھیں۔ صبو تو اُن پر بالکل بھی نہیں گئی تھی......" اوہ مائی گاڈ......! تمہاری دادی نے ٹھسا ٹھسا کر کیسا بے ڈھب کر دیا ہے تمہیں۔ میری بیٹی اور ایسی بے ڈھنگی سی۔" وہ اس کو شانوں سے تھام کر تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماں کے سینے میں منہ چھپا کر اُن سے ایک ایک لمحے کا حساب مانگے۔ اور وہ اتنے انہماک سے اُس کے لیے غذائی چارٹ بنا رہی تھیں کہ وہ انھیں دیکھتی کہ دیکھتی رہ گئی۔

"تمہارا باپ کیسا ہے......؟" یہ پہلا سوال تھا جو انھوں نے اُس کے کمرے میں آ کر کہا۔

"ٹھیک ہیں۔"

"اُن کی بیوی کیسی ہیں؟" انھوں نے تمسخر سے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہی ہیں۔"

"دراصل تمہارا باپ اسی قابل تھا کہ اُس کلو کے ساتھ زندگی گزارے۔ وہ تعلیم یافتہ اور میچورڈ بیوی افورڈ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ کنوئیں کا مینڈک اپنی کھوہ میں ہی خوش رہتا ہے۔"

"امی۔ آپ نے میرے بارے میں نہیں پوچھا کہ میں کیسی ہوں۔" دل میں آیا ہوا سوال آخر اُس کے لبوں پر آ ہی گیا۔

"ارے تمہیں کیا ہونا تھا۔" وہ ہنسیں۔

"آپ نہیں سوچ سکتیں کہ میں کس قدر یاد کرتی تھی۔" آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ بولی۔

"واقعی......" انھوں نے پہلی دفعہ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ان آنکھوں میں نہ جانے کیسا سحر تھا کہ انھوں نے اُسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ تب صبو چیخ چیخ کر روئی کہ سارا گھر دائرے کی شکل میں اُس کے چاروں طرف جمع ہو گیا۔

"فریال آنٹی! یہ اتنی دھوم دھام سے کیوں رو رہی ہیں؟" ایک براؤن آنکھوں والے لڑکے نے اپنی خالہ سے پوچھا۔

"فواد بیٹے! یہ میری بیٹی اتنے عرصے بعد ملی ہے' اتنے عرصے اپنی ماں کو نہیں دیکھا' اُداس ہو گئی ہے میری بیٹی۔"

"آنٹی پھر اُن کو یہیں روک لیں نا۔" فواد نے گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' کریں گے ایسا بھی انتظام۔ ذرا اس شادی سے فارغ ہو لیں۔" وہ بھانجے کی بات پر مسکرا کر بولیں۔

"میں آپ کا فرسٹ کزن ہوں۔" وہ اُس کے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

"اور ہم سب بھی آپ کی خالہ اور ماموں زاد بہنیں ہیں۔" ڈھیر ساری لڑکیاں اُس کے اطراف بیٹھتے ہوئے بولیں۔

تب وہ خوشی سے سرشار اُن کو دیکھنے لگی۔

"آؤ نا' ہمارے ساتھ!" ایک پیاری سی لڑکی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔ تب وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔

اُس نے اُس کے نانا کا بڑا سا گھر تفصیل سے ہر بات بتاتے ہوئے دکھایا کہ فلاں کمرہ کس کا ہے؟ اور فلاں مخصوص کرسی کس کی ہے؟ حسن ماموں جن کی شادی ہو رہی تھی' انھوں نے اس کو ساتھ لے جا کر شاپنگ کرائی۔

"صبو رانی! تم بھی اپنی پسند سے کپڑے خرید لو۔ سب بھانجیوں کے میں نے چار چار سوٹ بنائے ہیں۔ مگر تمہارے لیے کوئی حد نہیں ہے' جتنے دل چاہے اپنے سوٹ لے لو۔"

"مما میں اپنی تیاری سے آئی ہوں۔" اُس نے شرما کر کہا۔

"مگر پھر بھی...... میری خاطر لے لو......" انھوں نے انتہائی محبت سے کہا۔

تب گھاگرا کرتی، مصری شلوار سوٹ، جیسے جدید سوٹ اُس نے خرید ڈالے......

شام کو کالے پرنٹڈ گھاگرے کے ساتھ، سُرخ کرتی پہن کر جب وہ نیچے آئی تو فواد اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ لمبے خوبصورت بال اُس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے...... کاجل سے بے نیاز بھوری بھوری بڑی بڑی آنکھیں اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں کہ وہ سب کو غور سے تکتا دیکھ کر شرما سی گئی۔

حسن ماموں کی شادی بہت شاندار ہوئی۔ شہر کے بڑے ہوٹل میں ولیمے کا اہتمام کیا گیا...... صبو...... شوکنگ پنک شرارہ سوٹ جو وہ بڑی پھوپھو کا اُٹھا لائی تھی، پہنے گھوم رہی تھی۔

رشتے دار خواتین اُسے حیرت اور اچنبھے سے دیکھ رہی تھیں......" ارے یہ فریال کی لڑکی ہے۔ کس قدر بڑی ہوگئی ہے......!"

"ڈدھیال والوں نے اسے کیسے بھیج دیا......؟"

"کم بختوں کو اب ماں کی ممتا کا احساس ہوا ہوگا؟"

"ارے ممتا کیسی، ماں نے کون سا پلٹ کر پوچھا تھا۔ غلطی سے کارڈ بھیج دیا۔ انھوں نے فوراً ہی لڑکی دھکیل دی۔"

"ہاں بھئی، لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ خاصا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ دادی پھوپھیوں نے سوچا ہوگا کہ ماں کے خاندان میں ہی غارت ہو جائے۔" ایک خاتون نے ہنس کر جملہ مارا۔

"اے ہے۔ یہاں کون کرے گا اُس سے......؟"

"جیسا باپ کمینہ تھا، ویسے ہی بیٹی نکلے گی۔"

"بہت مشکل ہوگی۔ دقیانوسی خاندان کی لڑکی لا کر ایک پرابلم کھڑا ہو جاتا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ دیکھنا فریال کس قدر پچھتائے گی۔"

"ارے پچھتائے گی، اپنی تاریخ دوبارہ دہرانا چاہتی ہوگی جس طرح اُس کا نباہ نہیں ہوا نیاز احمد کے ساتھ، اسی طرح مختلف ماحول میں آ کر اُس کی بیٹی گزارا کرے گی......؟"

"ہرگز نہیں، بالکل نہیں۔"

خواتین کے تبصرے تھے کہ ہتھوڑے، پاس کھڑی ہوئی صبو چکرا کر رہ گئی۔ اور آنسو تھے کہ کسی طور رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ چپ چاپ، ساکت سی دیوار سے لگی آنسو بہا رہی تھی۔ اُس سے اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جائے اور تکیے میں منہ چھپا کر

اپنا دل ہلکا کرے۔

"اے رو کیوں رہی ہو......؟" فریال نے گزرتے ہوئے اُسے حیرت سے دیکھا۔

"ابو یاد آ رہے ہیں۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے جز بز ہو کر بولی۔

"دیکھو صبو...... اگر تم میرے پاس رہنا چاہتی ہو تو اُس ذلیل آدمی کا نام بھی اس گھر میں نہیں لوگی۔"

"اور کس کس کا نام نہیں لینا ہوگا؟" وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔

"اپنی دُدھیال میں سے کسی کا بھی نہیں، نہ اپنی ڈائن دادی کا، جو میری خوشیوں کو چٹ کر گئیں اور نہ اپنی چڑیل پھوپھیوں کا جو جونکیں بن کر بھائی کی خوشیوں کو چاٹ گئیں۔ کسی کا بھی نہیں۔" فریال غصّے سے چیخی۔

"اچھا امی۔" صبو سسکتے ہوئے بولی۔

"میری جان! جب تم میری ہر بات ماننے کو تیار ہو تو رو کیوں رہی ہو؟" فریال نے اُسے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"امی! آپ مجھے بہت عزیز ہیں۔ ان سولہ سالوں میں ہوش سنبھالنے کے بعد ایک دن ایسا نہیں گزرا جب میں نے آپ کے بارے میں سوچا نہ ہو۔ مگر یہ سولہ سال نام ہیں دادی اور پھوپھیوں کے۔ جن کی محبت اور چاہت تلے میں پروان چڑھی، جن کی محبت کے بل بُوتے پر مجھ میں یہ احساس تھا کہ کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا...... چھوٹی امی جو مجھے اپنی آنکھ کا کانٹا سمجھتی تھیں۔ وہ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے ان سولہ سالوں کو مٹا ڈالوں۔ نام نہ لوں اپنے چاہنے والوں کا...... ذکر نہ کروں اپنے پیاروں کا...... ابو جنھوں نے میرا کوئی خیال نہ رکھا۔ مگر انھیں دیکھ کر میرا رُواں رُواں اُن میں سمٹ جاتا تھا...... وہ جب بھی مجھے نظر بھر کر دیکھتے تھے، میں متشکر ہو جاتی تھی اپنے رب کی کہ میں یتیم نہیں ہوں۔"

"کیا چاہتی ہو تم......؟ رہو گی میرے پاس، ڈنکا بجاؤ گی میرے دشمنوں کا۔ کھاؤ گی میرا، گاؤ گی ان ذلیلوں کا......" فریال غصّے سے پھنکاریں۔

"نہیں امی! میں آپ کے پاس نہیں رہوں گی...... میں جا رہی ہوں اپنے باپ کے گھر جن کی روٹی کھا کر میں آپ کو یاد کر سکتی ہوں۔ وہاں ایسی کوئی شرط نہیں ہے......"

"مگر یاد رکھو...... وہاں میں فواد کا رشتہ لے کر نہیں آؤں گی، میں تو چاہتی تھی کہ یہاں تمہاری اپنے بھانجے کے ساتھ شادی کر دوں۔ اور جب تمہارے باپ اور دادی کو معلوم ہو تو وہ ہاتھ ملتے رہ جائیں۔"

"نہیں امی...... آپ مجھے معاف کر دیں۔ میرے باپ اور دادی کو اتنی بڑی سزا نہ دیں۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے دل میں اپنی ماں کے لیے کوئی محبت اور اعتماد کے جذبات موجود نہیں ہیں۔"

"امی جان! آپ میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ لیں۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"میں تمہارے خاندان کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں بھی وہی گندے جراثیم موجود ہیں جو تمہارے باوا میں تھے۔"

فریال سے رخصت ہوتے وقت وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مگر فریال چہرے پر تاؤ لیے خاموش کھڑی تھیں...... غصہ اُن کے چہرے سے ہویدا تھا۔

☆☆☆

کراچی سے آ کر وہ مزید اکھڑی سی بن گئی تھی، سوتی تو سوتی چلی جاتی۔ خاموش ہوتی تو دو دو دن کسی سے کوئی بات نہ کرتی۔

فیروز لاکھ کرید کرید کر وہاں کی باتیں پوچھتا۔ مگر مجال ہے کہ اُس نے کچھ بتایا ہو۔

"اچھا، یہ بتاؤ تمہاری امی نے کس طرح تمہیں سینے سے لگایا تھا۔ فلموں کی طرح یا ٹی وی ڈراموں کی طرح۔" وہ اُسے چھیڑتا......

"تم مجھے سمجھتے کیا ہو...... کیا میں کوئی اداکارہ ہوں، ایکٹنگ کرنے گئی تھی وہاں۔"

"یار! میں تو وہاں کی سچویشن کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا ہوں، تم خواہ مخواہ بات کے غلط معنی لے رہی ہو۔"

"آخر آپ کو مجھ سے یا وہاں سے کون سی ایسی دلچسپی ہے جو آپ بال کی کھال نکالے چلے جا رہے ہیں۔"

"اے اتراؤ مت۔ وہاں سے نہ ہو بہر حال آپ محترمہ سے تو ہے۔" اُس نے بھی آستین چڑھا کر غصے کی ایکٹنگ دکھائی۔

"فیروز، ہزار دفعہ کہا ہے، اُلٹی سیدھی باتوں میں میرا نام مت لیا کرو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ ہاں......"

"ارے بڑی تڑی چلتی ہے تمہاری کہ تمہاری اجازت کے بغیر کوئی تمہارا نام لینے کا مجاز نہیں۔"

"ہاں، دادا گیری ہے ہماری۔" وہ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر لڑاکا عورتوں کی طرح بولی۔

"کسی اور کو دکھانا، میرے سامنے نہیں چلے گی۔"

"کیوں نہیں چلے گی، کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟"

"ارے صبو صاحبہ، ہم اپنے آپ کو شہزادہ سمجھتے ہیں۔ اور تڑی دکھانے کا شعبہ ہمارے پاس ہی رہنے دیجئے۔"

"ارے شکل بھی دیکھی ہے اپنی...... بڑے آئے شہزادے کہیں کے!"

"کیوں شکل کو کیا ہوا...... کم از کم فواد سے تو زیادہ خوبصورت ہوں، زیادہ تعلیم یافتہ ہوں۔"

"یہ فواد کا ذکر کہاں سے آ گیا......؟" وہ غصے سے بولی۔

"ہمارے ایک ملنے والے کے طفیل یہ خبر کراچی سے یہاں پہنچی ہے کہ ممانی جان آپ کی شادی اپنے بھانجے سے کرنے کی خواہش مند تھیں۔ اور وہاں آپ کو روکنے پر بھی بضد تھیں۔"

"آپ کو کیسے پتہ چلا......؟" وہ متوحش ہو کر بولی۔

"اے محترمہ، ہزار دفعہ آپ سے کہہ چکے ہیں کہ ہم شہزادے ہیں۔ ہمیں ہر بات کی خبر ہوتی ہے۔ آپ کے پیچھے بھی ہم نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ انھوں نے یہ تمام خبریں ہمیں آپ کے آنے سے پہلے ہی دے دی تھیں۔"

"اگر میں وہاں رک جاتی تو......؟"

"کیسے رک سکتی تھیں۔ ہم نے آپ کو وچن دے رکھا تھا۔ شہزادی۔" وہ آنکھوں میں شرارت سجائے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں تو بس آ ہی گئی، ورنہ امی اتنا روک رہی تھیں۔" اُس نے اترا کر بتایا......!

"محترمہ! کیا امی کے کہنے سے آپ اُن کے بھانجے سے شادی بھی کر لیتیں......؟"

"خدا نہ کرے، میں کیوں کر لیتی شادی اُس سے......؟"

"ممانی جان تو یہی چاہ رہی تھیں نا......؟"

"ہاں، امی کی یہی خواہش تھی۔"

"پھر کیوں نہیں مانیں اُن کی بات......؟"

"میں یہاں سے اپنا ناتا نہیں توڑ سکتی تھی۔" آنکھوں سے رم جھم شروع ہونے لگی۔

"یہی بات تو ہمیں پسند آئی، شہزادی......!" فیروز شوخی سے بولا۔

"اے زیادہ بکواس نہیں کرو......"

"صبو جان! ہمارے پیار میں اتنی طاقت تھی کہ آپ وہاں رک ہی نہیں سکتی تھیں۔"

"فیروز...... ڈائیلاگ بولنے کی نہیں ہو رہی۔ اُٹھو یہاں سے۔ ورنہ آواز دیتی ہوں پھوپو کو۔"

وہ اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا بابا! جاتا ہوں ...... مگر کیا خیال ہے...... امی سے میں کہہ دوں کہ منگنی ہوئے سات برس ہو چکے ہیں۔ اب ماموں جان سے کہہ کر شادی کا انتظام کرا دیں۔''

''اے پھر جھوٹ بولا۔ منگنی کب ہوئی ہے ہماری؟''

''بھئی' امی نے جب ماموں جان سے تمہارے لیے بات کی تھی' انھوں نے رضامندی دے دی تھی تو وہ منگنی ہی ہوئی نا۔''

''مگر میں نے انگوٹھی تو نہیں پہنی تمہارے نام کی۔''

''میں رونمائی میں کنگن پہناؤں گا۔ ہتھکڑی کی طرح...... انگوٹھی پہن کر کیا کرتیں۔''

''مجھے پسند ہیں انگوٹھیاں...... میرے لیے بارہ موٹی موٹی سی انگوٹھیاں لانا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''اے دکھانا اپنا ہاتھ۔ کیا ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں تو نہیں۔ کہیں دھوکے میں میری شادی چھنگو سے ہو جائے۔''

''فیروز کے بچے سارے رومانس پر پانی پھیر کر رکھ دیا۔ چلو' نکلو میرے کمرے سے...... پھو...... پھوا!'' اُس نے آواز نکالی زوردار حلق سے......

''اچھا بابا...... جا رہا ہوں...... آواز ہے کہ پھٹا بانس...... بعد کی ساری لڑائیاں محلے والے بھی سنا کریں گے...... اچھا اتنا تو بتا دو...... امی سے شادی کے لیے کہہ دوں۔''

''ہاں...... ہاں...... ہاں......'' اُس نے زور سے چیخ کر کہا۔

''تھینک یو صبو......!'' وہ اُس کی پونی کھینچتا ہوا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

❀❀❀
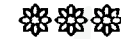
لکی گرل

نٹنگ کرتے ہوئے میرا ذہن ریحان کی طرف تھا' کئی روز سے وہ مجھے دل گرفتہ سا نظر آ رہا تھا۔

نہ ہنسی نہ مذاق...... بس چُپ چُپ اور خاموش سا۔

''کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!'' میں نے کئی بار بڑی تشویش سے پوچھا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہوں' مجھے کیا ہونا ہے۔'' وہ ہنسا' بڑی کھوکھلی سی ہنسی۔

رات اس کے کمرے سے' اُس کے گنگنانے کی آواز باہر آ رہی تھی۔ مجھے حیرت سی ہوئی۔

کان لگائے تو اُس کے دل کا درد مزید نمایاں ہو رہا تھا۔

ریحان کی آواز بہت اچھی تھی۔ خاندان کی تقاریب میں اس کے شوخ و شنگ گیت بے حد پسند کیے جاتے تھے۔ ہارمونیم اور ستار بھی بجا لیتا تھا۔

مگر اُداسی کے گیت اس کے لبوں پر آ کر مزید دُکھ بھرے ہو جاتے۔

اُس کی درد بھری آواز میرا کلیجہ نوچے جا رہی تھی۔

اُس سمت مجھ کو یار نے جانے نہیں دیا
اک اور شہر یار میں آنے نہیں دیا
کچھ وقت چاہتے تھے کہ سوچیں ترے لیے
تو نے وہ وقت ہم کو زمانے نہیں دیا
منزل ہے اس مہک کی کہاں' کس چمن میں ہے
اس کا پتہ سفر میں ہوا نے نہیں دیا
روکا اَنا نے کاوشِ بے سود سے مجھے
اس بُت کو اپنا حال سنانے نہیں دیا

ہے جس کے بعد عہدِ زوال آشنا منیرؔ
اتنا کمال ہم کو خدا نے نہیں دیا

☆☆☆

'ریحان کے دم سے ماشاءاللہ ہمارے گھر میں کتنی رونق ہے۔ اگر یہ خاموش اور چپ چپ ہوتا ہے تو سارا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگتا ہے۔' تنگ کرتے ہوئے۔ میری تمام تر سوچیں اُسی کی جانب مرکوز تھیں۔

صبح بھی جلدی میں تھا۔ ناشتہ برائے نام کیا تھا' اور جب میں نے اُس کی پسند کے برگر اُس کے سامنے رکھے' تو وہ اُنہیں چکھے بغیر اُٹھ گیا۔

''اے' یہ اتنی محبت سے بنے ہیں اور تم نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔'' میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''دیر ہو گئی ہے آج' منیجر کا دماغ بھی خراب چل رہا ہے۔ آ کر کھا لوں گا۔'' بائیک کی چابیاں اُٹھا کر وہ برق رفتاری سے نکل گیا۔

''دیکھ رہے ہیں آپ ریحان کو' آج کل کچھ نہیں کھا رہا ہے۔ رات بھی برائے نام کھانا کھایا تھا اور اس وقت' چائے کے دو سپ لے کر کپ ایسے ہی چھوڑ دیا ہے اور یوں ہی آفس چلا گیا۔''

''لگتا ہے' اب موصوف کو دفتر کے لیے اُٹھانا بھی پڑا کرے گا' جس طرح بچوں کو اسکول کے لیے اُٹھاتے ہیں' ان کو بھی اُٹھا دیا کریں گے' کہ جلدی سے اُٹھ جاؤ۔ ورنہ دفتر بھوکے جاؤ گے۔'' عدنان مسکرا کر بولے۔

''ابھی تک بچہ بنا ہوا ہے۔'' وہ اخبار پڑھتے ہوئے بولے۔

''یہ بات نہیں ہے۔ ان دنوں وہ پریشان پریشان سا لگ رہا ہے اور کچھ بتاتا تک نہیں ہے۔'' میں نے اُنہیں بتایا۔

''نئی نئی نوکری ہے۔ ابھی شاہانہ عادتیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ بات ہے۔ خود ٹھیک ہو جائے گا۔''

مگر میرا ذہن عدنان کی دلیل سے صاف نہیں ہوا تھا۔

کوئی بات ایسی ضرور تھی جو وہ یوں خاموش سا تھا۔

بچے کو تھپکتے ہوئے وال کلاک پر جب نظر ڈالی تو اس کے آنے کا ٹائم ہو چکا تھا مگر وہ ابھی گھر نہیں آیا تھا۔

اُس کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ کہیں جانا ہوتا تو یونیورسٹی اور آفس سے گھر آنے کے بعد جاتا یا پھر فون پر اطلاع دیتا' مگر آج وہ اپنے مقررہ ٹائم سے پینتالیس منٹ لیٹ تھا۔

''اللہ اُس کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔'' میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ یہ حقیقت تھی کہ ریحان سے مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیار تھا کہ ہماری چھوٹی سی فیملی میں اُس کے قہقہے رونق بکھیرا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ اُس کی خاموشی اور افسردگی مجھے بے حد محسوس ہوتی تھی۔ اسٹیریو کی تیز آواز نے مجھے چوکنا کر دیا۔ شاید بچے چاچو کے کمرے میں گھس گئے ہیں اور تیز میوزک لگا رہے ہیں۔

''خیرو' منع کرو' بچوں کو' ریحان کے کمرے میں گڑبڑ نہ کریں۔'' میں نے ملازمہ سے کہا۔

مگر اسی اثنا میں وہ میٹرس کی سیڑھیاں پھلانگتا اور سیٹی پر دُھن بجاتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

''بھابی۔ آپ یہاں بیٹھی ہیں' میں آپ کے کمرے سے ہوتا ہوا باورچی خانے میں جھانکتا ہوا' لان کو گھورتا ہوا یہاں آیا ہوں۔'' وہ سرشاری سے بولا۔

''چھت نہیں دیکھی' لائٹ چلی جاتی ہے تو وہاں جا کر بھی بیٹھتی ہوں۔'' اُس کی بات سن کر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

''ارے اب لائٹ جاتی ہے تو چلی جائے' ہمارے گھر میں خوب روشنی ہونے والی ہے۔''

''ہر طرف چکا چوند ہو جائے گی۔''

''ہر سمت اُجالا ہو گا۔''

''جدھر نظر اُٹھے گی۔ کرنیں بکھری ہوں گی۔'' اُس نے جیسے تقریر کر ڈالی۔

''اچھا' یہ بات ہے۔ بینک گئے تھے یا کسی پروگرام کی کمپیئرنگ کر کے آئے ہو۔'' (وہ ایک اچھا کمپیئر بھی تھا)

''ارے بھابی! اسٹیج کے پروگرامز کی کیا کمپیئرنگ کرنی' اصل مزہ تو یہ ہے کہ زندگی سے دو دو ہاتھ کیے جائیں۔ اس سے مکالمہ بازی ہو۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''بالکل نیک خیال ہے۔ مگر سلیس اردو میں بتاؤ کہ کام کیا ہے؟'' کچھ کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ وہ آخر کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

''آج شام کی چائے کے ساتھ ذرا اہتمام کر لیجیے گا۔'' اُس نے لاڈ سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی ساڑی تبدیل کرتی ہوں' جیولری بھی اچھی پہن لیتی ہوں' ہاں میک اپ بیوٹی پارلر میں جا کر کروا کر آؤں یا خود کر لوں' مگر بچوں کے کپڑے ڈھنگ کے نہیں ہیں' خیر

ابھی بازار جا کر لے آتی ہوں' تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد اپنی تیاری کے مراحل مکمل کر لیتی ہوں۔'' میں نے شرارت سے کہا۔

''ارے' آپ جیسی پیاری سی' کیوٹ سی بھابی کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے' آپ تو ہر حلیئے میں بیوٹی کوئین ہیں' بس ذرا چائے کے لوازمات اچھے سے تیار کروا دیجئے' ورنہ آپ کی یہ خیرو تو خالی بسکٹ اور بدمزہ چائے پر ٹہلا دی گی کسی کو۔'' وہ بے تابی سے بولا۔

''کیوں بھئی' کس خوشی میں؟ کوئی پرائز بونڈ نکل آیا ہے تمہارا؟''

''یہی سمجھ لیجئے...... کہ آخر قسمت نے دستک دے ہی دی۔''

''کتنے کا ہے؟'' میں خوشی سے جھوم گئی۔

''اندازہ آپ لگائیے گا۔'' وہ ہنسا۔

''اے' سیدھی طرح بات کرو۔ یہ معموں میں کیا کہہ رہے ہو۔'' میں نے اُسے چھیڑا۔

''آپ سمجھ جائیے نا......'' وہ خوشی سے ہنسا۔

''یہ چکر کیا ہے مسٹر؟'' میں نے متوحش ہو کر پوچھا۔ ''کہ صبح مُنہ لٹکائے بینک گئے تھے اور جب آئے ہیں تو جون ہی بدلی ہوئی ہے۔ یہ چند گھنٹوں میں کیا ماجرا ہو گیا؟'' میں اُس پر خوب جرح کر رہی تھی۔

''کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔'' وہ اِترایا۔ ''آج وہ آ رہی ہے۔''

''ہمارے گھر۔''

''میرا ارمان بڑھانے۔'' اُس نے سیٹی پر کہا۔

''کون آ رہی ہے' سیدھی طرح بتا دے۔''

''جانِ جاناں......'' اس نے سیٹی پر دُھن بجا کر بتایا۔

''اے ہے' وہ لکھنؤ والے تو نہیں آ گئے۔'' عدنان نے پچھلے ہفتے ہی ان لوگوں کو جلدی آنے کا خط لکھا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ' آپ کے دماغ میں تو ہر وقت وہی قطامہ سوار رہتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے' اس کے سوا دنیا میں کوئی لڑکی رہی نہیں ہے' بس وہی ڈائن بچی ہے' میرا خون چوسنے کے لیے۔''

''ریحان' یوں نہیں کہتے۔'' میں نے برہم ہو کر کہا۔

''آپ بھی تو سارے موڈ کا ستیاناس کر کے رکھ دیتی ہیں۔''

''پھر صاف کیوں نہیں بتاتا کہ شام کو کون آ رہا ہے؟ گھر کے دھندوں' بچوں کے جھگڑوں اور تمہارے بھائی جان کی موٹی موٹی فلسفیانہ باتیں سننے کے بعد دماغ میں اتنا دم رہتا ہے کہ

اُلجھی باتوں کو بھی سُلجھاتی پھروں۔''

''اُلجھی باتیں!'' وہ حیرت سے بولا۔

''دیکھ بھئی' مجھ سے تو صاف صاف بات کیا کر' یہ گُھما پھرا کر اپنی بیوی کو چکر دیا کرنا' بھابی کو تو معاف ہی رکھا کر۔''

''اچھا تو سنیئے بھابی جان کہ آج شام' فرحت آ رہی ہے۔ وہ صرف فرحت ہی نہیں' بلکہ آپ کے لاڈلے دیور کی فرحتِ جاں بھی ہے۔ اُس کی خوب خاطر ہونی چاہیے۔ پہلی دفعہ آ رہی ہے' وہ بھی بڑی مشکلوں سے مانی ہے۔''

''یہ ہے کون؟ اور تجھے کہاں ملی؟'' میں نے جھلا کر کہا۔

''میرے ساتھ بینک میں کام کرتی ہے۔ گریڈ II آفیسر ہے' میرے ساتھ۔ بہت قابل ہے اور بہت ہی سوئٹ۔'' اُس کی آنکھوں میں خواب لہرائے۔

''آ رہی ہے تو آ جائے' ایک ساتھ کام کرنے والے آپس میں ملا ہی کرتے ہیں۔'' میں نے لاپروائی سے چھوٹے کا سوئٹر بننا شروع کر دیا۔

''بھابی پلیز۔ میری بات سنیں۔'' وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔

''ہاں' ہاں' میں سُن رہی ہوں۔'' میں نے مسکراہٹ دبائی۔

''وہ...... وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں' وہ میرے لیے وہ ہے۔'' ریحان نے ہکلا کر اپنا مفہوم پورا کرنا چاہا۔

''ہاں' میں سمجھ رہی ہوں' تمہاری بات۔ کلام جاری رکھا جائے۔'' میں بدستور سوئٹر بُنتے ہوئے بولی۔

''خدا کے لیے یہ سلائیاں اُٹھا کر رکھ دیں۔'' وہ سوئٹر لے کر پٹختا ہوا بولا۔ ''جب آپ یہ دو سیدھے' تین اُلٹے اور پانچ اوندھے بنتی ہیں نا تو بات نہیں ہوتی۔''

''ارے' یہ کیا کیا' پھندا گرا دیا تم نے۔''

''ہاں' ایک پھندہ گر گیا تو آپ چار اُٹھا لیجئے' آپ کا نمونہ بن جائے گا' مگر خدا کے لئے میرے گلے سے لگنے والی کا پھندہ کھول دیں اور مجھے فرحت کا ہو جانے دیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔''

''تمہیں بہت پسند ہے وہ۔'' میں مسکرائی۔

''یہ ہوئی ناں بات۔'' وہ میز پر مُکا مار کر قہقہہ لگا کر بولا۔

''کیسی ہے وہ؟''

”بہت اچھی‘ بہت ہی سوئٹ!“

”جب وہ بولتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ کسی جھرنے کے پاس بیٹھا اس کا ترنم سن رہا ہوں۔“

”جب وہ ہنستی ہے تو کائنات مسکراتی ہے۔“

”چشمے سے اُبلتا پانی جو ردھم پیدا کرتا ہے وہ اس کی نقرئی ہنسی میں ہے۔“

”اے شاعر صاحب! سر میں سخت درد ہے‘ آپ مزید بکواس کرنے سے احتراز کریں‘ جب وہ صاحبہ آئیں گی تو ہم بھی چشمے‘ جھرنے دیکھ لیں گے۔“

شام سات بجے فرحت اپنی بہن کے ساتھ آئی تو واقعی بے حد پیاری سی تھی۔ دراز قد‘ سبک سا ناک نقشہ اور اس کی آواز واقعی حلاوت آمیز تھی۔ شستہ لہجے میں بات کرتی ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں سروس کرنے والی لڑکیوں کی طرح جارحانہ انداز بھی نظر نہیں آئے تھے۔

”بھابی‘ آپ ہمارے گھر آیئے گا۔“ اُس نے اپنی بڑی بڑی پلکوں کو حیا سے جُھکاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”میں کوشش کروں گی۔“ میں نے دل میں آہ دباتے ہوئے وعدہ کیا۔

تب ریحان کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں ممنونیت کی قندیلیں سی روشن ہوگئیں۔

”مائی سوئٹ بھابی جان۔“ وہ میرا ہاتھ دباتا ہوا اُس کو رخصت کرنے گیٹ سے باہر چلا گیا۔

”ریحان‘ میرے بھائی‘ میرے بچے! کاش میں تمہارے لیے کچھ کرسکوں۔“ آنکھوں میں آئے آنسو میں نے بہ مشکل روکے۔

رات کو میں نے فرحت کے بارے میں عدنان کو بتایا تو وہ ہتھے سے اُکھڑ گئے۔

”رعنا‘ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ریحان کا رشتہ لتاں طے کرگئی ہیں۔ تو فرحت کی کہانی مجھے سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ لڑکے جب نئے نئے نوکری سے لگتے ہیں تو شادی کا شوق اسی طرح سب کے اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے‘ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کے لیے دیوانے ہوگے ہیں۔“

”فرحت سے پہلے اُنہیں تسیم پسند تھی اور ان سے پہلے اسماء اور جب لکھنؤ والی آجائے گی تو وہ سب کو بھول جائے گا۔“

”وہ اور قسم کا ہے۔ آپ کو نہیں معلوم‘ اُس کی پسند ناپسند سے میں خوب واقف ہوں۔ اسماء اور تسیم اچھی فیملیز سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ وہ خود اُس کی جانب بڑھی تھیں۔ ریحان نے اُن کی جانب پیش قدمی نہیں کی تھی۔“

”ظاہر ہے کہ وہ بڑھتا بھی کیوں‘ ان لڑکیوں کے گھرانے نیچ سے تھے۔ کیا وہ پاگل تھا جو وہ

اُن سے شادی کرتا‘ مگر بہر حال ایک سلسلہ تو رہا ناں۔“

”عدنان پلیز۔ یہ دل کے معاملوں میں اونچ نیچ کچھ نہیں ہوتی اور ہمارا ریحان تو بہت سادہ لوح ہے‘ سچا اور کھرا وہ جب کسی کو چاہتا ہے تو جی جان سے چاہتا ہے۔ شاید میرا کوئی اپنا بھائی بھی ہوتا‘ تو مجھ پر یوں جان نہ چھڑکتا‘ جو ریحان میں بات ہے‘ وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔“

”اب ہم کچھ نہیں کرسکتے رعنا‘ یہ لتاں کا فیصلہ ہے۔“ عدنان پریشان ہوکر بولے۔

لتاں نے لکھنؤ کا آخری چکر اپنی شدید بیماری کے زمانے میں لگایا تھا۔ یہ اُن کی خواہش تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کی قبروں پر ہو آؤں اور وہاں اپنی کسی دُور پرے کی بھانجی جو اُن دنوں کسی قریبی گاؤں سے لکھنؤ آئی ہوئی تھی۔ اُس سے ریحان کی منگنی کرآئیں۔ (کہ رشتے داروں کے حقوق بھی ہوتے ہیں)

ریحان اُس زمانے میں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا‘ پاکستان آکر جب اُنہوں نے بتایا تو سب ہی سناٹے میں آگئے۔

ریحان شوخ و طرار قسم کا لڑکا‘ بغیر دیکھے کیسے شادی کرلے گا۔ ریحان نے تو سن کر ہی واویلا مچادیا تھا کہ اماں بھی بولا کر رہ گئی تھیں۔

مگر اماں کے انتقال کے بعد لتاں کی‘ کی ہوئی منگنی کی وقعت بڑھ گئی‘ خاص طور پر عدنان اس رشتے پر خاصے سنجیدہ ہوگئے تھے‘ جب کہ ریحان جھنجلا کر رہ جاتا تھا۔

”بھابی! جب میں پچاس دکانیں گھوم کر دیکھتا ہوں‘ تب مجھے اپنے لیے کپڑے اور جوتے پسند آتے ہیں اور بیوی جو زندگی کی ساتھی ہوتی ہے‘ اس کو بغیر دیکھے قبول کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“

”یہ کرو کہ پہلے دس لڑکیاں برت کر دیکھ لو‘ جو بیوی کے معیار پر پوری اُترے‘ اُس سے بیاہ کرلینا یا یوں ہی زندگی گزار دینا۔“ میں جل کر کہتی۔

”بھابی! آپ تو ناراض ہوجاتی ہیں۔“ وہ مجھے مناتا۔

”مغرب میں تو ایسا ہی ہوتا ہے‘ یہاں بھی ایسا ہونے لگے تو اچنبھے کی کیا بات ہے؟“

”اے لکھنؤ والی جادوگرنی‘ خدا تجھے غارت کرے‘ تُو نے اتنی دور سے کیسا سحر پھونکا ہے کہ لوگ تجھے دیکھے بغیر تیری کتنی وکالت کرتے ہیں۔“ وہ ناراض ہوکر اول فول بکتا چلا جاتا۔

اور میں بے چین سی ہوجاتی‘ اب فرحت کو دیکھ کر میرا بھی یہ دل چاہ رہا تھا کہ لکھنؤ والی ڈوب مرے اور ریحان کی فرحت سے شادی ہوجائے۔

فرحت کی بہن سے بھی باتوں باتوں میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اُن کے والدین فرحت کی جلد

شادی کے خواہش مند ہیں اور کئی پروپوزل بھی آئے ہوئے ہیں۔

"فرحت بھی اچھی لڑکی ہے۔" میں نے عدنان کے سامنے پھر وکالت کی۔

"رعنا! میری بات تو غور سے سن لو لتاں کے تین بیٹوں نے اپنی اپنی پسند سے شادیاں رچائیں' ریحان جو سب سے چھوٹا ہے' وہ لتاں کی آخری خواہش ضرور پوری کرے گا' ورنہ وہ قبر میں بے چین ہو جائیں گی۔"

"ارے چھوڑیئے' لکھنؤ والی کو' اب لتاں کون سی زندہ بیٹھی ہیں جو واویلا مچائیں گی اور پھر ریحان کی بھی یہی خواہش ہے' زندگی اُس نے گزارنی ہے' آپ کو اُس کی بات مان لینی چاہیے۔"

"اگر یہ بات ہے تو وہ خود جا کر جہاں دل چاہے کرے' ہمیں کوئی غرض نہیں۔" وہ انتہائی متاسف لہجے میں بولے۔

صبح جب میں نے ریحان کو ساری روداد سنائی تو اُس کا منہ اُتر گیا۔ "خدا ہی تجھے سمجھے لکھنؤ والی۔" وہ دانت پیستا ہوا بینک روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

فرحت کی شادی کو ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ میں نے ایک فنکشن میں ریحان کو ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی سے بے حجابانہ گفتگو کرتے دیکھا۔

وہ گلابی سوٹ میں اَدھ کھلی کلی لگ رہی تھی۔

تراشیدہ بال اس کا منہ چوم رہے تھے۔ وہ دونوں ورائٹی پروگرام دیکھنے کے بجائے ایک دوسرے کی باتوں میں مست تھے۔ ریحان نے اُس کی انگلیاں یوں تھامی ہوئی تھیں جیسے کلیاں بین رہا ہو۔

"اے دیور صاحب! کون تھی وہ میم؟"

"کون سی والی؟" وہ مکاری سے ہنسا۔

"جس کے ساتھ تم کل باتیں بنا رہے تھے آڈیٹوریم میں۔"

"اوہ اچھا' دیکھ لیا آپ نے' بڑی تیز نظریں ہیں بھابی جی!"

ارے' سمجھا کیا ہے تم نے' بڑے اوصاف ہیں ہم میں۔"

"اچھا' ماشاء اللہ۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسا۔

"ہم تو شکل دیکھ کر پہچان جاتے ہیں کہ کتنے درجے کا عشق ہے اور بندہ عاشقی کا کتنا ٹمپریچر افورڈ کر سکے گا۔"

"اوہ...... آئی سی۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر سیٹی بجا کر رہ گیا۔

"ہاں' اب سیدھی طرح شرافت سے بتاؤ کہ تمہارے چکر کا زاویہ ابھی قائمہ' یا منفرجہ معکوس بننے میں کتنا وقت لے گا۔"

"بھابی جی! چھوڑیئے یہ باتیں۔ آپ تو بس یہ بتائیں کہ وہ آپ کو کیسی لگی؟"

"ہاں اچھی تھی!"

"بس اچھی تھی صرف۔" وہ برا مان گیا۔

"ٹھیک تھی بھئی۔ اسمارٹ' سلم۔ اور کیا کہوں؟"

"ارے بھابی جان' کھلے دل سے تعریف کرنا سیکھئے اور کہیے کہ وہ بے حد خوبصورت تھی۔"

"اچھا چل' ہو گی خوب صورت' تو یہ بتا کہ اُسے کہاں دریافت کیا؟"

"ہمارے بینک کی ایک کلائنٹ ہے' بہت بڑا اکاؤنٹ ہے اُس کا۔"

"مگر تم سے کیسے ٹکرا گئی۔"

"بس ہماری وجاہت کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔"

"اب کیا چاہتی ہے؟"

"ہماری بن کر' آپ کے قدموں میں زندگی گزارنا چاہتی ہے۔"

"پھر تم شادی کرو گے اُس سے؟"

"پلیز بھابی جان! آپ بھائی جان کو سمجھایئے ناں' خود تو اپنی پسند سے کر لی' ہماری راہ میں روڑے انکارہے ہیں۔"

"لکھنؤ والی کے مسئلے نے تو خواہ مخواہ کی پریشانی پیدا کر رکھی ہے' آج کل لوگ نکاح توڑ دیتے ہیں اور تمہارے بھائی جان اپنی لتاں کی بات نبھا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیسے اور کیوں کر لتاں کو گھیر کر رشتہ طے کروا دیا۔"

"بھاڑ میں جائے وہ لکھنؤ والی' کل کی مرتی' وہ آج مر جائے۔ بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا اس کم بخت نے۔ اگر منحوس کو طبعی موت نہ آئے تو خدا کرے' وہ حادثاتی موت میں ختم ہو جائے۔" وہ غصے سے چلا رہا تھا۔

"کاش عدنان اس رشتے کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بناتے۔" میں کہہ رہی تھی۔

"سویٹ بھابی جان! آپ میری بات غور سے سنیں۔ لتاں جان مر چکی ہیں میں زندہ ہوں' آپ لوگ مردہ لوگوں کے ارمانوں کو زندہ رکھتے ہیں اور زندہ لوگوں کے ارمانوں کو مار دیتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ یہ کہاں کی نیکی ہے؟" وہ میرے قدموں میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"تمہارے بھائی کو کون سمجھائے۔ جو لتاں کی بات کو پتھر کی لکیر سمجھے بیٹھے ہیں' انہوں نے

لتاں کی مرضی اور پسند کے خلاف باہر شادی کی' اب تمہارے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہوں گے۔'' میرا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا' اور آنسو خود بہ خود بہنے لگے۔

بھائی کے نام پر وہ ہونٹ کاٹتا ہوا سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ پورے ایک ہفتے بینک سے چھٹی پر رہا' سارا سارا دن جانے کہاں کہاں واہی تباہی گھومتا رہتا اور رات کو آ کر سو جاتا۔

میں سمجھ گئی کہ وہ اپنے آپ سے لڑ رہا ہے۔

اپنے سپنوں کو کچل رہا ہے۔

مگر بھائی کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں بھائیوں میں بے پناہ محبت تھی۔

اتنی محبت کہ شاید باپ بیٹے میں بھی نہیں ہو گی۔ جتنی کہ ان دونوں بھائیوں میں تھی۔ بقیہ دونوں بھائی تو باہر کے ملکوں میں اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ مست تھے' مگر یہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

میں نے بارہا موسم سرما کی طویل راتوں میں عدنان کو دیکھا تھا۔ وہ رات میں کئی بار اُٹھ کر ریحان کی رضائی ٹھیک کر کے آتے تھے۔

''ارے' کیا وہ بچہ ہے۔ جو راتوں کو اس کو رضائی اُڑھانے جاتے ہو۔'' مجھے ہنسی آ جاتی۔

''تم نہیں جانتیں رعنا' یہ اُس کے بچپن کی عادت ہے کہ بہت گہری نیند سوتا ہے' بے خبری میں اکثر لاتیں مار کر لحاف بیڈ سے نیچے گرا دیتا ہے۔ اور ساری رات تکیے سے چمٹا سوتا رہتا ہے۔ بے چین سا' مگر نیند میں اُس کی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ نیچے سے اپنا لحاف اٹھا لے۔''

''سنو جی' کب تک لحاف اُڑھاتے رہو گے اپنے لاڈلے بھیا کو۔'' میں اکثر انہیں چھیڑتی۔

''جب تک اُس کی شادی نہیں ہو جاتی۔''

''نہیں' بعد میں بھی جا کر اُڑھا دیا کرنا' کہ ہم اپنے بھائی کو لحاف اُڑھانے آئے ہیں۔'' میں مزید چھیڑتی۔

''ہشت۔'' وہ شرم سے سرخ ہو جاتے۔ تب اُن کا معصوم سا چہرہ دیکھ کر مجھے اُن پر فخر ہوتا' کتنے اچھے ہیں عدنان اور کتنا خوش قسمت ہے یہ ریحان' جسے اپنے بھائی کی اتنی محبت حاصل ہے۔

عدنان کے کئی خط انڈیا جا چکے تھے۔ جن میں جلد شادی کا تقاضا تھا مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ کسی جاننے والے کے ہاتھ دستی خط علیحدہ بھجوائے تھے مگر وہ تو کسی کا بھی جواب نہیں دے رہے تھے۔

تنگ آ کر عدنان نے اُنہیں لکھ ڈالا کہ آپ لڑکی کا رشتہ کہیں اور کرنا چاہتے ہیں تو براہ کرم

ہمیں مطلع کر دیں تا کہ ہم بھی یہاں پاکستان میں اپنے بھائی کی جلد شادی کر سکیں۔

عدنان نے چوں کہ خاصا سخت خط لکھا تھا' ہمارا خیال تھا کہ اب آر یا پار۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا' واقعی اس خط کا اثر ہوا۔ لڑکی کے بھائی نے بڑے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی مفلوک الحالی کا رونا رویا تھا اور کہا تھا کہ ''ابھی ہمارے حالات اس قابل نہیں ہیں کہ شادی کے بارے میں سوچ بھی سکیں۔ آپ کی والدہ کی یہ محبت اور عنایت تھی کہ یہ رشتہ طے ہوا۔ آپ ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ آپ کو انڈیا آنے کی ضرورت نہیں' ہم لوگ خود پاکستان آ کر بہن کی شادی کر جائیں گے۔''

یہ جواب پڑھ کر عدنان کو خاصا دھچکا لگا' کہ پتہ نہیں ان لوگوں کے معاشی حالات کتنے خراب ہیں اور ہمارے منع کرنے کے باوجود کون سی تیاریاں کر رہے ہیں۔

مگر ریحان اُن کا جواب پڑھ کر جھوم اُٹھا تھا۔

''ارے بھائی جان! آپ اُن کے اس جواب سے فائدہ اٹھایئے ناں اور لکھ دیجئے کہ بھائی صاحب! جب آپ کے حالات اچھے ہوں تو اپنی بہن کا وہیں کسی سے قصہ پاک کر دیں اور ہمارے بندے پر ظلم کرنے سے احتراز کریں کہ وہ میڈ اِن انڈیا لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''چاچو! جب آپ کی شادی لکھنؤ والی سے ہو جائے گی تو آپ ہر سال انڈیا جایا کریں گے ناں۔'' ثمرہ نے اپنے چاچا کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

''چاچو' آپ مجھے لے کر جایا کریں گے؟'' احمر بھی ریحان کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

''نہیں' چاچو کے ساتھ صرف میں جایا کروں گی۔'' ثمرہ چیخی۔

''نہیں' میں بھی جاؤں گا۔'' احمر نے بھی آواز بلند کی۔

''دیکھئے بھابی! ایک ناگہانی خرچے کی سمت' جو بڑی تیزی سے میری طرف حملہ آور ہو سکتا ہے۔''

''کیسا خرچہ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ اگر خدانخواستہ لکھنؤ والی ہمارے گھر آ گئی تو موصوفہ کو سال' چھ مہینے کے بعد میکے کی ہُڑک اُٹھا کرے گی۔ بھیجو تو جیب کا خون۔ نہ بھیجو تو اُن کے ارمانوں کا خون' اور یہ ایک ناگہانی مصیبت نہیں ہو گی۔ ذرا غور کریں غور۔''

''ارے پگلے' بیویاں کوئی خریدی تھوڑی جاتی ہیں کہ نکاح کے دو بولوں میں آپ انہیں ہاؤس اریسٹ کر لیں۔ اُن کے بھی بہن بھائی ہوتے ہیں' ماں باپ ہوتے ہیں' وہ اپنے سب محبت کرنے والوں کو فنا کر کے تو نہیں آتیں ناں۔''

"ستارہ کو دیکھو' تمہارا خالہ زاد بھائی ہے' اس کی دلہن بھی انڈیا سے آئی ہے۔ کتنی اچھی ہے۔ کتنی مہذب ہے اور کتنی سیدھی سادی ہے' جو اُس کا میاں کہتا ہے' وہی کرتی ہے۔ آج کل کی خرانٹ لڑکیوں کی طرح نہیں ہے کہ شوہر کی جان عذاب کر کے رکھ دیتی ہیں' کیسی مثالی زندگی گزار رہے ہیں' وہ لوگ۔"

"پھر ملتاں جان دنیا دیکھی ہوئی تھیں۔ انہیں یقیناً اس لڑکی میں کوئی خاص بات نظر آئی ہوگی جو بغیر کسی سے رائے لئے' وہ اتنا بڑا فیصلہ کر آئیں۔"

"ارے بھابی! اگر وہ وہاں کی بی اے پاس بھی ہوئیں تو ہمارے پاکستان کی میٹرک پاس کی برابری نہیں کر سکتیں پھر شرم و حیا کی پوٹ ہوں گی' بھائی جان کے سامنے بھی گھونگھٹ نکال کر آیا کریں گی اور پہلے آپ' پہلے آپ کے چکر میں' روز ناشتے کے بغیر دیر سے بینک جانا پڑے گا۔"

"چل ہٹ' پگلا کہیں کا' بے حیائی اور بے ہودگی کوئی عورتوں کو زیب دیتی ہے بھلا' شرم و حیا تو عورتوں کو کندن بنا دیتی ہے' اور اس کے اثرات آئندہ آنے والی نسلوں پر پڑتے ہیں۔"

☆☆☆

پھر جانے کیا ہوا' سُوکھی زاہدہ ریحان کو پسند آ گئی۔

زاہدہ میرے دُور پرے کے میکے کی رشتے داروں میں سے تھی۔ مگر بڑی کمینہ فطرت لڑکی تھی۔ پہلے ہمارے ماموں زاد بھائی سے زور دار عشق چلایا اور انہیں کنگال کر کے رکھ دیا۔

وہ تو میں نے ماموں اور ممانی کے گھرانے کو بہ مشکل بچا لیا ورنہ وہ تو پورے خاندان کو قلاش کر کے رکھ دیتی۔

مجھ سے تو اُسے سخت بیر تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی چتون خود بخود چڑھ جاتی' اب وہ کسی کالج سے منسلک تھی۔

بینک میں پیسے جمع کرنے اور نکالنے کے چکر میں آئی تو ریحان کو پھنسا بیٹھی۔ اُسے اس وقت یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ ریحان میرا دیور ہے۔

ریحان جو بے حد شوخ اور نٹ کھٹ سا تھا۔ لڑکیوں کے سلسلے میں نہایت بھوندو تھا۔ ہر لڑکی اُس کو بہ آسانی پٹا سکتی تھی۔

اور پھر زاہدہ تھی بھی کیا' خوب صورتی کا دُور دُور تک اس کے پاس سے گزر نہ تھا' خاندان کے لوگ اُسے سوکھی زاہدہ کہتے تھے۔

ناغے کے دن کی پیدائش تھی کہ بدن پر بوٹی ہی نہ تھی۔ چرخ سا چہرہ' سُوکھے سُوکھے ہاتھ پیر' سڑیل سا بدن جس میں گداز نام کو نہ تھا۔

مگر وہ بلا کی جامہ زیب تھی اور ساڑھیاں پہننے کی شدت سے شوقین' چھوٹے چھوٹے تنگ بلاوز اُن کے سوکھے پنے کو مزید اُجاگر کرتے۔

ایک دفعہ ہم نے اُنہیں ہمدردی میں ہی مشورہ دیا تھا کہ زاہدہ تم ساڑی کے بجائے خوب گھیر دار شلوار اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنا کرو' اس سے تمہارے دُبلے پن کا راز یوں افشانہ ہوگا' جیسے ساڑھیوں میں فاش ہوتا نظر آتا ہے۔

ہمارا یہ کہنا تھا کہ وہ ہمیں یوں کاٹ کھانے کو دوڑیں کہ نہ جانے کب سے جلی بیٹھی تھیں۔

"میرے پاس نت نئی ساڑیوں کا خاصا بڑا اسٹاک ہے اور لوگ میری ورائٹی دیکھ کر مارے حسد کے مرے جاتے ہیں اور پھر موٹے لوگوں کا تو کوئی فکر ہی نہیں ہوتا۔ کچھ بھی پہن لیں' کوئی خاص فرق نہیں پڑتا' آپ کو تو سلمنگ سینٹر جوائن کرنا چاہیے۔ کیوں عدنان بھائی کا صبر سمیٹ رہی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

اس کا قل قل کرتا قہقہہ نیزے کی انی بن کر دل میں کھب گیا اور دل چاہا کہ اس ہڈیوں کی مالا کو سمیٹ کر کہیں دور پھینک آؤں۔

کم بخت کو بات کرنے کی تمیز نہیں تھی اور نہ ہی چھوٹے بڑے کا لحاظ تھا۔ یہی سوچ لیتی کہ ریحان پر ڈورے ڈال کر پالا تو آخر میرے ساتھ ہی پڑنا تھا۔

مگر وہ پوری بد ذات قسم کی لڑکی تھی۔ پتہ نہیں' ریحان سے کیسی لچھے دار قسم کی باتیں کیں کہ وہ سُوکھی زاہدہ کے عشق میں پور پور گرفتار تھے اور روز میری خوشامدیں کرتے۔"

"پلیز بھابی جان' آپ بھائی جان کو سمجھائیں' بیویاں تو بہت سی جنگی چالیں جانتی ہیں۔ آپ کیسی بیوی ہیں کہ میاں کو کسی راہ پر لا نہیں سکتیں۔ پیاری بھابی' آپ ہی کوئی چال چلئے اور زاہدہ کو میرا بنا دیجئے۔"

"تم زاہدہ کے ساتھ خوش رہ سکتے ہو؟" میں پوچھتی۔

"بالکل رہ سکتا ہوں۔ پھر وہ تو آپ کی رشتے دار ہے۔ آپ کو اس قدر چاہتی ہے' آپ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی' آپ کے دل میں بھی یقیناً اُس کے لیے کوئی "سافٹ کارنر" ہوگا۔ اُسی کے صدقے آپ بھی کچھ کیجئے ناں۔"

ریحان کی یہ باتیں سن کر اکثر میں پریشان سی ہو جاتی۔

"خدایا' کس قدر آفت لڑکی ہے یہ زاہدہ' لڑکے کو خوب ہی اُلّو بنا رکھا تھا۔"

"مجھے جتنا وہ چاہتی تھی یا وہ جتنی میری عزت کرتی تھی' میں خوب جانتی تھی مگر ریحان کی چاہت اور تعظیم دیکھ کر اُس نے کیسے کیسے پانسے پھینک رکھے تھے۔"

ریحان اُن بے وقوف مردوں میں سے تھا جو چلتر عورتوں کے پورے قابو میں ہوتے ہیں۔ میں اُسے اکثر سمجھاتی۔ "ارے پاگل لڑکے! زاہدہ کو کبھی غور سے بھی دیکھا ہے یا یوں ہی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے۔"

"اللہ بھابی! اس قدر تو سویٹ ہے وہ' مجھے بے حد چاہتی ہے' اور اس کی آواز اتنی سُریلی ہے کہ کیا بتاؤں' کبھی آپ اس سے فیض کی غزل سنیئے' واہ' آنکھیں بند کر کے جھومنے کو دل چاہتا ہے۔"

"صاحبزادے! یہ زندگی آنکھیں بند کر کے نہیں گزاری جا سکتی۔ وہ بہت چلتر ہے' تم اسے نہیں جانتے' اس کی تو ہابی یہی ہے۔ خاندان میں تو ان لوگوں کو کوئی منہ نہیں لگاتا' ان کے انہی اطوار کی وجہ سے۔"

"ارے' لوگ یوں ہی باتیں بناتے ہوں گے۔ وہ تو بہت بھولی سی ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو' کل وہ ساحل پر میرے ساتھ کس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔"

"اس قدر معصومیت سے میرے سینے پر سر رکھے' اپنے بازو میری کمر میں حمائل کیے وہ سسکیوں میں کہہ رہی تھی کہ اُس کو نہ ملا تو وہ مر جائے گی۔ میرے بغیر وہ ایک دن نہیں رہ سکتی۔"

"بڑا غم ہے' اُس کے مرنے کا۔" میں جل کر بولی۔

"ظاہر ہے کہ ایک خونِ ناحق ہوگا میری گردن پر۔" وہ مسکرایا۔

"اور لکھنؤ والی جو مر گئی تو اُس کا کوئی غم نہیں ہوگا۔"

"ارے' وہ تو ہمیں مار کر بھی نہیں مرے گی۔ بڑی لمبی عمر لے کر آئی ہے' وہ بدذات۔"

"بُری بات کسی کو ایسے نہیں کہتے۔" میں نے ڈانٹا۔

"اس کی وجہ سے ہماری جان سُولی پر لٹکی رہے' وہ کچھ نہیں۔ آپ کو اور بھائی جان کو جتنا اُس کا خیال ہے' ہمارا نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں رہے ریحان میاں۔" میں اپنے آنسو سنک کر بولی۔

"پھر کیسی بات ہے؟ جب آپ لوگ مجھے اتنا چاہتے ہیں تو میری اتنی سی خواہش کو بھی پورا نہیں کر سکتے۔ آپ زاہدہ کو میرا بنا دیجئے۔" وہ یوں گڑگڑایا' جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ بازار سے وہ کھلونا مجھے دلوا دیں۔

تب میں ساکت سی اُسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اُن ہی دنوں میرے میکے میں ایک شادی تھی۔ ظاہر ہے کہ زاہدہ کی فیملی نے بھی اس شادی میں شرکت کرنی تھی۔

ریحان کو جب پتہ چلا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ اُن دنوں زاہدہ کا بھوت اُن پر بُری طرح سوار تھا۔

ریحان جو شادی بیاہ کی تقریبات میں بہ حالتِ مجبوری جایا کرتے تھے' میرے ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر گئے۔

جس شادی میں ہم لوگ گئے تھے' وہ خاصے پیسے والے لوگ تھے' مگر شادی میرج ہال کے بجائے محلّے کی تنگ سی گلی میں شامیانہ لگا کر کی جا رہی تھی۔ جہیز میں جہاں دنیا بھر کی چیزیں تھیں' وہاں جنریٹر بھی تھا کہ کراچی میں آئے دن کی بجلی کی آنکھ مچولی رہتی ہے اور لڑکی اُن کی "اے سی" میں سونے کی عادی ہے۔ فریج کا ٹھنڈا پانی نہ پیئے' کلر ٹی وی' وی سی آر اور ڈش پر پروگرام نہ دیکھے تو دنیا ہی دو کوڑی کی لگے۔ جنریٹر دینا وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اس کے بغیر تمام چیزیں بے کار تھیں بلکہ دنیا ہی بے رنگ و بو تھی۔

دلہن زیور میں یوں لدی تھی جیسے سونا روپے تولہ کہیں سے مل گیا ہو یا کسی ڈاکو کے ہاں سے بُری آئی ہو' پورے خاندان پر مٹاپے کا راج تھا۔ معلوم ہوا کہ دلہن کا ایک بھائی کسی میرج ہال میں کھانا سپلائی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھر کی عورتیں بھی اس سپلائی کے کھانے سے فائدہ اُٹھا کر مٹاپے کی تمام دہلیزوں کو عبور کر کے عبرت کا نمونہ نظر آ رہی تھیں۔

اسی پر بس نہیں تھا بلکہ ساری بیاہی بہنیں اور سب بھاوجیں سر پر سونے کے تاج لگائے بکرے کے سینگوں کی طرح سر گھماتے ہوئے گھوم رہی تھیں۔ مووی بننے کے چکر میں کھانے میں دیر سے دیر ہو رہی تھی۔ چھوٹے بچے بھوک سے الگ بلبلا رہے تھے۔

جگہ سے زیادہ مہمان خواتین تھیں جن میں بعض کو بیٹھنے تک کی پریشانی تھی۔

سوکھی زاہدہ خوب میک اپ میں لت پت تھیں۔ گہری آتشیں بنارسی ساڑی ڈنڈے پر لپٹی ہوئی لگ رہی تھی۔

ہمیں دکھانے کے لیے کئی دفعہ ہمارے سامنے سے گزری' کئی دفعہ کھنکتا ہوا قہقہہ جان بوجھ کر ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے اُگلا۔

ریحان اُن کی وجہ سے بدستور زنان خانے کے چکر لگا رہے تھے اور وہ ریحان کو دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ زمین پر قدم رکھنے کے بجائے ریحان کی پیٹھ پر سوار ہو کر تقریب میں شرکت کرتیں۔

"رعنا! گھر چلو' بہت دیر ہو گئی ہے۔ بچے بہت پریشان ہو رہے ہیں۔" عدنان کئی بار کہہ چکے تھے۔

"بس ابھی چلتے ہیں' تھوڑی دیر اور سہی۔" ریحان ٹال مٹول کر رہا تھا۔

ابھی ہم لوگ آپس میں باتیں ہی کر رہے تھے کہ آواز آئی۔ کھانا لگ گیا ہے۔ آواز تھی کہ خطرے کا سائرن۔ بے شمار خواتین ایک دوسرے کو دھکا دیتی ہوئی کھانا کھانے کے لیے تنگ سی گلی میں دوڑیں۔

کسی کا پیر دب رہا تھا۔ کسی کے کہنی لگ رہی تھی۔ کسی کا بچہ گر رہا تھا۔ شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اِن لوگوں کو کئی روز کے بعد کھانا مل رہا ہے۔

عدنان اور ریحان کے ساتھ میں بھی عورتوں کی دھکم پیل کو دیکھتے ہوئے خوب محظوظ ہو رہی تھی۔

اچانک ہماری پشت سے قہقہوں کی گونج سنائی دی۔ ہم لوگ بھی اُس جانب متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ ہر عورت بے طرح ہنس رہی ہے۔ بعض تو پیٹ دبائے ہنستے ہنستے بے حال تھیں اور جب ہم لوگوں نے بہ غور دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس دھکم پیل میں سوکھی زاہدہ کی ساڑی کھل کر عورتوں کے پیروں میں پٹی ہوئی چلی جا رہی تھی اور وہ بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہنے سراسیمہ سی کھڑی تھیں۔

ہڈیوں کا ڈھانچہ' اپنی ایک ایک ہڈی کی تفسیر خود بتا رہا تھا۔

اُس کو اس حالت میں دیکھ کر دھچکا سا لگا۔ بھاگ کر عورتوں کے پیروں میں اُلجھی ساڑی' جو کھانے کی میز تک پہنچ چکی تھی' اُٹھا کر اُنہیں دی' اُنہوں نے اسے یوں جھپٹا جیسے اس کو لے کر ہم کہیں بھاگ جائیں گے۔

آناً فاناً اس کو پیٹی کوٹ میں اس بُری طرح ٹھونسا کہ کے پلو اندر دب گیا اور سادہ حصّہ اوپر آ گیا۔ کہاں کی بھوک اور کس کے ریحان' اُنہوں نے آنکھ ملائے بغیر تنگ سی گلی سے نکل کر گھر کی راہ لی۔

اور ریحان تو اس ساری سچویشن کو دیکھ کر دم بخود سے ہو گئے مگر اتنا ضرور اثر پڑا کہ اس کے بعد پھر کبھی سوکھی زاہدہ کا اُنہوں نے نام نہیں لیا۔

عدنان کے سامنے جب کبھی میں یہ واقعہ دُہراتی تو وہ ہنستے اور کہتے کہ انسان میں دو سو چھ ہڈیاں ہوتی ہیں مگر سوکھی زائدہ میں چھ سو ہڈیاں تھیں' بس اِن ہڈیوں کو دیکھ کر ریحان میاں ڈر گئے۔

☆☆☆

دسمبر کا مہینہ تھا' ریحان کی بینک میں مصروفیات شدید ترین تھیں کہ لکھنؤ سے خط آ گیا کہ ہم لوگوں کو ویزا نہیں مل رہا' آپ لوگ اسی مہینے آ جائیں اور لڑکی کو رخصت کر کے لے جائیں۔

جنوری میں ہم شادی نہیں کر سکیں گے کہ لتاں' باؤ دونوں کی برسی ہوتی ہے اور فروری سے تو محرم شروع ہو جائیں گے' اس طرح معاملہ مزید آگے بڑھ جائے گا' آپ لوگ دسمبر میں آنے کی کوشش کیجئے۔

ریحان نے خط پڑھا تھا بھنا کر رہ گیا۔ "دیکھا بھابی! کسقدر جھوٹے لوگ ہیں' پہلے اُنہوں نے خود ہی پاکستان آنے کو لکھا اور اب اُن کو ویزا نہیں مل رہا چنانچہ ہم لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ یہاں تو جیسے سب فالتو لوگ رہتے ہیں کہ انہوں نے لکھ دیا اور ہم بھاگے چلے جائیں گے۔ ارے سنبھال کر رکھیں اپنی لڑکی کو' ایسی کوئی ابلا پری ہوں گی تو اپنے لکھنؤ کی ہوں گی۔ اپنے حسن کا زعم اہلِ لکھنؤ کو ہی دکھائیں۔ یہاں کوئی متاثر ہونے والا نہیں ہے۔"

"غضب خدا کا' یہ لوگ چار سال سے ہم لوگوں کو اُلو بنا رہے ہیں۔ ایسا کوئی باؤلا ملے گا ان لوگوں کو جیسے ہم لوگ ان کو مل گئے ہیں' نہ شادی کرتے ہیں اور نہ ہی رشتے سے بری الذمہ ہوتے ہیں۔ لتاں نے سخت نامعقول لوگوں سے رشتہ استوار کیا' ایسا کرو کہ ان لوگوں کے خط کا جواب ہی نہ دو۔" میں نے عدنان...... کے سامنے بہادر بنتے ہوئے کہا۔

"واقعی بڑے بے وقوف سے لوگ لگتے ہیں۔" عدنان نے پہلی دفعہ اِن رشتے داروں کو برہمی سے یاد کیا۔

ریحان یہ سب باتیں سن کر بن پیے مدہوش ہو گیا۔

اور کچھ ہی دنوں بعد وہ بڑی رازداری سے ایک بڑی اونچی فیملی کی لڑکی کے بارے میں مجھے بتا رہا تھا۔

"بھابی! اگر آپ اُس کا گھر دیکھ لیں تو بے ہوش ہو جائیں۔"

"کیوں' اُنہوں نے اپنے گھر میں بے ہوشی کی دوا چھڑک رکھی ہے۔"

"نہیں بھئی' آپ سمجھیں ہی نہیں۔" وہ دل کھول کر ہنسا۔

"کوئی سایہ وایہ ہے اُن کے ہاں' جو جاتے ہی دھڑام سے گر پڑیں گے۔"

"اُن کا گھر بڑا آفت ہے۔"

"اے مسٹر! کیا سمجھتے ہو تم بڑے لوگوں کو' بے حد چالاک ہوتے ہیں۔ ایسے عالی شان مکان بناتے ہیں کہ آنے والا اِن کو دیکھ کر ہی تھرا جاتا ہے۔ مکان کی ہیبت اور شان و شوکت ہی اپنے مکینوں کا شجرہ بیان کر دیتی ہے۔ مکینوں کو اپنی زبان سے کچھ کہنا ہی نہیں پڑتا' مکان کی ہر اینٹ اپنے اندر ایک زبان رکھتی ہے۔"

"مگر اتنے بڑے لوگ ہونے کے باوجود' وہ بے حد سادہ سے ہیں۔ کوئی نمائشی بات نہیں

کرتے۔" ریحان نے وکالت کی۔

"بھئی یہ اُن کی ادا ہوگی یا واقعی ایسے ہوں گے جیسے کہ تم بتا رہے ہو۔"

ریحان کی بار بار کی خوشامد اور لکھنؤ والوں کی بدتمیزی کا عدنان پر اتنا اثر ہوا کہ ہمارے ساتھ عدنان بھی ان لوگوں کے گھر جانے پر تیار ہو گئے۔

اُس شام ریحان کی خوشی دیدنی تھی۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا' پڑتا کہیں تھا۔

جب ہم اُن کے گھر گئے تو گھر کو مکان کہنا اُس کی توہین تھی۔ وہ تو کئی ہزار گز پر بنا ایک خوب صورت سا محل تھا جو اپنے مکینوں کی وجہ سے سر تانے فخر سے کھڑا تھا۔ کار پورچ میں نئے ماڈل کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

اندر جاتے ہوئے میں نے سوچا' شاید لڑکی میں کوئی نقص ہوگا۔ اتنے پیسے والے لوگوں کو ایک خالی خولی بینک آفیسر میں کیا خوبی نظر آئی؟

مگر جب لڑکی دیکھی تو میں حیران رہ گئی۔ لڑکی بے حد خوب صورت اور تعلیم یافتہ تھی اور پیسہ اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ شہر کے مشہور بزنس مین تھے' کئی لڑکیاں تھیں۔ ریحان سے ملاقات بینک کی کسی گیدرنگ میں ہوئی تھی۔

لڑکا ذہین' قابل اور وجیہہ لگا' اس لیے اس سے ٹرمز بڑھائے۔

اُن لوگوں نے اپنے گھر ہمیں کئی گھنٹے روک کے رکھا اور بے حد خاطر مدارات کی اور جب گھر آئے تو ذہن پر ایک خوش گوار تاثر تھا۔

"بھائی جان! کیسے لگے وہ لوگ آپ کو؟" ریحان نے آتے ہی بھائی سے سوال کیا۔

"بہت اچھے لوگ تھے۔ ویل مینرڈ' تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق بھی۔"

"اور بھابی جان! آپ کو؟"

"مجھے تو اُن میں صرف ایک ہی خرابی نظر آئی؟"

"کیسی خرابی؟" وہ پریشان ہو کر بولا۔

"یہی کہ بہت دولت مند لوگ ہیں' ہمارے حساب سے بہت اونچے' آدمی اپنے جیسے ماحول میں زیادہ خوش رہتا ہے۔"

"اُفوہ۔ میں اُن کے ہاں رخصت ہو کر تھوڑی جاؤں گا۔" وہ ہنسا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے کہ کون رخصت ہو کر کہاں جاتا ہے یا آتا ہے۔ فی الحال تو وہ لوگ اتنے رئیس نظر آ رہے ہیں کہ اپنی ہر بات منوانے پر قادر ہو جائیں گے اور اُن کے آگے آپ کی آواز بھی نہیں نکلے گی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں بھابی! کیا میں اُن کے آگے کچھ بھی نہیں۔"

"مائی ڈیئر دیور جی! بُرا ماننے کی بات نہیں' ایک سیکنڈ بینک آفیسر کی تنخواہ نو دس ہزار سے زیادہ کہاں ہوتی ہے اور اگر آپ نے کوئی لون ٹائپ ایڈوانس بھی لے رکھا ہے تو اپنی تنخواہ کو تین سے تقسیم کر دیجیے جبکہ وہ لاٹ صاحب فیملی والے تو اپنے گھر کے ملازمین کی تنخواہ اس سے زیادہ دیتے ہوں گے۔"

"آپ خود سوچیے کہ آپ کی یہ تنخواہ اُن کی بیٹی کے لیے کتنی پُرکشش ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکی جو شادی سے پہلے اپنی نئی نسان سنی میں گھومتی ہو' وہ آپ کی بائیک پر بیٹھ کر کتنا خوش ہوگی' اس بارے میں بھی کبھی سوچا۔"

"تو پھر ان لوگوں نے مجھ سے راہ و رسم کیوں بڑھایا؟ آپ لوگوں سے ملنے کی خواہش کیوں کی؟ مجھے بار بار اپنے گھر کیوں بلاتے ہیں؟ اتنی خاطر و مدارات کیوں کرتے ہیں؟"

"اُفوہ......تم تو سخت نامعقول آدمی ہو۔"

"بڑے بڑے پیسے والے اپنی "بلیک منی" کو وائٹ کرنے کے لیے بینک والوں سے دوستیاں بڑھاتے ہی ہیں۔ یہ کوئی اَن ہونی بات نہیں ہے۔" عدنان نے اُسے سمجھایا۔

"یہ روز روز شام کی چائے پر پنکی کا مجھے انوائیٹ کرنا اور لہرا لہرا کر باتیں کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔"

ریحان ہماری بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

اُس کی باتیں سننے کے بعد عدنان کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"بالکل ہی باؤلا ہے۔" اُن کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

"نہیں باؤلا تو نہیں ہے۔ ہاں اس کو عشق نے نکما کر دیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں بھابی...... میرے سامنے ہی...... میرے بھائی کو اُلٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہی ہیں۔"

"بھئی' یہ تو بھاوجوں کا کام ہوتا ہی ہے' اگر میں پڑھا رہی ہوں تو تمہارے سامنے' تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔" مجھے اُس کی حالت دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔

"سنو...... میں آج لکھنؤ خط لکھ رہا ہوں کہ ہمارا لکھنؤ آنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے' اگر آپ لڑکی کی شادی وہیں کر دیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" یہ فیصلہ عدنان نے بہت سوچ بچار اور ریحان کی جذباتی وارفتگی کو دیکھ کر کیا۔

"یہ کام تو آپ کو بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا۔" میں بھی بے انتہا خوش تھی۔

اور ریحان تو اب ایک آوارہ پنچھی تھا۔

اس کے لب اب گیت گاتے تھے۔

اور آنکھوں میں خواب بستے تھے۔

پنکی کے ہاں سے آئے ہوئے ہمیں ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن وہ سب لوگ ہمارے گھر آ گئے۔

چھوٹا سا گھر جو مناسب ساز و سامان کے ساتھ اچھا لگا کرتا تھا۔ اُن کے سامنے بے مایہ سا لگ رہا تھا۔

سیٹھ صاحب جو پنکی کے والد تھے' انہوں نے عدنان سے براہِ راست دوٹوک بات چیت کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں اور ہماری فیملی کو ریحان میاں بے حد پسند ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ پنکی سے عقد کر لیں' مگر اس کے لیے ہماری ایک شرط ہے۔''

''کیا شرط ہے؟'' میں اور عدنان دونوں گھبرا گئے' کہ ہم کس مصیبت میں پڑ گئے۔ اِن حاتم طائی کی کون سی شرط ہم پوری کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔

''پریشان نہ ہوں۔'' انہوں نے ہماری ہونق ہونق شکلیں دیکھ کر اطمینان دلایا اور مسکراتے لبوں سے کہا کہ شرط صرف یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ریحان اپنی بینک کی نوکری چھوڑ دیں اور ہمارے کاروبار کے ایک حصے کی نگرانی کریں۔

''اس سلسلے میں' میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔ دراصل ان کا رشتہ کہیں چل رہا ہے۔ وہاں سے ہم کوئی حتمی فیصلہ کر لیں تو آپ کے روبرو حاضر ہوں گے۔'' عدنان نے اُن کو شائستگی سے جواب دیا۔

میرے اور عدنان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں کو ریحان اس قدر پسند آ جائے گا۔

کہاں وہ لوگ اور کہاں ہم۔ دو مختلف سمتیں تھیں مگر شاید اُس کی قسمت تھی جو دونوں ایک ہو رہے تھے۔

''کیوں بھابی؟ ہمارا خیال غلط تھا۔ ہمارے تجربے غلط تھے۔'' اب وہ گردن اُٹھا کر نخوت سے پوچھا کرتا۔

''ہاں' واقعی' یقین نہیں آ رہا۔''

''بھابی' ایک راز کی بات بتاؤں۔''

''ہوں۔ کہو۔''

''آپ بھابی جان سے تو ذکر نہیں کریں گی۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''چلو نہیں کروں گی' کیا بات ہے؟'' میرے دل میں ہول سا ہونے لگا۔

''میں نے چپکے سے آپ لوگوں کو بتائے بغیر لکھنؤ خط لکھ دیا تھا۔''

''لکھنؤ خط لکھ دیا تھا مگر کیوں؟'' میں اُلجھ کر بولی۔

''میں نے صاف صاف لکھ دیا کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتا بلکہ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا' برائے مہربانی پاکستان آنے کی کبھی حماقت نہ کریں۔''

''تم نے اُن کو ایسا کیوں لکھا؟'' اُس کی بات سن کر میں سُن سی ہو گئی۔

''بھابی' مجھے خدشہ سا تھا۔''

''پتا نہیں' میں اُن جانے میں ڈر سا رہا تھا کہ کہیں وہ لکھنؤ والی چڑیل مجھے ڈسنے نہ آ جائے۔''

''خط لکھے ہوئے کتنے دن ہو گئے؟''

''آج اکیسواں دن ہے۔'' وہ ہنسا۔

''ہاں' اب تک تو ضرور مل گیا ہو گا۔ سیدھے سادے لوگ تھے۔ چُپ کے چُپ رہ گئے ہوں گے۔''

''ہاں' اب کوئی کھٹکا نہیں رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ بھائی جان کے خط کے بعد وہ کوئی چاپلوسی کا خط نہ اُنہیں لکھ دیں۔ اپنے بھائی جان تو ان کا خط پڑھ کر ہی ہتھے سے اُکھڑ جاتے۔''

''ہوں' یہ بات تو ہے۔''

''آپ کو پتہ ہے بھابی! کہ میں بھائی جان کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش تو ضرور کرتا ہوں مگر اُن کی رائے کے خلاف ایک قدم اُٹھانے کی بھی اپنے اندر ہمت نہیں رکھتا۔''

''ہاں' یہ تو ہے' مگر وہ لوگ بہت ہی بے وقوف تھے۔ عدنان کے کسی خط کا کوئی جواب تک نہیں دیا۔''

''ارے بھابی! جاہل اور اِل مینرڈ لوگوں کو کیا پتا کہ تہذیب اور تمیز کس چڑیا کا نام ہے۔ پاگل لوگ' بس پاگل پنے کی حرکتیں کرنا جانتے ہیں' انہیں اپنے یا کسی دوسرے کے نفع نقصان سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔''

''چلو اچھا ہی ہوا کہ جان چھوٹی تمہاری۔'' میں مسکرائی۔

''ہاں بھابی! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لکھنو والی میرا پیچھا چھوڑ دے گی۔ آپ یقین

کریں، وہ مجھے خواب میں بھی آ کر ڈراتی تھی۔"

"اچھا" میں ہنسی۔

"بھائی جان! اب آپ یہ بتائیں کہ کیا پروگرام ہے؟" وہ صوفے سے اُٹھ کر میرے پاس آ کر قالین پر دوزانو بیٹھ گیا۔

خوشی اُس کے چہرے سے دمک رہی تھی، ان دنوں وہ کتنا پیارا ہو گیا تھا۔ میں نے نظر لگنے کے خوف سے اپنی نظریں اُس پر سے ہٹا لیں۔

"دیور صاحب! یوں لگ رہا ہے کہ سیٹھ صاحب کی بیٹی پنکی آپ کو پیاری ہو جائے گی اور بینک کی بور نوکری سے آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔"

"منیجر مجھے بے حد تنگ کرتا تھا۔ آج جب میں نے اسے بتایا کہ میں بہت جلد بینک کی جاب چھوڑ رہا ہوں تو اُس نے مجھے یوں دیکھا کہ جیسے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ چپڑاسی سے کہنے لگا، صاحب کے لیے ٹھنڈا پانی لاؤ، ان کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے، دماغ پر گیس چڑھ گئی ہے شاید۔"

"اور جب میں نے اس کو پوری صورتِ حال بتائی تو بلا کر چپڑاسی سے کہا۔ "کہ میرے لیے جلدی سے ٹھنڈا پانی لاؤ" اور فوراً کھڑا ہو کر مجھ سے خواہ مخواہ ہاتھ ملانے لگا۔

"اے ہے، اُس کا کیوں دماغ خراب ہو گیا۔" میں ہنسی۔

"ارے بھائی جان! صاف بات ہے کہ اتنے بڑے سیٹھ کا داماد جو خود بھی کاروبار کی نگرانی کرے گا، بینک کے لیے تو بڑی "پارٹی" ثابت ہو گا۔ ہم جس برانچ میں اپنا سرمایہ رکھیں گے، وہاں کا ٹارگٹ بڑھے گا اور ٹارگٹ کے ساتھ بینک کے منیجروں کا قد بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔"

"چلو اب تو منیجر تمہاری خوب آؤ بھگت کرے گا۔"

"اور کیا، بلکہ ٹلے نویسی علیحدہ۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"دوسرے ساتھیوں کی کیا صورتِ حال رہی؟"

"ایک صاحب کہنے لگے کہ اگر وہ سیٹھ صاحب اپنی کسی دوسری لڑکی کی بینکر سے شادی کرنا چاہیں تو میرا ذکر محبت کے ساتھ کرنا۔ خزانچی صاحب جو عرصہ دراز سے رنڈوے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ اگر اُس سیٹھ کی کوئی مطلقہ سالی، بیوہ بہن یا عیب جو لڑکی ہو تو میری لائن کلیئر کروا دینا۔

میں نے کہا انکل! اونچی جگہ کے تو کٹ پیس بھی ولایتی کپڑوں کے دام بکتا ہے اور نیچی جگہ کے ولایتی کپڑوں کی بھی کوڑیوں کے دام سیل لگ جاتی ہے۔"

"اے میاں، جب تم اس محل میں پہنچ جاؤ گے تو ہماری مارکیٹ ویلیو کا تم ہی خیال رکھنا،

ویسے بھی تمہارے انکل ہیرو قسم کے ہیں۔"

"جی ہاں...... یہ تو مجھے ازبر رہے گا۔"

"ساری برانچ کے لوگ کہہ رہے تھے کہ ریحان کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔"

"ہاں بھئی، جب قسمت کا ستارہ روشن ہوتا ہے تو خود ہی ہوتا ہے، کسی کو کوئی پاپڑ بیلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"تمہیں لکھنؤ والی پسند نہیں تھی۔ بینک کی نوکری تمہیں سخت لگتی تھی۔ ان دونوں سے ہی تمہاری جان چھوٹی۔"

"بزنس کرنے کے تم خواہش مند تھے۔ بیوی کے ساتھ جما جمایا کاروبار بھی مل رہا ہے اور کیا چاہیے۔ اسے لاٹری ہی کہیں گے۔" عدنان بھی ہم خیال ہو گئے۔

شام کو پھر سیٹھ صاحب کے ہاں سے ملازم رقعہ لے کر آ گیا کہ آپ لوگ ہمارے ہاں کب آئیں گے۔

میں اور عدنان اچنبھے میں پڑ گئے کہ کیا جواب دیں۔

ریحان بے تاب ہو کر بولا۔ "آپ لوگ کل شام چلے جائیں ناں۔"

"تم چپ رہو۔" میں نے اُسے ڈانٹا۔

"عدنان...... آپ بتائیے ناں کہ میں کیا جواب لکھوں، ہمیں کس دن وہاں جانا چاہیے۔"

"میرے خیال سے جمعے کا دن مناسب رہے گا، دو چار دن اور غور و خوض کر لو، بہر حال وہ بہت پیسے والے لوگ ہیں، ہر معاملے میں اپنی چلائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ریحان کو ان کے ہاں جا کر رہنا پڑے۔"

"یہ کبھی بھی نہیں ہو گا، یہ میں پنکی سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" ریحان جوش سے بولا۔

"اور کیا کیا کہہ چکے ہیں صاحبزادے۔" عدنان نے ہنس کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بھائی جان!" وہ جھینپ سا گیا۔

"بھائی، جب آپ جائیں تو پنکی کو انگوٹھی بھی پہنا آئیں۔" ریحان ان دنوں کچھ زیادہ شوخ ہو رہا تھا۔

"ہم تمہاری شادی پٹ سے کر دیں گے تو جھٹ منگنی کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔"

"یہ تو آپ نے بہت ہی اچھی بات سنائی۔" وہ اور خوش ہو گیا۔

ان دنوں گھر میں عجیب سی رونق تھی۔ عدنان خوش تھے۔ ریحان خوش تھا۔ ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر میں بھی خوشی سے بے حال تھی کہ اچانک ہماری خوشیاں گہنا سی گئیں۔

وہ بدھ کی شام تھی۔ میں گھر میں اکیلی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی' میں نے اٹھایا۔

"ایک صاحب دیہاتی لب و لہجے میں بولے۔ "اے بہن' ریحان میاں کے جو بڑے بھائی ہووین ہیں' اُن سے بات کرنی ہے۔ ذرا مہربانی فرما کر اُنہیں بلا دیں۔"

"وہ تو اس وقت نہیں ہیں' آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"ارے بہن جی' ہم کہاں صاحب ہوئے۔ ہم تو گریب آدمی ہیں۔ عدنان صاحب کس وقت آویں ہیں گھر کو۔"

"جی آتے ہی ہوں گے مگر آپ اپنا نام تو بتائیں تا کہ میں اُن کو بتا سکوں۔"

"بس آپ اتنا ہی بول دینا کہ وہ لکھنؤ سے آپ کے سمان کراچی آ گئے ہیں۔"

"جی۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ریسیور میرے ہاتھ میں کپکپایا۔

"ارے بہن جی! ہم آپ کی امانت کو لے آئے ہیں' میں اُس کا بڑا بھائی ریاج (ریاض) بول رہا ہوں۔ گولی مار میں اپنے رشتے داروں میں ٹھہرے ہوئے ہیں' ہم سے آ کر مل لیں اور یہاں کا پتہ لکھ لو۔"

"آپ کو عدنان کا خط مل گیا تھا؟" میں نے چلتر پنے سے پوچھا۔

"بھئی' عدنان تو کیا ہمیں ریحان میاں تک کا کوئی خط نہیں ملا۔"

اُن کا جواب سُن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا' انہیں وہ دونوں خط مل چکے تھے۔

"آپ لوگ بہت دیر میں پاکستان آئے' یہاں تو ریحان کی شادی طے بھی ہو چکی ہے۔" میں نے ریحان کو بچانے کی آخری کوشش کی۔

"بہن' تم شادی طے کرو یا ولیمہ۔ قمر النساء سے تو اُن کے باپ کو بھی شادی کرنی پڑے گی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ایسی پھالتو چھوکری سمجھی تھی تم لوگوں نے کیا لکھنؤ میں جب تمہاری بُڑھیا بیمار پڑی تو ساری کھدمت ہماری قمرو نے کی تھی۔ گو تک اُٹھائے تھے اُس کے۔ نہلانا دھلانا سب قمرو کرتی تھی۔ تمہارے باوا کی غلام تھی وہ؟ اُنہوں نے اُسے اپنی بہو بیٹی مان لیا تھا تو ہماری بھتو نے بھی ہونے والی ساس سمجھ کر کھدمت کر دی تھی۔"

"تم لوگوں نے تو بیماری میں بُڑھیا کو نکھلو (لکھنؤ) روانہ کر دیا تھا کہ کل کی مرتی' آج مر جائے اور ساری بُڑھیا کی رقم تم لوگ ہتھیا لیو۔"

"آپ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم کہ عدنان' آپ سے ملنا بھی پسند کریں

گے یا نہیں۔" میرا مارے غصے کے بُرا حال تھا۔

تب وہ شخص شاید ڈرا کہ اپنا لہجہ گھگھیایا ہوا کر کے خوشامدیں کرنے لگا کہ چار سال سے ریحان کے نام پر بیٹھی اپنی بہن کو کہاں دھکا دے دوں۔ آپ اسے بیاہ لائیں' اللہ آپ کو اجر دے گا۔

عدنان کو جب ساری صورتحال بتائی تو وہ سر تھام کر بیٹھ گئے۔ "خدایا' لتاں نہ جانے کن لوگوں میں پھنس گئی تھیں۔ انہوں نے وہاں کے لوگوں کے بارے میں ہمیں قطعاً لاعلم رکھا تھا۔"

یہ بھی ہماری شدید غلطی تھی کہ لکھنؤ جا کر لڑکی کو یا اُس کے گھر والوں کو دیکھ کر نہیں آئے تھے۔

بس لتاں کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے فیصلہ کر لیا تھا' اور جب یہ فیصلہ ختم کر کے نئے رشتے کے بارے میں سوچا تو وہ لوگ گھبرا کر پاکستان آ گئے۔

عدنان اور ریحان کے خطوط نے اُن کو یہ نئی راہ دکھائی تھی۔ اتنا تو اُن کو اندازہ تھا کہ ہم لوگوں کی مالی حالت اُن کے مقابلے میں بہت اچھی تھی۔

اگلے دن میں اور عدنان مطلوبہ ایڈریس پر گولیمار پہنچے۔

"ظہیر صاحب کا مکان یہی ہے؟" میں نے دروازہ بجا کر پوچھا۔

ایک موٹی سی لڑکی باہر نکل کر آئی' اور بولی یہی ہے۔

"لکھنؤ سے آپ ہی کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"ساری باتیں باہر ہی پوچھو گی' اندر آن کر بیٹھو۔" وہ بھاری آواز میں بولی اور اندر اطلاع کرنے چلی گئی۔

میں اور عدنان ایک کھرے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اندر کمروں میں کھسر پھسر ہوتی رہی' مگر کوئی باہر نہیں آیا۔ 'تُو جا' نہیں تُو جا' کی تکرار خاصی دیر چلی۔

کافی دیر بعد میلے' چیکٹ غراروں میں دو خواتین آئیں۔ پتہ لگا کہ وہ دلہن کی تائی اور چچی ہیں۔

"لڑکی کہاں ہے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ارے قمرو۔ وہ ہنسیں...... بھئی اس نے تو دروازہ کھولا تھا' اب مارے شرم کے باورچی خانے میں چھپی بیٹھی ہے۔"

میں نے عدنان کو اور عدنان نے مجھے دیکھا' اور عدنان نے تو یکبارگی اپنا سر تھام لیا۔

کتنی پیاری پیاری لڑکیاں ہم اس لکھنؤ والی کے انتظار میں ریجکٹ کرتے رہے تھے۔ یہ لڑکی تھی کہ پہاڑ کا تودہ۔ ذرا بھی مناسب نہیں تھی۔

وہ چھ فٹ تین انچ کا بانکا سجیلا لڑکا اور یہ پانچ فٹ کی نہیں تھی اور پھر موٹاپا الگ اُس کی رونق

میں اضافہ کر رہا تھا۔

وہ مترنم لہجے کا شیدائی کہ فیض کی غزل سن کر زندگی بسر کرنے کو تیار تھا اور یہاں لٹھ مار لہجہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

وہ غربت کے ساتھ ساتھ جہالت کی بھی پوٹ معلوم ہوتی تھی۔

"جٹھانی آپا۔ آپ ناپ کے کپڑے لے لیجئے' ورنہ بری کے کپڑے بے سلے آ جائیں گے۔ پھر ہماری آپا کو تو کپڑے سینے سے چڑ ہے۔" اُسی کی شکل کی ایک موٹی سی ٹھنگنی لڑکی گھٹیا سا عنابی جوڑا میرے پاس پہنچ گئی۔

میں نے شلوار اُٹھائی تو اس کی لمبائی دیکھ کر یوں لگا کہ کسی بچی کی شلوار آ گئی ہے۔ قمیض دیکھ کر احساس ہوا کہ موصوفہ کے جسم میں کوئی پیچ وخم ہی نہیں ہے۔

"خدایا' یہ کن گناہوں کی سزا ہمیں ملی ہے۔" میں سوچ سوچ کر نڈھال ہو رہی تھی۔

مجھے نہ اُن کی غربی کھٹک رہی تھی اور نہ ہی جہالت' کیوں کہ ان کا ہمیشہ سنگم ہوا ہی کرتا ہے مگر لڑکی کچھ بھی تو نہ تھی۔

نہ شکل وصورت' نہ تہذیب' نہ سگھڑاپا۔

پتہ نہیں کیا چیز تھی وہ!

بعض دفعہ کتنی معمولی شکل کی لڑکیاں اپنی شائستگی کی بنا پر خاصی جاذب نظر لگا کرتی ہیں' مگر وہ تو سر جھاڑ منہ پہاڑ بے تکے کپڑوں میں یوں گھوم رہی تھی کہ جیسے اُن کے ہاں تہوار کے تہوار منہ دھویا جاتا ہو یا کپڑے بدلے جاتے ہوں۔

سارے گھر کی عورتیں گہرے پیلے رنگ کے مختلف شیڈ پہنے ایسی لگ رہی تھیں' جیسے پورے گھر کو یرقان ہو گیا ہو۔ ہم دونوں مجرم سے بنے گھر آ گئے۔

گھر آ کر عدنان' بے اختیار رونے لگے۔ میرے آنسو بھی بھل بھل بہنے لگے۔ "واقعی لکھنؤ والی' خدا ہی تجھے سمجھے۔ تو نے آ کر ہمارے گھر کے رنگ میں بھنگ ڈال دی ہے۔"

"یہ بن بادل برسات کیسی؟" ریحان ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

عدنان نے تمام باتیں ریحان کو بتائیں اور بڑی آزردگی سے کہا۔

"ریحان' تم پنکی سے شادی کر لو۔"

"بھائی جان' کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"تمہارے بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں ریحان' تم پنکی سے شادی کر لو۔"

"مگر لتاں کی روح بے چینی اور آپ کی زبان کی اہمیت اب کہاں جائے گی؟"

"جب وہ لوگ یہاں آ چکے ہیں' تب یہ بیانات دیئے جا رہے ہیں۔" وہ تلملا ہی تو گیا۔

"ریحان! وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔" میں نے سسکی بھری۔

"بھائی جان......! جب میں یہ سب کہتا تھا تو آپ کو خیال نہیں آتا تھا' اب وہ اتنی دور سے آ گئی ہے اور آپ اُس کے ناپ کے یہ بچگانہ سے کپڑے لے آئی ہیں تو یہ فیصلہ دے رہی ہیں۔ بہت خوب' بہت خوب' بہت عقل مند ہیں آپ۔" وہ بے طرح ہنستا ہی چلا گیا کہ مجھے اس کی دماغی حالت پر شبہ سا ہونے لگا۔

"ریحان! ہم سے اُن جانے میں ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ تم ہمیں معاف کر دو۔"

"تم جس سے دل چاہے شادی کر لو' ہماری اجازت ہے۔ مگر ہمیں معاف کر دو۔" عدنان نے چھوٹے بھائی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"بھائی جان! ایسا نہ کیجئے۔" ریحان ان ہاتھوں کو چوم کر سسک پڑا۔

"آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ مذاق تو تقدیر نے میرے ساتھ خود کیا ہے۔"

"ریحان جذباتی مت بنو' اس کے ساتھ تمہاری ذرا بھی مناسبت نہیں ہے' تم خوب سوچ لو' ہم سارا الزام اپنے سر لے لیں گے۔ تم اپنی مرضی سے بیاہ رچا لو اور یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

ریحان نے چند لمحے سوچا' ہم دونوں کو بہ غور دیکھا اور پھر ہنس پڑا۔

"مائی سوئٹ بھابی جان' جب اپنی قسمت میں لکھنؤ کی چھوکری اور بینک کی نوکری ہو تو میں بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں۔ آپ لوگوں نے کیسے سوچ لیا کہ میں آپ دونوں سے دور کہیں چلا جاؤں گا۔"

"اس بات کی میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔" عدنان اپنے بھائی سے نظر ملائے بغیر بولے۔

"آپ کچھ بھی کہہ دیں۔ مگر میں آپ لوگوں کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا' ہاں بدشکل بیوی کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہوں۔"

"پھر سوچ لو۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا...... آنسو پونچھے اور کہنے لگا۔

"میں تو ایک ڈرپوک سا لڑکا ہوں۔ ایسے فیصلے میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ پھر ایک لڑکی۔ خواہ وہ کیسی بھی ہو۔ دل تو اُس کا بھی ارمانوں بھرا ہوگا۔ ہندوستان سے یہاں آتے آتے' پتہ نہیں اُس نے کتنے سپنے دیکھ ڈالے ہوں گے۔ یا تو یہ سلسلہ ابتدا میں ہی منقطع ہو جاتا۔ یا وہ لوگ پاکستان ہی نہ آتے۔ مگر اب...... جب کوئی سپنے سجائے بیٹھا ہو تو میں اُس کے ارمانوں کا خون کیسے کر سکتا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو ریحان؟" میں اُس کی باتیں سن کر واقعی حیران تھی۔

ایسا لاپرواسا لڑکا یوں فلسفیانہ گفتگو بھی کر سکتا ہے۔ اُس کا یہ انداز تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"بھابی' وہ لکھنؤ والی بڑی قسمت والی ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ پنکی کی وجہ سے ہماری لاٹری کھل جائے گی' معلوم یہ ہوا کہ اپنی لاٹری تو نکلی نہیں' مگر اِن لکھنؤ والی کی لاٹری ضرور نکل آئی ہے۔ واقعی اپنی قمرو بہت خوش قسمت ہے۔ حقیقت میں خوش بخت۔ کیسا بانکا سجیلا لڑکا ملا ہے جو اُسے بائیک پر اُڑائے اُڑائے پھرے گا۔ بھابی جان! آپ اس کے مٹاپے سے خوف زدہ نہ ہوں۔ کراچی کے سلمنگ سینٹرز ندہ باد وہ نہ صرف وزن بھی کم کریں گے بلکہ پیمائش میں بھی کمی حیرت انگیز ہوگی۔ اور اخبارات میں پہلے اور بعد کی تصاویر شائع کر کے مفت کی پبلسٹی علیحدہ حاصل کریں گے۔ رہی جہالت کی بات تو ہم اپنی قمرو کو خود پڑھائیں گے۔ اور پھر ہمارا تعلیم یافتہ ماحول اسے امپریس تو کرے گا ہی۔"

"اگر وہ نہ بدلی تو!" مجھے ریحان کی باتوں سے سخت وحشت ہو رہی تھی اور مارے ہول کے بُرا حال تھا۔

"ارے بھابی! اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ وہ نہ بدلی تو ہم بدل جائیں گے۔"

"اور اپنے گھر میں داخل ہو کر پہلے یہ نعرہ ماریں گے!"

"اری او کلّو کی لتاں' کہاں مرگئی کم بخت' ذرا کھانا تو اُتار اپنے خصم کے لیے...... اری حرام جادی۔ یہ کھانا پکایا ہے تو نے یا گھاس پھونس کی بھاجی بھون کر رکھ دی۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اُس کی باتیں سن کر عدنان مسکرانے لگے۔

بچے اپنے چاچُو کو خوش دیکھ کر شور مچانے لگے۔

اُس نے اسٹیریو تیز آواز میں کھول دیا۔ بچوں کے ساتھ ساتھ وہ حسب عادت خوب شور مچا رہا تھا۔ اُن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

کوئی فون آیا تو عدنان اس کو اٹینڈ کرنے اُٹھے۔

میں چھوٹے بچے کی فیڈر بنانے چلی۔

اُس کے قہقہے اور شرارتیں کان پھاڑ رہے تھے۔

چلتے سے میں نے یکبارگی ریحان کو دیکھا۔ وہ بچوں کو کھیل میں اُلجھا کر اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔

❁❁❁
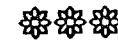
مبارکباد

"مبارک ہو!"

الفاظ اس کے ذہن پر جیسے سنگ باری کر رہے تھے۔

یہ کیسی مبارک باد تھی کہ نہ تو وہ ہنس سکتی تھی اور نہ ہی وہ قہقہے لگا سکتی تھی۔

آج کا تازہ اخبار اُس کے سامنے پھیلا ہوا تھا جسے دیکھ کر وہ سکتے کی کیفیت میں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی اور اُس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔

ایسا لگتا تھا' جیسے کسی نے اُس کی قوتِ گویائی سلب کر لی ہو۔

"کومل' کیا بات ہے؟ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟" امی نے اس کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کو پوچھا۔

تب اُس نے شدّتِ کرب سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے چبا ڈالا۔

اس کا چہرہ شدّتِ جذبات سے تپ رہا تھا اور......

آنکھیں ضبطِ گریہ سے دہکتا ہوا انگار بنی ہوئی تھیں۔

"کومل' میری بیٹی! میری جان! بتا...... ناں' کیا بات ہے؟" ماں کا لہجہ مامتا سے چُور اُس سے اُس کی پریشانی کا سبب پوچھ رہا تھا۔ "کیا شکیلہ کا فون آیا ہے۔ اس سے جو کام میں نے کہا تھا' کیا اُس نے کرنے سے معذرت کر لی ہے؟" وہ اُسے کرید رہی تھیں۔

اور وہ جو ضبط کے پل صراط سے گزر رہی تھی' نہ جانے کیسے آنسوؤں کا سیلاب ایک تیز و تند ریلے کے ساتھ اُس کی آنکھوں سے برسنے لگا۔

"امی' دیکھئے...... یہ آپ کی تصویر چھپی ہے اخبار میں۔ امی' یہ آپ کی تصویر چھپی ہے۔" وہ دیوانوں کے سے انداز میں' اخبار میں شائع تصویریں' ماں کو دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی' چیخیں اُس

کے لبوں سے آزاد ہو رہی تھیں۔

دل کا درد موج در موج کروٹیں لے رہا تھا۔ اس سے اُسے ایسا لگ رہا تھا' جیسے آج اُس کا دل ضرور پھٹ جائے گا۔ امی اس کے دکھ کی منزلوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتی تھیں۔

زرینہ بیگم نے ایک نظر اخبار کی تصویروں پر ڈال کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں چند زخمی اور معذور خواتین کی تصاویر شائع ہوئی تھیں جو اُن کے لیے قطعی اجنبی تھیں۔

''کومل' میری جان! اتنی حساس مت ہوا کرو۔ دیکھو' تو تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ فراز تمہیں اس حالت میں دیکھے گا تو اُس کی بھی حالت خراب ہو جائے گی۔'' ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں اور اُن کا لہجہ بھی طمانیت آمیز تھا۔

مگر اس کا غم' جنون کی شاہراہ عبور کر کے دیوانگی کے پل پر چڑھ رہا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی تو اُس نے پاگلوں کی طرح ٹیلی فون سیٹ اُٹھا کر دیوار سے دے مارا۔

''ارے...... رے' یہ کیا کر دیا تم نے۔'' ماں تاسف سے کہہ رہی تھی۔

''امی جی' اصل قصوروار یہی ہے۔ میں نے اس کو خاموش کر دیا۔''

اور بات کسی حد تک صحیح بھی تھی۔

یہ ساری گڑبڑ......!

ساری پریشانیاں......!

اور اس کا ہائی بلڈ پریشر......!

صرف فون کی وجہ سے ہی شروع ہوا تھا۔

کومل ان دنوں جاب لیس تھی۔ آفس کے مالک صاحب کو ایک بیس سالہ سیکرٹری مل گئی تھی تو وہ پکی عمر کی موٹی ڈھم ڈھم خاتون کو صرف اس وجہ سے کیوں برداشت کرتے کہ اُس کا نام بہت خوب صورت تھا اور اس کی آواز کانوں میں شہد سا گھول دیتی تھی۔

تانیا کو دیکھتے ہی تنویر صاحب نے کومل کو ڈسچارج کر دیا۔

''سر' کوئی وجہ......؟ کومل نے آزردہ ہو کر پوچھا۔

''ایک ہی وجہ کافی ہے کہ تانیا نے ہمارا آفس جوائن کر لیا ہے۔'' اُنہوں نے تانیا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور وہ لاحول پڑھتی ہوئی اُٹھ آئی تھی۔

''پتا نہیں' کب تک جوانی کے زور پر خواتین اُسے ڈستی رہیں گی۔'' اس نے نفرت سے تانیا کو دیکھا۔

جس کا لباس واہیات تھا۔

جس کے بے حجاب قہقہے اُس کی سماعت کو مجروح کر رہے تھے۔

جب چکلے دفتروں میں کھولے جانے لگیں تو مخصوص بازاروں میں دکانیں سجانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

نیچ لوگوں نے نسائیت کو اپنا اوزار بنا لیا ہے۔

اُس کا دماغ کھول رہا تھا۔

اُس پر جوانی کب آئی......؟

اور کب چلی گئی' پتہ ہی نہیں چلا۔ اور نہ ہی ان سب باتوں کے لیے اُس کے پاس وقت تھا۔

یوں بھی وہ ایک سخت مزاج لڑکی تھی یا پھر سختی کا لبادہ اُس نے اپنے اوپر تان رکھا تھا۔

اُس کا نام کومل ضرور تھا' اس کی آواز میں جھرنوں جیسی خوب صورتی بھی تھی مگر وہ مزاجاً کڑوا نیم تھی۔

مسکرانا تو جیسے وہ جانتی ہی نہ تھی۔

مگر...... آج جیسی وہ تھی......

پہلے تو ایسی ہرگز نہ تھی۔

یہ سچ تھا کہ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو یتیم پایا۔ بڑا بھائی فراز پولیو زدہ تھا جسے وہ ہمیشہ وہیل چیئر پر بیٹھا دیکھتی تھی۔

مگر اس گھرانے کی معاشی حالت آج سے پندرہ سال پہلے ایسی ہرگز نہ تھی۔

پہلے ماں جاب کرتی تھی۔ اُس کے خوب صورت سے گھر میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔

میٹرک پاس کر کے اُس نے شہر کے اچھے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اُسے یاد تھا کہ وہ کالج کی ہر دلعزیز طالبہ تھی۔

پڑھائی میں وہ بہترین' غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے۔

مصوری' شاعری' گلوکاری کون سا شعبہ ایسا تھا جہاں اُس نے اپنے جھنڈے نہ گاڑے ہوں۔

تقریر کرنے میں تو کوئی اُس کا ثانی ہی نہیں تھا۔ تقریر خواہ اردو میں ہوتی یا انگریزی میں۔

اس کا لب ولہجہ اس قدر دبنگ ہوتا اور چہرہ اتنا پُرجوش کہ لوگ اسے سنتے بھی اور دیکھتے بھی۔

اور جب وہ انٹر کالجز مقابلوں میں پہلی ٹرافی جیت کر لائی تو کالج کی پرنسپل نے اُس سے کہا

تھا۔ "کومل' میں یہ پیش گوئی بھی کرسکتی ہوں کہ تمہاری زندگی بھی فتوحات سے عبارت رہے گی۔"

اس وقت اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ ستاروں کو چھو لے گی۔

ایف ایس سی میں اُس نے ٹاپ کیا تھا۔ ماں نے دل کھول کر خوشی منائی۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز تھیں۔ ان کا حلقۂ احباب اچھے لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس کے لیے بے شمار گفٹ آئے تھے۔

اس کا پھوپھی زاد سکندر تو اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ ان دنوں وہ میڈیکل کے فائنل ائر میں تھا۔

"کومل' پہلے ہم دونوں کی منگنی ہو جانی چاہیئے۔ پھر نکاح اور اسکے بعد شادی......" وہ پروگرام بناتا۔

"ابھی ڈاکٹر تو بنے نہیں ہو' دولہا بننے کا شوق ہو رہا ہے۔" وہ اسے چھیڑتی۔

"ڈاکٹر بننے میں دیر ہی کتنی ہے۔ میں امی سے کہوں گا کہ ممانی جان سے جلدی سے بات کرلیں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے؟ میں کہیں بھاگی جا رہی ہوں کیا؟" وہ شرما کر کہتی۔

"کیا پتہ' کہیں بیچ میں اِدھر اُدھر ہوگئیں تو......؟"

"تو پھر......؟"

"میں تو پاگل ہو جاؤں گا' اگر تم نہ ملیں۔"

"سب بے کار کے ڈائیلاگ ہیں۔ کوئی کسی کے لیے پاگل نہیں ہوتا۔"

"نہیں کومل' میرے لیے ایسا سوچنا بھی مت۔ مجھے تمہارے بغیر کچھ نظر نہیں آتا۔"

"اب کیا میں تمہاری لاٹھی ہوں جو تمہیں میرے بغیر کچھ سجھائی نہیں دیتا۔" وہ ہنس ہی تو پڑی تھی۔

"تم میرے لیے کیا ہو؟ یہ شاید میں تمہیں کبھی سمجھا نہ سکوں' بس میری آنکھوں میں دیکھ لیا کرو کہ شاید تمہیں میری محبت اور چاہت کا یقین آ جائے۔"

تب کومل نے اُس کی سمت دیکھا تو جانا کہ اس کی یہی باتیں' سچائی کی روشنی کی طرح اُس کی آنکھوں میں نظر آتیں اور اُس کا لہجہ اُس کی آنکھوں میں دکھائی دیتا۔

'پھوپھو' شاید اتنی جلدی منگنی کرنے کے حق میں نہ تھیں مگر سکندر نے ایک ضدی' ماں کو اپنی باتوں سے ایسا مسحور کیا کہ وہ گھڑی کی چوتھائی میں کومل کے لیے جھولی پھیلائے زرینہ بانو کے سامنے کھڑی تھیں۔

"بھائی جان! آپ کومل کو میری بیٹی بنا دیجئے۔"

"کومل تو تمہاری بیٹی ہی ہے فریدہ!" اُنھوں نے رسان سے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ سکندر کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ پُرانی باتوں کو بھولی نہ تھیں کہ رضا سے ان کی لومیرج ہوئی تھی اور ان کی اس شادی پر فریدہ نے خاصا واویلا مچایا تھا۔

"پرانی باتوں پر مٹی ڈال دیجئے کہ بُری باتوں کو بھول جانا چاہیے۔ بس کومل کو آپ میری بیٹی بنا دیں۔ بھائی جان کی روح بھی آپ کے اس اقدام سے خوش ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔" زرینہ بانو صلح پسند خاتون تھیں اور وہ دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی بیٹی بھی سکندر کو ناپسند نہیں کرتی۔

"تو پھر اس جمعے کو ہم منگنی کی رسم ادا کر دیں۔" فریدہ کی جلد بازی دیکھنے کے قابل تھی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" زرینہ بانو کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

پھر چار روز بعد ہی بے بی پنک غرارہ سوٹ میں کومل بیحد پیاری لگ رہی تھی۔ سکندر آف وائٹ کلف کے کُرتا شلوار میں گبھرو جوان دکھائی دے رہا تھا۔ خاص خاص مہمان مدعو تھے جس میں کومل کی سہیلیوں کی تعداد خاصی تھی۔ اِدھر سکندر کے گروپ کے تمام لڑکے' لڑکیاں بھی آئے تھے۔

"چلو بیٹے' بسم اللہ کر کے کومل کو انگوٹھی پہنا دو۔" فریدہ نے ہیرے کی انگوٹھی سکندر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"سکندر' انگوٹھی پہنانے سے پہلے دلہن کی نبض دیکھو' کہیں بخار تو نہیں ہے۔ آخر تم ڈاکٹر ہو۔ آنکھیں اور زبان بھی چیک کر لیتا۔" اُس کے میڈیکل کالج کے دوست شرارتوں سے باز نہیں آ رہے تھے۔

"کومل! تم پہلے ڈاکٹر صاحب کو کلوروفارم سنگھانا اور پھر انگوٹھی پہنانا تاکہ ڈاکٹر صاحب کو انگوٹھی پہننے کا واقعہ ساری زندگی یاد رہے۔" کومل کی سہیلیاں بھی جوابی کارروائی سے ہرگز باز نہیں آ رہی تھیں۔

اور جب سکندر نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو اسے یوں لگا' جیسے کوئی ریشم اُس کے ہاتھوں میں آ گیا ہو۔

وہ یکبارگی اس کی انگلیاں یوں دیکھنے لگا' جیسے کلیاں بین رہا ہو۔

"کومل......!" جذبات سے گُندھی ہوئی گمبھیر آواز میں اسے پکارا۔

"ہوں......!" اس نے شرما کر سر مزید جھکا لیا۔ آج اسے سکندر سے بے تحاشا شرم آ رہی

تھی۔

"کومل! کچھ لوگ صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ اُن سے عشق کیا جائے۔
انہیں اپنی آنکھوں میں چُھپا کر رکھا جائے!
دل کے نہاں خانے میں اُن کی پرستش کی جائے۔
اور تم......صرف تم......وہی ہو......جو میرے دل میں بسنے کے لیے اس دنیا میں آئی ہو۔"

وہ دھیرے دھیرے اس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ انگوٹھی پہنانے کے بعد بھی اس کا ہاتھ ہنوز اُس کے ہاتھ میں ہی تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا لیکچر دینے بیٹھ گئے۔" دوست اس کو چھیڑ رہے تھے۔

"یہی کہ میری کسی بات کا یقین نہ کرنا۔ یہ سب ڈائیلاگ میرے دوستوں نے یاد کروائے ہیں۔" کومل کی سہیلیوں نے بھی بیک آواز کہا۔ تب ہر طرف قہقہے پھول بن کر بکھر گئے۔

"بھئی' شادی ہر ایک کو محبت کی کرنی چاہیے۔ اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو منگنی کے دولھا کا دیدار کرلو۔ نہ اسے اپنے لوگوں کی پروا ہے اور نہ کسی اور کی۔" سکندر کے ایک دوست نے آوازہ کسا۔

"محبت کرنا ہر کسی کو نہیں آتا۔ اس کے لیے چند خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا۔" دوسرا دوست بھی مہمانوں کے سامنے دانشور بن کر ابھرا۔

مگر سکندر' کومل کا ہاتھ تھامے تقریب میں یوں گھوم رہا تھا' جیسے اُسے واقعی کسی کی پروانہ ہو۔

فریدہ بظاہر خوب ہنس رہی تھیں' لوگوں کی مبارک باد وصول کر رہی تھیں مگر اُن کے دل میں ایک کانٹا سا بھی چُبھ رہا تھا کہ پہلے بھاوج نے اُن کے بھائی پر قبضہ کیا اور اب بھتیجی نے اُن کا بیٹا شادی سے پہلے ہی پورے کا پورا اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ اپنی باتیں' اپنی وضاحتیں جو رشتہ مانگنے سے قبل انہوں نے کی تھیں' وہ یکدم بھول گئی تھیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد مغنیہ غزل گا رہی تھی اور کومل غزل کے بولوں کو اپنے دل پر محسوس کر رہی تھی۔

"نگاہوں میں اُترتی ہے کسی مہتاب کی صورت
ستارے آرزو کے اس طرح سے جگمگاتے ہیں
کہ پہچانی نہیں جاتی دلِ بے تاب کی صورت
محبت کے شجر پر آس کے پنچھی اُترتے ہیں
تو شاخیں جاگ اُٹھتی ہیں......!
تھکے ہارے ستارے جب زمین سے بات کرتے ہیں

تو کب کی منتظر آنکھوں میں......
شمعیں جاگ اُٹھتی ہیں......
محبت ان میں جلتی ہے......
چراغ آب کی صورت......
محبت خواب کی صورت......!"

☆☆☆

مغنیہ کی آواز بہت اچھی تھی۔ تالیاں دیر تک بجتی رہیں مگر سب کا یہی خیال تھا کہ یہاں تو محبت کی تعبیر نظر آ رہی ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ بے حد محبت سے رہیں گے۔

اب وہ کبھی یہ سوچ کر بھی ہنس پڑتی تھی کہ خواب اور تعبیر میں کتنے فاصلے ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے خوابوں کی کیسی بُری بُری تعبیریں ہو جاتی ہیں مگر یہ واقعی حقیقت تھی کہ......سکندر بہت محبت کرنے والا تھا۔ منگنی کے بعد' سکندر کسی چکور کی طرح کومل کے گرد چکر لگایا کرتا۔

صبح ہوتی تو وہ فون کر کے کومل کو جگاتا۔ "صبح بخیر کومل! اُٹھ جاؤ' کالج جانا ہے تمہیں۔" اور وہ کالج سے آتی تو اس کا فون اُس کا انتظار کر رہا ہوتا۔ شام کو وہ خود آ جاتا اور جانے کے بعد وہ رات گئے تک اس سے فون پر باتیں کرتا رہتا۔

مستقبل کے خوابوں میں دونوں رنگ بھرتے رہتے۔

رات جب گہری ہو جاتی' تو وہ کہتی پلیز اب تم بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ صبح کالج جانا ہے۔ تب وہ فون بند کرتا۔

محبت انسان کو کیسا دیوانہ بنا دیتی ہے۔ وہ اکثر اپنے آپ پر خود ہی ہنس دیتا۔

ایک دوپہر وہ اُسے کالج لینے پہنچ گیا۔ اُس دن شاید کالج میں کوئی فنکشن تھا۔ ہر لڑکی بنی سنوری کالج سے باہر نکل رہی تھی۔

آج کل لڑکیاں کس قدر شوخ کپڑے پہنتی ہیں' نارنجی اور اودے رنگ اس کی آنکھوں میں چُبھ رہے تھے۔

کافی دیر ہو گئی تھی' کومل ابھی تک باہر نہیں آئی تھی۔ وہ اپنی بائیک سے ٹیک لگائے خاصا بور ہو رہا تھا۔

لڑکیاں اس کے پاس سے گزرتے ہوئے' فقرے بازیاں کرتی ہوئی گزر رہی تھیں کہ آج کل کے فارغ لڑکے' لڑکیوں کو دیکھنے کے لیے اپنا وقت کیسے ضائع کرتے ہیں۔ اُن کی باتیں سن کر یکبارگی سکندر کے ماتھے پر پسینہ سا آ گیا تھا۔

'کومل! تمہارے انتظار میں' کیا عزت افزائی ہو رہی ہے۔' اس نے سوچا۔ 'بھئی' جلدی سے آ جاؤ ناں۔' اُس کے دل نے دعا کی۔

تب وہ اُسی لمحے اپنی سہیلیوں کے ہمراہ کالج سے برآمد ہوئی۔ دھانی شلوار قمیض' ہلکی ہلکی بوندا باندی میں بہت سج رہی تھی۔ قمیض اُس سے لپٹی ہوئی تھی اور اُس کے تن کا سارا سونا لٹا رہی تھی۔ چوڑا دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ پشت پر بکھرے ہوئے اور گھٹنوں تک آئے ہوئے بال ہوا کے ساتھ اُڑ رہے تھے' ابھی وہ اس سے بمشکل چار پانچ گز کے فاصلے پر ہو گی کہ وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔

"بارش تیز ہونے والی ہے مگر پہلے اپنا دوپٹہ اپنے اردگرد اچھی طرح سے لپیٹ لو کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی کی نظر تمہارے تن کو مکروہ کر سکے۔"

"کیا مطلب ہے' ان باتوں کا؟" وہ اُلجھ کر بولی۔

"یہی کہ انسان تو انسان' میرے علاوہ کوئی شجر حجر بھی تمہیں نظر بھر کر نہ دیکھے کہ نظر لگ سکتی ہے۔" اور وہ ہنس پڑی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ بائیک اُڑائے ہوئے خاصا بُرا مان رہا تھا۔

"ایمان سے......!" اسے بھی اس کا یہ انداز اچھا لگا تھا۔

مگر یہ ساری سچائی اور محبت کی تمام بیان بازیاں یکدم ہی اُڑن چھو ہو گئیں' جیسے کسی کے ہاتھ سے گیس بھرے غبارے چھوٹ جائیں۔

جب ایک حادثے میں زرینہ بانو کی ہڈیاں ڈیمج ہو گئیں۔

ان دنوں وہ نئی نئی گاڑی چلانا سیکھ رہی تھیں' غلطی بھی شاید اُن ہی کی تھی کہ سامنے سے آتی تیز رفتار گاڑی کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں اور بریک لگانے کے بجائے...... ایکسلریٹر پر اُن کا پاؤں دبتا چلا گیا۔

یوں اُن کی نئی گاڑی بھی تباہ ہوئی اور ساری زندگی کی معذوری بھی ملی۔ اُن کے ہاتھوں اور پیروں کی تمام ہڈیاں بُری طرح ٹوٹ گئی تھیں۔

ابھی ان کا علاج معالجہ ہی چل رہا تھا کہ رہی سہی کسر گھر میں ڈکیتی نے پوری کر دی۔ سونے کا ایک ایک تار اور گھر کی ایک ایک قیمتی چیز ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

"سکندر' یہ سب کیا ہو گیا ہے۔" وہ پریشان ہو کر روتی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ حواس باختہ سا کہتا۔

اُس کے چہرے پر بھی دکھ کے تمام رنگ تھے۔

رشتے دار' دوست احباب' آہستہ آہستہ کنی کترانے لگے کہ کہیں ہم سے کچھ مانگ نہ لیں۔

اور جب سکندر کا ایک ہفتے تک نہ فون آیا اور نہ ہی وہ خود آیا' تو پھوپھو کے گھر وہ خود ہی چلی آئی۔

ابھی وہ کوریڈور سے ٹی وی لاؤنج میں ہی آئی تھی کہ پھوپھو کی آواز سنائی دی جو وہ سکندر سے کہہ رہی تھیں۔ "توڑ دو یہ منگنی اور بھول جاؤ تم کومل کو' یہ سب اللہ کی طرف سے سزا ملی ہے ان لوگوں کو۔ اُس کی ماں نے محبت کا چکر چلا کر میرے اکلوتے بھائی کو چھین لیا تھا' اب ان لوگوں پر یہ عذاب آیا ہے کہ در در بھیک مانگیں گی کہ جوان بیٹا بھی اُن کا اپاہج ہے اور ماں بھی۔ ایسے گھرانے میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جہاں کوئی کھڑا ہو کر استقبال کرنے والا بھی نہ ہو۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اب تم کومل کے پاس گئے تو اپنی مری ماں کا مُنہ دیکھو۔"

اس سے زیادہ سننے کی ہمت کومل میں نہ تھی۔ وہ انگوٹھی وہیں رکھ کر اُلٹے پاؤں گھر لوٹ آئی تھی اور اس شب وہ سسک سسک کر روتی رہی۔ سکندر کی باتیں' یادیں' ہمک ہمک کر اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں مگر اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ آنسوؤں کے ریلے کے ساتھ ان یادوں اور چاہتوں کی کونپلوں کو بھی بہا دے گی۔ اپنی یا اپنی ماں کی ہتک اُسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھی۔ جس نے بیوگی میں اُسے ہر سکھ پہنچایا تھا۔

ماں اور بھائی کی معذوری اور گھر کی تباہ کاری کو دیکھ کر اُس نے کالج چھوڑ کر نوکری کر لی۔

اس کی کم عمری۔

اس کی ذہانت۔

اور اس کی معصومیت کو دیکھ کر کتنے ہی لوگ آگے بڑھے مگر اُس نے سب کو دُھتکار دیا۔

انجانے میں' سکندر کتنی دفعہ اس سے ٹکرایا۔ اپنی ماں کو منانے کے سطحی وعدے بھی کیے۔

لفٹ میں۔

اسٹاپ پر۔

آفس میں۔

مگر وہ اُس کے سامنے سے بے اعتنائی سے گزر گئی۔ جان پہچان کی ہر رمق اس نے اپنی آنکھوں میں بجھا دی تھی۔

پھر اس نے سنا کہ سکندر کا نکاح اپنی کسی کلاس فیلو سے ہو گیا ہے۔ پھوپھو نے اپنے خوب ارمان نکالے' آخر سکندر اُن کا بڑا بیٹا تھا۔

اُس دن اُسے بے حد ہنسی آئی کہ واقعی سکندر سچا تھا۔ پہلے اس نے منگنی کی ہے' پھر نکاح

کرے گا اور پھر شادی اور کومل تو ہر لڑکی کو کہہ سکتے ہیں۔ اُس نے تو کوئی بددیانتی نہیں کی۔ یہ سارا قسمت کا چکر ہوتا ہے۔ کسی کو کچھ نہیں پتہ کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اب اس کی قسمت ہی خراب تھی تو بے چارے سکندر کا کیا دوش۔ اب ہر شخص مقدر کا سکندر تو نہیں ہوتا ناں۔ وہ اپنے آپ کو بہ آسانی سمجھا لیا کرتی تھی۔

اور پھر خواب اور سپنوں والی عمر کس برق رفتاری سے گزری' اسے پتا ہی نہیں چلا۔ ماہ و سال اس تیزی سے بیتے کہ احساس تک نہیں ہوا۔ ٹائپنگ' شارٹ ہینڈ میں اس نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ اپنا دفتری کام خوش اسلوبی سے کیا کرتی تھی۔

کسی کو اس سے شکایت نہیں تھی کہ یکدم تانیا نے اُس کے آفس میں آ کر اُس کی نوکری ختم کرا دی تھی۔

"پریشان مت ہو' تمہیں کہیں نہ کہیں جاب ضرور مل جائے گی۔" ماں اسے دلاسا دیتیں۔

اس نے کتنے ہی دفتروں میں جا کر درخواست دی تھی مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

تب ماں کی ایک دیرینہ دوست نے مشورہ دیا کہ اپنے گھر میں فون لگوا لو تاکہ تم سے رابطہ کرنے میں آسانی رہے۔ میں کم از کم بچیوں کو ٹیوشن کے لیے تمہارے گھر بھیج سکوں گی۔

شکیلہ بیگم کسی اچھے اسکول میں ٹیچر تھیں اور ایک پُرخلوص خاتون تھیں۔ زرینہ بانو کے پُرافتاد حالات کا اُن پر گہرا اثر پڑا تھا۔ ان کی اپنی دانست میں یہی کوششیں ہوتی تھی کہ کسی طرح اس خاندان کی مدد کریں۔ یہ چھوٹا سا فلیٹ بھی انتہائی کم کرائے پر انہوں نے ہی اپنے کسی عزیز سے دلوایا تھا۔

گھر میں فون لگا تو واقعی بڑا کام آیا۔ شکیلہ بیگم نے میٹرک کی بچیوں کو انگلش کی ٹیوشن کے لیے کومل کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔

فی لڑکی پانچ سو روپے ٹیوشن طے پائی اور یوں دس لڑکیاں کومل کے گھر آنے لگیں۔

گھر بیٹھے بٹھائے پانچ ہزار روپے ملنے لگے۔

شکیلہ کا کہنا تھا کہ بچیوں کی تعداد امتحان کے زمانے میں اور بڑھ جائے گی۔

ٹیلی فون بہت کام آ رہا تھا۔ شکیلہ ہر دوسرے تیسرے دن فون پر رابطہ کر کے کسی نئی لڑکی کا اضافہ کر رہی تھی۔ دو ہی مہینے میں سترہ لڑکیاں ہو گئیں۔

کومل نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ گھر بیٹھے وہ ماں کی خدمت بہتر طور پر کر رہی تھی۔

"میں نے شکیلہ سے بات کی ہے۔ تیرے لیے کوئی اچھا لڑکا دیکھے۔" ایک دن امی نے اُس سے کہا۔

"کمال کر رہی ہیں آپ' میں آپ کو اور فراز بھائی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔" اس نے حسبِ عادت سختی سے کہا۔

"ساری زندگی کیا یوں ہی گزار دے گی۔" ماں کا لہجہ دُکھوں سے لبریز تھا۔

"ہاں۔ اور مجھے اس پر کوئی تاسف بھی نہیں ہوگا۔" اُس نے محبت بھری نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں کوئی گھر داماد ڈھونڈ لوں تو۔ شکیلہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔"

"امی پلیز!" وہ شرما سی گئی...... مگر یہ کیفیت صرف چند منٹوں کی تھی۔ بھائی جب وہیل چیئر موڑتے ہوئے گرا تو وہ بھاگ کر اُس کے پاس گئی اور کتنی ہی دیر اُس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ امی کی باتیں' کیسی تیز رفتار بادل کی طرح اس کے ذہن سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

ایک شام وہ بچیوں کو پڑھا رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی' کومل نے وہیں بیٹھے بیٹھے ریسور اُٹھا لیا۔

"کومل بول رہی ہیں؟" کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔

"جی ہاں۔"

"کہاں سے بول رہی ہیں؟"

"جہاں آپ نے فون کیا ہے۔" اُسے غصہ آ رہا تھا مگر شائستگی کا دامن اس نے تھامے رکھا کہ شاید نئے ٹیوشن کی کوئی بات ہو۔

"تو پھر غور سے ہماری بات سنئے۔" آواز میں اچانک ہی سنجیدگی در آئی۔

"جی فرمایئے!"

"کومل جی! مسز غفار کے زخمی ہونے پر آپ کو دو ہزار روپے ملیں گے۔"

"کون مسز غفار......؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

مگر فون بند ہو چکا تھا۔

ہوگا کوئی رانگ نمبر۔ اُس نے سر جھٹک دیا۔

اس فون کو وہ شاید کوئی اہمیت بھی نہ دیتی۔ یوں ہی لا اُبالی' بے تکے فون آنا اب روزمرہ کی زندگی کا ایک اہم جز بن چکے ہیں۔ مگر کوئی دس دن کے بعد ڈاک سے اسے ایک لفافہ ملا جس میں ہزار روپے کے دو نئے نوٹ تھے اور ٹائپ شدہ کاغذ پر ایک مختصر سی تحریر تھی۔

"مس کومل...... آپ کا بے حد شکریہ!"

"شکریہ...... مگر کس بات کا؟ اس نے کئی مرتبہ اس مختصر سے کاغذ کو پڑھا اور تھک کر اسے

وہیں دراز میں ڈال دیا۔

دو ہزار روپے اُسے کسی ناگ سے کم نہیں لگ رہے تھے جو کنڈلی مارے اس کی دراز میں بیٹھے تھے۔ کسی کام سے وہ دراز کھولتی اور اس لفافے پر اس کی نظر پڑتی تو پورا جسم پسینے میں نہا سا جاتا۔

اپنی جانب متوجہ کرنے کا شاید کوئی یہ انداز ہو۔ اُس کا دل نئی نئی تاویلیں دیتا۔

شکیلہ آنٹی اس کے لیے جو گھر داماد ڈھونڈ رہی تھیں' کہیں اُس نے قبل از وقت اُس کی مدد کرنی شروع تو نہیں کر دی کہ اس گھر کے مسائل اور تمہارے مسائل میرے اپنے ہیں' جانم! تم آنکھیں بند کر لو' میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا...... وہ نت نئی کہانیوں سے خود کو تسلی دیا کرتی۔

اگلے تین ہفتوں تک کوئی فون نہیں آیا اور نہ ہی کوئی خط تو اس کا خوف بھی قدرے کم ہو گیا۔ وہ شام کو ان روپوں سے ماں کی دوائیں' پھل اور گھر کا ضروری سامان لے آئی۔

''خواہ مخواہ میں ڈرتی رہی۔ اسی شہر میں نہ جانے کتنی کومل ہوں گی' پتہ نہیں کس کے شبہے میں مجھے پیسے بھیج دیے گئے ہیں۔''

''اور اگر کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اپنے پیسے واپس مانگے تو...... میں کہاں سے دوں گی۔'' پیسے خرچ کرنے کے بعد ایک دوسرے خوف نے سر اُٹھانا شروع کر دیا۔

''ارے' میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہوں۔ میرے پاس کون سا کسی کا منی آرڈر آیا تھا۔ میں نے کون سے کہیں دستخط کر کے رقم وصول کی ہے۔ یہ تو یقیناً کسی دیرینہ رفیق نے اس کی مدد کا یہ ڈراما رچایا ہے۔''

شاید امی کی کوئی دوست!

شاید اُس کی کوئی سہیلی!

شاید سکندر...... کہ اُسے معلوم ہو گیا ہو کہ آج کل میں جاب لیس ہوں۔

شاید پھوپھو...... کہ اُنہیں احساس ہوا ہو کہ ان دنوں سگی بھتیجی پریشان ہے۔

اس کی شاید پتہ نہیں کیا کچھ مزید سوچتی کہ ایک شام فون پر وہی آواز ہمکلام تھی۔

''مس کومل جی!''

''مسز جاوید کے زخمی ہونے پر آپ کو ڈھائی ہزار ملیں گے۔''

''مگر کیوں......؟''

دوسری جانب فوراً فون بند کر دیا گیا۔

اب حقیقت میں پریشان ہو کر اُس نے اپنا سر تھام لیا۔

مسز غفار کون تھیں؟

مسز جاوید کہاں ہیں؟ کون ہیں؟

وہ ان سب سے قطعی ناواقف تھی۔

ایک ناکردہ جرم اُسے خوف زدہ کر رہا تھا۔

شاید کوئی اسے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔

یا کوئی اُسے خوف زدہ کر رہا ہے تاکہ مارے دہشت کے اُس کا دم نکل جائے۔

''مگر اس کے مرنے سے کسی کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔'' یکبارگی وہ ہنس دی۔ یوں بھی وہ ان زہریلی سوچوں سے خود کو نجات دلانا چاہتی تھی۔

''بھاڑ میں جائیں مسز غفار اور مسز جاوید......'' اُس نے اپنے آپ کو دلاسا دیا۔

''جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو کیوں اذیت دوں۔ گھر میں پہلے ہی پریشانیاں کم نہیں تھیں۔'' وہ اس فون اور خط کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی پوری سعی کر رہی تھی اور جس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

بچیوں کی ٹیوشنیں بھی کم ہو گئی تھیں کہ بہت سی بچیاں امتحان دینے کے بعد باقاعدگی سے پڑھنا ضروری نہیں سمجھتیں۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد بچیوں نے آنا ختم کر دیا تھا۔ ہاں نویں جماعت کی آ رہی تھیں۔

ایک دوپہر وہ ایک آفس سے اپنی درخواست کے بارے میں پوچھنے گئی تو واپسی پر قریبی مارکیٹ سے گزرتے ہوئے اس نے پھوپھو اور سکندر کو دیکھا۔ وہ کسی بوتیک کے باہر بچوں کے کپڑے پسند کر رہے تھے۔ سکندر کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

ان دونوں نے بھی اسے دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا اور وہ بھی اُن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر قریبی بس اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد سکندر' پھوپھو کو ساتھ لیے اُس کے سامنے سے گزرا' پچھلی سیٹ پر دو بچے بھی بیٹھے تھے۔

اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی گاڑی کی دھول کو دور تک دیکھتی رہی۔

''بے ایمان کہیں کا۔ میرے بغیر پاگل ہو گیا ہے ناں۔'' اسے پہلی دفعہ سکندر پر بے حساب غصہ آیا۔

تین ہفتے بعد ٹائپ شدہ لفافہ ڈاک سے آیا تو اس میں ڈھائی ہزار کی رقم موجود تھی اور ساتھ ہی شکریے کا مختصر سا خط۔

رقم اس نے اپنی مٹھی میں دبالی‘ ان دنوں بھائی کی فزیکل تھراپی پر اُس کے خاصے پیسے خرچ ہو رہے تھے اور اس تھراپی سے بھائی کو بھی خاصا افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ ’میری بلا۔ سے مسز غفار اور مسز جاوید چولھے میں جل جائیں۔‘

’نہیں‘ میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں دے سکتی‘ یہ کون خواتین ہیں جن کے زخمی ہونے سے کسی کو فائدہ پہنچ رہا ہے اور وہ مارے خوشی کے پیسے بانٹ رہا ہے۔‘

کچھ سوچ کر اس نے پرانے اخبار پڑھے تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں خواتین خاصی معروف تھیں اور اُن کے زخمی ہونے کی اطلاع بھی اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ مسز غفار کے پیر میں کمپاؤنڈ فریکچر ہوا تھا۔

اور مسز جاوید لفٹ خراب ہونے کے باعث حواس باختہ ہو کر بے ہوش ہو گئی تھیں اور اُن کی یہ بے ہوشی ختم ہونے کے باوجود اُن کی سراسیمگی بدستور قائم تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کے اعصاب جیسے ٹوٹ کر رہ گئے ہیں۔

یہ دونوں خواتین اہم عہدوں پر فائز تھیں اور طبیعت کی خرابی کے باعث غیر معینہ مدت کی چھٹی لے کر گھر پر آرام کر رہی تھیں۔

”امی‘ جو بغیر کسی وجہ کے ہماری مدد کرے‘ اسے آپ کیا کہیں گی۔“ ایک شام اس نے پوچھا۔

”فرشتہ کہوں گی۔“ وہ فوراً بولیں۔

”کون ہے‘ آج کل فرشتہ‘ آپ کی نند یا اُن کا بیٹا سکندر؟“ اُس نے نفرت سے کہا۔

”اُن کا تو ذکر بھی مت کرو۔ ایسے رشتے داروں کا تو ذکر بھی نہیں کرنا چاہیے جو غم کے ساتھی نہ ہوں۔“

”تو پھر کون ہے وہ فرشتہ!“ اُسے ہنسی آ گئی۔

”میری دوست شکیلہ‘ جس نے ہماری بے لوث مدد کی ہے۔“

”ہاں‘ یہ بات تو ہے۔ اگر دنیا میں ایسے لوگ نہ ہوں تو لوگوں کا اعتبار ہی ختم ہو جائے۔“

’پتہ نہیں‘ وہ کیا سوچیں گی‘ امی کو اگر پتہ چل گیا تو اُن کے ڈیپریشن میں خواہ مخواہ الگ اضافہ ہو گا۔ بلڈ پریشر ویسے ہی اُن کا ہائی رہتا ہے۔ اگر مزید بڑھ گیا اور اُنہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟“ ماں کی بیماری وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”چلو‘ میں شکیلہ آنٹی سے یہ کہہ دوں کہ آپ اِن باتوں کا امی سے ذکر نہ کریں تو......“ اُس نے سوچا۔

’شکیلہ آنٹی کا ایک بھائی پولیس میں ہے۔ خواہ مخواہ ہیرو بننے کے چکر میں وہ یہ سب باتیں اخبار میں دے دے گا۔ یہ تھوڑی بہت لڑکیاں جو ٹیوشن کے لیے آ رہی ہیں‘ وہ بھی غائب ہو جائیں گی پھر میں کیا کروں گی۔‘ اس وقت پیسے کی پریشانی سب سے بڑی پریشانی تھی۔

’جو ہو رہا ہے‘ ہونے دو۔ دیکھا جائے گا۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے‘ دماغ نے اسے تسلی دے دی۔ جس سے وہ خاصی مطمئن بھی ہو گئی۔

”مس کومل جی...... مسز ناصر خان کے زخمی ہونے پر آپ کو پانچ ہزار روپے ملیں گے۔“

ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مخصوص فون نے اُسے پھر دہلا دیا۔ مگر اس دفعہ کا خوف اور دہشت پہلے کے مقابلے میں خاصا کم تھا یا اس قسم کے تھرل سے اسے کچھ لطف بھی آنے لگا تھا۔ ارے واہ‘ اس دفعہ تو فون بھی جلدی آ گیا‘ اسے خوشی سی ہوئی۔

”اللہ‘ رقم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ کوئی اہم خاتون ہوں گی۔“ مگر کومل نہیں جانتی تھی۔

”اف یہ شخصیت کون ہو سکتی ہے۔“ سوچ سوچ کر اُس کا ذہن تھک گیا تھا۔

اور آخر کار اس کے ذہن میں یہ آ ہی گیا کہ اُسے فوراً ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھنی چاہیے۔

اور جب دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس نام کی سات خواتین ہیں۔ پانچ کا تعلق دوسرے شہروں سے ہے۔ دو کا اس شہر سے ہے‘ ایک مس ناصر خاں ہے تو دوسری مسز ناصر خاں۔ اسے تو مسز ناصر خان سے دلچسپی تھی۔ جب فون آنے کے بعد ایک ماہ گزر گیا اور پیسوں کا لفافہ نہیں آیا۔ تو مارے گھبراہٹ کے اُس نے مسز ناصر خاں کے ہاں فون کر ڈالا۔ اُن کا فون نمبر اس نے احتیاطاً ٹیلی فون ڈائریکٹری سے نوٹ کر لیا تھا۔

”آج کل اُن کے بچے باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے دفتر نہیں جا رہی ہیں۔ جب وہ دفتر جائیں تو آپ اُن سے وہیں بات کیجئے گا۔“ ملازمہ نے بات پوری کرتے ہوئے فون منقطع کر دیا۔

مزید تین ہفتے گزر گئے۔ پیسے ابھی بھی موصول نہیں ہوئے تھے۔

اُس نے پھر فون کیا اور پوچھا کہ میڈم اپنا آفس کب جوائن کریں گی۔

”میڈم نے چھٹی بڑھا لی ہے۔“ ملازمہ نے بات مکمل کر کے پھر فون بند کر دیا۔

کیسی عیاشی سوجھ رہی ہے اس عورت کو۔ جاب کرنے والی عورتوں کو اتنی چھٹیاں تھوڑی کرنی چاہئیں۔ ایسے دنیا سے انوکھے بچے آئے ہیں کہ وہ آفس جانا بھی بھول بیٹھی ہیں۔‘ کومل دل ہی دل میں بڑبڑا رہی تھی۔

ہر آہٹ پر ڈاکئے کا گمان ہوتا۔ صبح سویرے اُٹھ کر وہ سب سے پہلے حادثات کی خبریں

پڑھا کرتی تھی بلکہ دیگر خبریں پڑھنے میں اُس کا دل قطعی نہیں لگتا تھا۔

"خدا کرے' کسی دن سکندر کی بیوی کو زخمی کرنے کا فون آ جائے۔" اُس نے سوچا۔

اس کم بخت کو تو میں خود جا کر زخمی کرآ ؤں گی۔

'ارے نہیں' سنا ہے کہ اُس کے تیسرا بچہ ہونے والا ہے۔'

'ہوسکتا ہے کہ وہ زچگی کے دوران میں ہی مر جائے۔ تب شاید سکندر میری طرف پلٹ آئے۔'

اُس کی زہریلی سوچیں اُسے پریشان کر رہی تھیں اور وہ از خود متاسف بھی ہو رہی تھی۔

ان دنوں کومل کے حالات عجیب سے ہی تھے۔ کبھی سکندر اُسے شدت سے یاد آتا اور کبھی اُسے اُس سے اتنی نفرت ہوتی کہ وہ اپنے احساسات پر خود نفرین بھیجنے لگتی کہ جیسے اس کے تمام ترُبرے حالات کا ذمّے دار وہی تھا۔

مسز ناصر خاں کے توسط سے ملنے والے پیسے ابھی تک نہیں ملے تھے۔

'کم بخت کب زخمی ہوگی' کب مجھے پیسے ملیں گے۔ لاڈلی صاحبہ' ٹھاٹ سے گھر میں آرام فرما رہی ہیں' دوسروں کی ضروریات کا اندازہ نہیں ہے۔'

اب خوف و پریشانی کے بجائے اُس کو پیسے کی چاٹ پڑ گئی تھی۔

بغیر کام کیے پیسے ملنے کا الگ ہی مزہ تھا۔

جیسے کسی نے وظیفہ باندھ دیا ہو۔

جیسے کوئی اُس کے نام پیسے فکسڈ کروا کے بھول گیا ہو یا وقتاً فوقتاً اس کی کوئی لاٹری نکل رہی ہو۔

کومل کو اب واقعی مزہ آ رہا تھا۔ کوئی بھی بری چیز شروع شروع میں ہی بری لگتی ہے' بعد میں انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ کومل کے ساتھ ہو رہا تھا۔

"کومل' یہ گناہ ہے۔" اس کا دل کبھی کبھار کسی ایک لمحے کے لیے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کرتا۔

'اُونہہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ صرف زخمی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خدانخواستہ کسی کا کوئی جانی نقصان تھوڑی ہو رہا ہے اور پھر زخمی کرنے بھی میں نہیں جا رہی' پتہ نہیں کام کون کر رہا ہے اور پھل مجھے مل رہا ہے۔'

خدا خدا کر کے مسز ناصر خاں نے آفس جوائن کیا اور آفس جوائن کرنے والے دن ہی سڑک کراس کرتے وقت گزرنے والی کار سے وہ اچانک ٹکرا گئیں۔ جس سے اُن کی پسلیاں بُری

طرح ٹوٹ گئیں۔

اسپتال میں اُن کو ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ یہ سب خبریں کومل نے اخبارات میں پڑھیں۔

اس وقوعے کے تیسرے دن ہی ایک ایک ہزار کے پانچ نئے نوٹ اُس کے پاس آ چکے تھے۔

کومل نے اپنے لیے دو ریشمی سوٹ بنائے۔ امی کے لیے شال لی' بھائی کے لیے ایک کُرتا شلوار کا سوٹ لائی اور ڈرائنگ روم کے لیے لنڈے کے پردے بھی لے لیے۔

ماضی میں اس کا گھر کیسا اچھا تھا مگر گھر میں ڈاکہ پڑنے اور ماں کے معذور ہونے کے باعث انہیں وہ آفس کی جانب سے ملی ہوئی رہائش گاہ خالی کرنی پڑ گئی تھی۔ چھوٹی موٹی گھر کی چیزیں ماں کے علاج پر بک گئی تھیں۔ پہلے کومل کی جاب گھر کی گاڑی جیسے تیسے کھینچ رہی تھی اور اب اس کا کوئی خیر خواہ پیدا ہو گیا تھا۔

اُس شام اُس نے خوش رنگ سا سوٹ پہنا۔ دل جمعی سے اپنے آپ کو سنوارا' ڈیک لگا کے کمرے میں گانے سنے۔ امی کی دوست شکیلہ آنٹی کو فون کر کے اُن کی خیریت پوچھی' اُن کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور امی کی جانب سے انہیں یہ پیغام بھی دیا کہ اس کے لیے کسی اچھے سے لڑکے کا ضرور خیال رکھیں۔

اب شام ہوتے ہی اُسے فون کا گویا انتظار سا رہتا۔

اللہ انعامی فون کب آئے گا۔ وہ فون کو جیسے گھور کر پوچھتی کہ شاید وہ ہی بتا دے کہ کب مالا مال ہونے کی گھنٹی بجے گی۔

اور پھر واقعی فون آ گیا اور مخصوص آواز سن کر اُس کا دل جیسے جھوم اُٹھا۔

"کومل جی!" مخصوص خاتون کی آواز اُس کے کانوں میں جیسے رس گھولنے لگی۔ اُس نے از خود پوچھا۔

"اب کون زخمی ہوگا۔" کس کی ذات سے ہمیں خوشیاں ملنے والی ہیں۔

"کومل جی......!" آواز میں خوشی کا رنگ اُبھرا۔ "لگتا ہے۔ آپ تو جیسے انتظار کر رہی تھیں۔"

"ظاہر ہے' آتے ہوئے پیسے کس کو بُرے لگتے ہیں۔" وہ چہکی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی آپ۔"

"تو پھر اب کون سی شخصیت ہمیں سکھ پہنچا رہی ہے؟" وہ ہنسی۔

"کومل جی......! مسز طفیل وحید کے زخمی ہونے پر آپ کو پچاس ہزار روپے ملیں گے۔"

"ایمان سے!" مارے خوشی کے اُس کی چیخ ہی نکل گئی۔

مگر فون بند ہو چکا تھا۔ حالانکہ اس کا دل بہت ساری باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔

"واہ' یہ ہوئی ناں بات۔ پانچ ہزار سے پچاس ہزار۔ اتنی زبردست ترقی! بھئی واہ' مزے آ جائیں گے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھا۔ مسز طفیل کسی سرکاری ادارے میں ایک وی آئی پی پوسٹ پہ فائز تھیں۔ ٹی وی جم کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ خبرنامے میں بھی گاہے بہ گاہے نظر آتی ہیں۔

خوب صورت بھی تھیں اور خوش گفتار بھی۔ جب وہ کسی تقریب سے خطاب کرتیں' تو یوں لگتا اُن کے لبوں سے پھول جھڑتے ہیں۔

اللہ کرے' وہ جلدی سے زخمی ہو جائیں تو یہ لاٹری نکل آئے۔ وہ روزانہ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ پچاس ہزار سے اُسے کیا کیا خریداری کرنی تھی۔ اس کی وہ ایک لمبی لسٹ بنا چکی تھی۔

وہ روز اخبار پڑھتی' شام کے بھی کئی اخبار اُس نے لینے شروع کر دیے تھے کہ بہت سی حادثاتی خبریں صرف شام کے اخبار ہی شائع کرتے تھے مگر اُس کی من پسند خبر کہیں نظر ہی نہیں آئی تھی۔

اخبارات پڑھ کر اُس کا موڈ بھی خاصا آف ہو جاتا۔ حد ہو گئی تھی' گزشتہ دس روز سے شہر میں حادثے کا شکار صرف مرد یا بچے ہی ہو رہے تھے۔

دعائیں مانگتے مانگتے وہ تھکی جا رہی تھی مگر اُس کی دعا میں جیسے اثر ہی نہیں تھا کہ انہیں شاید چھینک تک نہ آتی تھی۔ آج بھی خبرنامے میں اُنہیں ہشاش بشاش دیکھ کر اسے غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

فون آئے ہوئے کوئی دو ماہ کا عرصہ ہو گیا' نہ ہی پیسے آئے اور نہ ہی کوئی اور فون......!

موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوئیں تو ٹیوشن کی دیگر بچیاں بھی موسمی بٹیروں کی طرح اُڑ گئیں۔

"اللہ اب گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟'

"شیشے میں اپنے کو دیکھنے کی جو عادت ہو گئی تھی' اب کیسے ختم ہو گی۔"

اس نے مسز طفیل کے گھر کئی گمنام فون کئے تو پتہ چلا کہ وہ طویل چھٹی لے کر گھر بیٹھی ہوئی ہیں کیونکہ چند ماہ بعد اُن کی دو بچیوں کی ایک ساتھ شادی ہو رہی ہے۔

'اُونہہ' شادی تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے' تھوڑی سی خوشیاں ہمیں بھی فراہم کر دو۔' اس کا ذہن اب اس نوعیت کی باتیں سوچا کرتا۔

'پچاس ہزار کمانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ظاہر ہے' جب گھر سے باہر نہیں نکلیں گی تو زخمی کیسے ہوں گی۔'

'شیر کو بھی کبھار سے لوگ باہر لے آتے ہیں۔ ان کو گھر سے باہر نکالنا کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں ہو سکتا۔' اُس کا ذہن زہریلی سوچوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اسکول کھل چکے تھے اور اس کے پاس کوئی ٹیوشن نہیں تھی۔

تب اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

ایک شب اُنہیں گمنام فون کر کے کہا۔ "میڈم میں کل آپ کے آفس میں ایک ضروری کام سے حاضر ہوں گی۔ باہر کے ملک سے آئی ہوئی ہوں۔ اگر کل آپ اپنے آفس میں مجھے چند منٹ دے دیں تو میں یہ سمجھوں گی کہ اس دفعہ اپنے وطن آنا مبارک ٹھہرا کہ آپ جیسی شخصیت سے میں متعارف ہو سکوں گی جس کے لیے میں آپ کی انتہائی ممنون ہوں گی۔"

"اچھا' میں ٹھیک صبح سات بجے اپنے آفس میں ہوں گی۔" مسز طفیل کا لہجہ بے حد میٹھا اور بے حد ملائمت بھرا تھا۔

پھر اُس شب کے اندھیروں میں' جب رات خاصی ڈھل چکی تھی' ان کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے وہ گریس ملا آئل کا پورا کنستر اُلٹ آئی۔

اور اگلی شام کے اخبارات میں جہاں یہ خبر چھپی کہ شہر میں جعلی نوٹوں کی پُر اسرار گردش ہو رہی ہے' وہاں یہ خبر بھی بے حد واضح تھی۔

"آج صبح اچانک سڑک پر پھسل جانے کے باعث مسز طفیل سمیت اٹھارہ افراد شدید زخمی ہوئے جن میں دس بچے بھی شامل تھے' جب وہ صبح اسکول جانے کے لیے اپنے فلیٹوں سے باہر نکلے تو گریس پر پھسل گئے جو اُن کے فلیٹوں کے نیچے سڑک پر پڑا ہوا تھا۔"

اخبارات کے فرنٹ صفحات پر زخمی بچوں اور بڑوں کی تصاویر بھی دی گئی تھیں۔ چار خواتین ساری زندگی کے لیے مفلوج ہو گئی تھیں۔

اخبارات پڑھ کر کومل کو سکتہ سا ہو گیا۔

'یہ میں نے کیا کر دیا۔'

"یہ میں نے کیوں کر دیا۔'

'میں نے اپنی ماں کو مفلوج کر دیا۔ یہ سب تصویریں تو میری امی کی ہیں۔ اُن کو بھی تو کسی نے ایسے ہی مفلوج کیا تھا۔ نہیں' میں نے کیا تھا۔' وہ بار بار اخبار دیکھ رہی تھی اور چیخیں مار رہی تھی۔

اس مرتبہ اُس شام اُسے لفافہ موصول ہو گیا۔ جس میں پچاس ہزار روپے تھے اور ایک مختصر خط بھی جس میں لکھا تھا: ”مس کومل جی! آپ کو اپنی نئی جاب مبارک ہو۔“

تب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ یہ کیسی عجیب مبارک باد تھی۔

دہشت گردوں کے ایک ٹولے نے بالآخر اُسے اپنے گروہ میں شامل کر ہی لیا تھا۔ ان کا کام اُس نے از خود کرنا جو شروع کر دیا تھا۔

❀❀❀

بادلوں کے سنگ

جانے کیوں مجھے مسز احمد سے چڑ سی تھی۔

جیسے لوکی، گھیا اور کدو سے چڑ ہے۔ نام الگ الگ مگر کوئی سی بھی پکا لو...... سب کا ذائقہ ایک سا پھیکا اور میٹھا سا......

مسز احمد جب بھی ہمارے ہاں آتیں ...... ہمیشہ اتنی پیاری لگتیں کہ میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی...... ان کے حسن کے قصیدے...... ہمارے گھر میں اس قدر پڑھے جاتے تھے کہ میں ان سے بیزار ہو چکی تھی۔

ان کے جانے کے بعد بھی ان کی چاہت کے گیت، گھر میں مزید دو دن اور بجتے رہتے۔

”ہائے کتنی پیاری ہیں......!“

”ذرا بھی تو مغرور نہیں ہیں۔“

”اللہ ان کا قد کس قدر آفت تھا۔“ ہماری چھوٹے قد کی نند ہمیشہ ان کی لمبائی پر مرا کرتیں۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ سرانچے کے بانس کی طرح لمبی تھیں۔ اور اس پر وہ اُونچی ہیل کا سینڈل پہن کر زمین پر یوں ٹپک ٹپک کر چلتیں کہ دھرتی ماتا کا سینہ بھی دہل جاتا...... اور ان کی سینڈل کی باریک ہیل...... مجھے اپنے سینے میں چبھتی محسوس ہوتی۔ مسز احمد صرف ہمارے ہاں ہی پسند نہیں کی جاتی تھیں۔ بلکہ وہ حقیقت میں حسین ترین خاتون تھیں۔

سُبک سا ناک نقشہ، متوازن جسم ...... اس پر وہ بلا کی۔ دیدہ زیب جو وہ پہنتیں...... کپڑا کھلا اُٹھتا۔

ساڑھی اس نفاست سے پہنا کرتیں کہ مجال ہے کہ اس کی فال اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔

شلوار قمیض بھی خوب بجتی...... اور جب کُرتا، پاجامہ اور چُنا ہوا دوپٹہ اوڑھ کر آتیں تو...... مغلیہ شہزادی لگا کرتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ شاندار چیز تو ان کے بال تھے۔ بالکل شہد کی طرح

گھرے براؤن...... ریشمی ریشمی سے...... ہمیشہ ایک ہی روٹین میں رہتے...... سلیقے سے پوری پشت پر پھیلے ہوئے...... مجال ہے کہ کبھی نوکیں بڑھی ہوں' یا بالوں کی ترتیب وتزئین میں کبھی کوئی فرق ہو...... ہمیشہ گھٹاؤں کی طرح پوری کمر پر پھیلا کر رکھتیں۔

اور پھر...... خدا نے مناسبت بھی تو کس قدر دی تھی...... جیسے براؤن بال تھے...... اسی رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں...... بالوں کے شکنجے سے نکلو...... تو آنکھوں میں ڈوب جاؤ...... اور پھر ان کا بات کرنے کا انداز ایک قیامت لیے ہوئے تھا...... باتوں کے دوران اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی وہ اپنے بالوں میں چلاتی رہتیں ہونٹ دبا کر ہنستیں...... اور کوئی پُر لطف بات سُنا کر...... اپنی دائیں آنکھ شرارت سے دباتیں۔

ہماری نند...... ان اداؤں پر جھوم جاتیں......!

''اونہہ...... نری چیپ حرکت......'' ہم جل کر کہتے۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ۔'' ہماری نند بھولپن سے پوچھتیں!

''بھئی سچی بات ہم کرتے ہیں...... عورت اگر سگریٹ پیئے یا بدمعاشوں کی طرح آنکھ دبا کر بات کرے تو نری چھچھوری لگتی ہے۔ گری ہوئی سی واہیات۔''

''ارے بیٹے بھی...... کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...... عورت عورت کی بات ہوتی ہے یہ ادائیں ہر ایک پر تھوڑی جچتی ہیں۔''

اور ہماری ساس تو ان کی اس قدر عاشق تھیں...... کہ توبہ ابھی وہ اپنے لطیفہ سنانے کی ابتدا کرتیں اور ساس کا بلند بانگ قہقہہ پہلے تیار ہوتا۔

اور وہ تھیں بھی خاصی چلتر جب سے اُنہیں یہ اندازہ ہوا تھا کہ اس گھر میں اصل حکمرانی ہماری ساس کی ہے۔ 'اللہ خالہ جان' اور 'پیاری خالہ جان' سے تو وہ بات کی ابتدا کیا کرتی تھیں اور ہماری ساس اس کی چہکتی باتوں پر جس قدر خوش ہوتیں میں اتنی ہی جل کر رہ جایا کرتی تھی اور ساس مجھے جلانے کے لیے مجھ سے سوا روپیہ مانگ کر ان کی نظر اُتارا کرتیں۔

''ارے میری چندا...... آج اتنی پیاری لگ رہی ہے کہیں نظر نہ لگ جائے۔''

''اُفوہ......؟ میری شہزادی نے آج کس قدر ہنسایا ہے کیسی ہنس مکھ ہے...... خدا نظر بد سے بچائے۔''

اور میں یہ باؤلے پن کے مناظر دیکھ کر جل بھن کر خاک ہو جاتی...... اونہہ...... ہر ساس کی ایک یہی تو خاص کمزوری ہوتی ہے کہ ہمیشہ دوسرے کی بہو اچھی لگتی ہے۔

ٹھیک ہے۔ میں ان کی طرح حسین نہ تھی۔ مگر سال چھ مہینے میں کبھی تو کوئی کپڑا مجھ پر بھی

کھلا ہوگا۔ پیارا لگا ہوگا۔

مگر بڑھیا نے ہماری تو کبھی نظر نہیں اُتاری تھی۔ یہ اُن کی نظروں کا ہی فتور تھا...... کہ ہم ان کو ہمیشہ واجبی سے نظر آتے تھے۔ ان کا اس پر ہی بس نہیں تھا۔ بلکہ وہ ہر آئے گئے کے سامنے بڑے دھڑلے سے کہا کرتیں۔

''ارے ہمارے تینوں بیٹے اپنی پسند سے پھٹکار ماریاں لے آئے۔ ہائے ہائے خاندان کی ہیرا لڑکیاں اپنے گھروں میں بیٹھی رہ گئیں۔''

اب کون اُن سے پوچھتا کہ تمہارے خاندان کی لڑکیاں اگر ہیرا ہوتیں تو لڑکے خود ہی نہ لے آتے۔

☆☆☆

حالانکہ مسز احمد کے چار بچے تھے مگر کہیں سے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ چار بچوں کی لمّاں جان ہیں۔ نہ پیٹ بڑھا ہوا نہ کولہے ڈھلکے ہوئے اور نہ ہی کوئی پژمردگی۔ ایسا چاق و چوبند جسم کہ قلانچیں لگوا لو۔ اور چہرہ ایسا تر و تازہ کہ کیا موٹی اداکاراؤں کا ہوگا۔ اور پھر میک اپ کا سلیقہ الگ وہ جانتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں ایک ہم تھے کہ دو بچوں میں ہی ڈھیر ہو گیا تھا۔ کمر...... اچھا خاصا کمرہ بن چکی تھی...... اتنے موٹے تھے کہ دو متوازی لکیریں کھینچنے سے ہمارا گراف بن جاتا تھا۔ جسم میں پیچ و خم کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔

ایک دفعہ ان کی حرص میں میک اپ کرنے کی کوشش کی تھی تو کریم رگڑ رگڑ کر چہرے کی کھال پھاڑ بیٹھے تھے۔ آئی شیڈ اور مسکارا لگانے سے ہماری چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس قدر بدہیبت ہو گئی تھیں کہ گود کا بچہ چیخ مار کر پڑوس کے گھر میں جا چھپا تھا۔ کس قدر چکارا تھا مگر وہ گھر آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اور جب غیاث گھر آئے تو...... وہ فریفتہ ہونے کے بجائے تحیر سے ہمیں گھور رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' ہم نے سہم کر پوچھا۔

''یہ بات تو مجھے تم سے پوچھنی چاہیے۔'' وہ ہنسے۔

''کیوں......؟''

''کیا کہیں...... سرکس میں کام مل گیا ہے؟''

''کیا بکواس ہے......؟'' ہم اچھے خاصے ناراض ہو گئے۔

''ذرا شیشے میں منہ جا کر دیکھو کہ کیسی بلا لگ رہی ہو۔''

اللہ جب ہم نے دیکھا تو خاصے شرمسار ہوئے۔ ہمارا گیلا ہاتھ لگنے سے آئی شیڈ نہ صرف

بھنوؤں تک پھیلا تھا بلکہ رخساروں تک بھی آ رہا تھا۔

ہماری ساس نے ہمیں جب اس حلیے میں دیکھا تو انہیں ہنستے ہنستے اچھو ہو گیا۔ اور نند تو قہقہے لگاتے لگاتے بے دم ہو گئیں۔ ان کو پانی پلا کر ہوش میں بھی ہمیں ہی لانا پڑا۔

تب ہم افسردہ افسردہ سے منہ دھو کر پڑوس سے اپنے گڈو کو لینے چلے گئے۔ وہ بے وقوف ڈر کر چلا گیا تھا۔

ہاں اس کے بعد ہم نے میک اپ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ ذلیل تجربہ بھی ہمیں ان منحوس خاتون کی وجہ سے ہوا تھا۔ احمد صاحب غیاث کے افسر تھے مگر وہ یونیورسٹی کے ان کے پرانے ساتھی تھے اس لیے افسری اور ماتحتی والی بات نہیں تھی۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔

ان کے فلک شگاف قہقہے دوستی کی گہرائی کا پتا دیتے۔ ان کی باتوں سے خلوص کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ کہ جب بھی وہ اپنی بیگم کو ہمارے ہاں لے کر آتے تو میں عجیب احساس کمتری کا شکار ہو جاتی۔ مجھے یوں لگتا کہ وہ ارفع ہوں میں ادنیٰ' وہ عرش ہوں' میں فرش۔

میں خود...... اپنے آپ کو ان کے سامنے حقیر سی سمجھتی جیسے وہ کسی عالیشان عمارت کا مینار ہوں اور میں اس کی دہلیز۔ وہ میری افسر میں ان کی ماتحت ان کے سامنے نظریں بچھانے والی' ہاتھ باندھنے والی...... جی حضور کرنے والی ایک ادنیٰ سی ملازمہ......

تب۔ میرا دل لہولہو ہو جاتا...... احساس کمتری کا گھاؤ پوری طرح دُکھ دینے لگتا۔

بچوں کا شور' گھر کی بدسلیقگی مجھے پشیمان کر دیتی۔

جس دن وہ ہمارے ہاں آتیں مجھے بچے زیادہ بدتمیز نظر آنے لگتے۔ گھر اوندھا سا لگتا...... کشادہ سے فلیٹ میں میرا دم گھٹنے لگتا۔ سامانِ آرائش کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا۔

بعض دفعہ...... میرا دل چاہتا کہ ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دوں کہ کیوں' تم مجھے اذیت دینے آ جاتی ہو......؟

تم ایک بڑے افسر کی بیگم ہو۔ پاشڈ علاقے میں رہتی ہو۔ کیوں ایک چھوٹے سے گھر میں آ کر ذہنی پریشانیاں لاتی ہو۔ جس سے میں ذہنی طور پر لہولہان ہو جاتی ہوں۔ مگر یہ سب باتیں میں صرف سوچ کر ہی رہ جاتی تھی۔ کچھ کہنے کی ذرا بھی ہمت نہیں تھی۔ ان کے وبائی لطیفوں پر مجھے زبردستی مسکرانا پڑتا تھا یہ مسکراہٹ کیسی ہوتی تھی...... میرا دل ہی جانتا تھا کہ جیسا میں' خود کو جوتا مار کر ہنسی ہوں۔

ان کے قل قل کرتے قہقہے میرے لیے پتھراؤ سے کم اذیت ناک نہیں تھے۔

تب میرا دل چاہتا کہ ان کا منہ نوچ لوں کہ کیوں اتنا ہنستی ہو۔ یہ ہنسی یہ قہقہے سب تمہاری جاگیر ہیں کیا......؟ حالانکہ میں طبیعت کی اتنی بُری نہیں تھی۔ جتنا ان کو دیکھ کر...... ہو جاتی تھی۔

مگر میری یہ ساری کش مکش ذہنی طور پر ہوتی تھی۔ ان کو دیکھ کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگتیں۔ تب مجھے اپنا وجود سنبھالنا دوبھر ہو جاتا۔ متوازن چال بھی بے ڈھنگی ہو جاتی۔

تب وہ ہنس کر کہتیں۔ ''اللہ بھابی...... آپ کیسے چلتی ہیں؟''

''کیسے چلتی ہوں......؟'' میں بولا کر پوچھتی۔

''پیر گھسیٹ کر بالکل کلاسیکل انداز میں۔'' وہ قہقہہ لگاتیں۔

''اے ہے۔ اتنے بھاری وجود میں پیر گھسیٹ کر ہی چل لیں تو غنیمت ہے۔'' ساس بھی گرہ لگاتیں۔

تب میں دھم سے تخت پر بیٹھ جاتی اور گھنٹوں مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا تھا۔

وہ دنیا بھر کی باتیں کرتی رہتیں اور میں ایک روبوٹ کی طرح ان کی ہر بات کی جواب میں۔ ہاں جی۔ بالکل ٹھیک ہے۔ قسم کے جواب دیتی رہتی۔ ان کی اس عادت سے تو میں بُری طرح بیزار تھی کہ میں جہاں جاتی وہ میرے پیچھے پیچھے پھرتیں۔

میں باورچی خانے میں جاتی وہ میرے پیچھے۔

کمرے میں آتی تو میرے پیچھے۔

اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی کہ میں چھوٹے کو نہلانے غسل خانے گئی۔ تو آپ وہاں بھی پہنچ گئیں۔

''ارے...... آپ کمرے میں امّاں کے پاس جا کر بیٹھیے۔ میں ابھی آئی۔''

''آپ کا غسل خانہ بہت چھوٹا ہے۔'' وہ اپنی بنی ہوئی بھنوئیں اُچکا کر نخوت سے بولیں۔

''سارا گھر ہی چھوٹا ہے۔'' میں بے دلی سے ہنسی۔

تب وہ' پھر پھوٹ پھوٹ کر ہنسنے لگیں اور ان کی ہنسی نیزے کی انی بن کر میرے دل میں کھبتی رہی۔

مجھے ہمیشہ ایسے مہمان اچھے لگے کہ جس کرسی پر آ کر بیٹھیں تو وہیں سے وہ اپنے گھر سدھاریں...... مگر وہ...... تو سارے گھر کی خبر لاتی تھیں اور میری جان سولی پر لٹکا کر خوش ہوتیں۔

اور اس پر ہی بس نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے شیریں لہجے میں مجھے ایسے مشورے دیتیں کہ مجھے یوں لگتا کہ وہ میرے کانوں میں سیسہ انڈیل رہی ہوں۔ ''اُف آپ کے کمرے کی سیٹنگ کس قدر بے ڈھنگی ہے۔ آپ اپنی الماری اور ڈریسنگ ٹیبل باہر نکالیے اور ایک بیڈ اور خرید کر بچھائیے۔

بچوں کو ماں سے علیحدہ ہونا چاہیے۔ سنیے...... یہ مرچ مسالے۔ ٹین کے ڈبوں کے بجائے جام کی خالی شیشیوں میں رکھا کریں۔"

جام کی شیشیاں تم لا دیا کرو، میں دل ہی دل میں کلستی۔

"اے ہے...... آپ میلے کپڑے گٹھڑی میں باندھ کر رکھتی ہیں۔ اللہ کس قدر بُرا لگتا ہے۔ آپ یوں کیجئے۔ ایک خوبصورت سی ٹوکری خریدیے۔ اس میں تمام میلے کپڑے رکھا کریں۔ چھوٹے بچے کو دن میں ہمیشہ "پیک" کیا کیجئے...... اس سے آپ کو سہولت رہے گی...... بار بار بچے کو پیشاب کرانے سے بچ جائیں گی۔"

میں کیا کرتی ہوں......؟ اور مجھے کیا کرنا چاہیے یہ سب مجھے اچھی طرح معلوم تھا...... میں اپنی جیب کو دیکھ کر اپنا گھر چلا رہی تھی...... مگر ان کے روز روز کے سبق سے میں عاجز تھی۔

"اللہ بھابی......! آپ کو تو بچے پالنے ہی نہیں آتے۔" یہ وہ جملہ تھا۔ جو وہ ہر دفعہ میرے ذہن پر داغ جایا کرتی تھیں۔

"آپ کے بچے کس قدر چڑچڑے سے ہیں۔ ہر وقت روتے رہتے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بچہ ہے ابھی سو کر اُٹھا ہے۔ بھوک لگ رہی ہے۔ اسی لیے رو رہا ہے۔"

"ہاں بھئی...... آج کل کی مائیں بڑی ظالم ہیں۔ جب تک بچہ روئے نہیں اس کو دودھ نہیں دیتیں۔" ہماری ساس بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔

تب میرا دل ان کے ہر دم چہکنے والے بچوں کو دیکھنے کو چاہتا۔ مگر یہ بھی عجیب بات تھی کہ جب بھی وہ ہمارے ہاں آتیں۔ خود ہی چھیلا بن کر آتیں۔ کبھی اپنے بچوں کو ہمارے ہاں نہیں لائی تھیں۔

میں کبھی پوچھتی...... تو وہ کہتیں۔

"ماسٹر صاحب بچوں کو پڑھا رہے تھے۔"

"مووی دیکھ رہے تھے۔"

یا "سو رہے تھے۔"

جب کہ میرا خیال تھا کہ افسروں کے بچے ماتحتوں کے ہاں جاتے اچھے نہیں لگتے ہوں گے۔ ویسے بھی ہمارا گھر چھوٹا تھا۔ وہ بڑے گھر میں کھیلنے کودنے کے عادی۔ شاید وہ اسی وجہ سے بچوں کو ہمارے گھر نہیں لاتی تھیں۔

ایک ہمارے بچے تھے کہ کسی کے گھر بھی چلے جائیں۔ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ وہ

بے انتہا خوش ہوتے اور بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے۔

احمد صاحب...... اپنی بیگم کے ساتھ...... ہفتے میں دو دفعہ ہمارے ہاں آ ہی جاتے تھے اور کبھی غیاث مجھے ان کے ہاں جانے کو کہتے تو میں سُلگ ہی جاتی۔

"دیکھیے...... آپ مجھ سے مت کہا کریں، ان کے ہاں جانے کو۔"

"کیوں بھئی......؟ وہ لوگ بھی تو ہمارے ہاں آتے ہیں۔"

"جب ہی...... تو یہ کہہ رہی ہوں۔"

"کیا مطلب......؟" وہ استفہامیہ لہجے میں پوچھتے۔

"میں ان کی بیگم کی شکل دیکھ دیکھ کر بیزار ہو چکی ہوں۔"

"اتنی بُری تو نہیں ہیں بلکہ خاصی خوش شکل خاتون ہیں۔"

"اچھا...... یہ بات ہے۔ آپ بھی مرنے لگے ان پر، اپنی ماں بہنوں کی طرح۔ اگر کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہیں...... تو پوچھوں ان سے کہ کوئی ان کی بہن بن بیاہی ہے یا نہیں۔ یا مطلقہ، بیوہ بہن سے بھی کام چل جائے گا۔ شرع میں تو دل والوں کے لیے خاصی آسانیاں ہیں۔"

میں جاہلانہ انداز میں ان سے لڑتی۔

"کیا مصیبت ہے کہ جب بھی ان کے ہاں جانے کو کہو۔ تم لڑائی کے نئے نئے پہلو تلاش کر لیا کرتی ہو۔"

"غیاث پلیز...... سوچو جب میں ان کے ہاں جاتی نہیں تب وہ اتنی ہمارے گھر آتی ہیں۔ اگر کہیں میں بھی جانے لگی تو وہ میرا تو جینا دوبھر کر دیں گی۔"

"وہ کیسے۔؟"

"بھئی روز آنے لگیں گی۔"

"آنے دو۔ مہمانوں کے آنے سے گھر میں رونق ہوتی ہے۔ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے ہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔"

"نہیں جان! مجھے ایسے مہمان بالکل اچھے نہیں لگتے جن کے سامنے میں سہمی سی رہوں۔"

"پھر کیسے اچھے لگتے ہیں؟"

"جن کے ساتھ میں بھی فلک شگاف قہقہے لگا سکوں۔ کمتری کا احساس مجھے نشتر نہ چبھوئے۔"

"کمتری کیسی......؟ احمد میرا دوست ہے۔ بہت ہی پرانا۔ ہماری دوستی میں بھائیوں جیسا التفات تھا۔ اور ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ہم نے میٹرک سے لے کر یونیورسٹی تک

ساتھ پڑھا ہے۔ ہوسٹل کے ایک کمرے میں برسوں ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے سُکھ دُکھ میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ اب یہ اس کی قسمت کہ وہ ایک فارن اسکالرشپ پر باہر سے مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کر آیا۔ اور یہاں ہمارا آفسر آ کر لگا۔ مگر ہم دونوں کی دوستی میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا ہے۔"

"بھئی احمد صاحب۔ دوست ہوں گے تو آپ کے مگر میں' ان کی بیگم صاحبہ کو کسی بھی لحاظ سے اپنی دوست نہیں سمجھتی۔"

"پھر کیا سمجھتی ہو؟"

"اپنی باس......!"

"پاگل ہو تم......" وہ ہنسے۔

☆☆☆

میں احمد صاحب کے ہاں جانا...... خاصا ٹالتی رہی۔ جن کو برداشت کرنا مشکل' ان کے ہاں جانا بھلا آسان کام تھا۔ مگر ایک شام غیاث کو ضروری کام کے سلسلے میں احمد صاحب کے پاس جانا پڑا۔ وہ مجھے زبردستی ساتھ لے گئے۔ وسیع و عریض کوٹھی۔

بڑا سا کار کپاؤنڈ۔ مجھ پر تو ان کا گھر دیکھتے ہی دہشت سی چھا گئی۔ یوں لگا جیسے کلیجہ کسی نے مسل ڈالا ہو۔ ہمارا چھوٹا سا فلیٹ ان کے گھر کے سامنے کس قدر بے مایہ لگتا تھا۔ واقعی بعض چھوٹے چھوٹے مکانات جس طرح اپنے مکینوں کی زبوں حالی پر باہر سے ہی روتے' سسکتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی امراء کی...... کوٹھیاں اپنے آقاؤں کے جاہ جلال کی تفسیر اندر آنے سے پہلے ہی بیان کرنے لگتی ہیں۔ مکینوں کا رعب ان کے مکانوں کی تزئین سے ہی ہونے لگتا ہے۔

کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کا شجرہ ان کے مکان ہی بتا دیتے ہیں۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی یہی صورت حال ہمارے ساتھ تھی۔ احمد صاحب کی شان و شوکت کا اندازہ۔ مکان کی طرزِ تعمیر سے ہو رہا تھا۔

باہر کال بیل بجانے سے پیشتر ہی میری ٹانگیں لرزنے لگیں۔ اور جب اندر گئی تو میری آنکھیں پھٹی کو پھٹی رہ گئیں۔ ہمارے بجائے اب ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

میں تو سوچ بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کا گھر اندر سے اتنا غلیظ ہوگا۔ سارا گھر اوندھا پڑا تھا۔

چھوٹے دو بچے تو بغیر نیکر کے فری اسٹائل گھوم رہے تھے اور وہ میلے کپڑوں میں ہشاش بشاش سی گھوم رہی تھیں۔ جیسے گندگی کا سانحہ ان کے لیے اتنا بڑا المیہ نہ ہو۔ سارے گھر میں میلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بستر کی چادریں نیچے لوٹ لگا رہی تھیں۔ اور تکیے کے غلاف اس قدر چیکٹ

تھے کہ توبہ الٰہی...... یہ اس پر سر رکھنے والوں کا حوصلہ اور ظرف ہی تھا۔ ورنہ وہ تو اس قابل تھے کہ ان پر سر رکھنا تو کیا سرِ قلم کرنے کو بھی دل نہ چاہے۔

قیمتی ڈیکوریشن کی اشیاء خاک دھول سے اَٹی پڑی تھیں۔ اخبار بگولوں کی طرح گھر میں اُڑ رہے تھے۔ بیڈروم کے قیمتی پردے بچوں نے ریلنگ سے کھینچ کر اگر نیچے لٹکا دیے تھے تو کوئی ان کو درست کرنے والا نہیں تھا۔ وہ بدستور نیچے جھول رہے تھے۔

موزیک کا فرش کا بھی زرد ہو رہا تھا اور اس کی کا ہی صاف کرنیوالا کوئی نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ ان کے بیڈروم کے قیمتی قالین سے بچوں کے پیشاب کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ مگر وہ اس پر پاؤں پسارے پاندان لیے بیٹھی تھیں۔

"بھابی...... پان کھائیں گی؟" انہوں نے کتھے کی چمچی چونے کی کلیاں میں رکھتے ہوئے پوچھا...... میں نے ایک نظر ان کے پاندان پر ڈالی۔ اس سے دس گنا صاف ستھرا میرے گھر کا اُگالدان تھا۔

"نہیں بھابی...... اس وقت طلب نہیں ہو رہی۔" حالانکہ بنا پان کھائے۔ مجھے جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں۔

ان کی بڑی بچی نے کچھ کہا تو وہ اس کو نغمہ بار لہجے میں جواب دینے کے بجائے کرخت انداز میں غرائیں۔

"چل ہٹ۔! کمینی کہیں کی ایسا ماروں گی ذلیل کو اگر دوبارہ نام بھی لیا۔"

"امی پلیز......!" وہ گھگھیائی۔

"چل مر اپنے کمرے میں جا کر...... نواب زادی کہیں کی۔ بھاگتی ہے یا نہیں...... کم بخت...... کتیا کہیں کی۔"

اور میں ان کا اندازِ گفتگو دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ وہ میرے گھر آ کر کتنے شیریں لہجے میں بچوں سے بولا کرتی تھیں۔

"ارے گڑیا رانی...... آپ...... تم سے بات کرتی ہیں۔ کتنی بُری بات ہے سوئیٹی۔"

"اچھا جان...... آج آپ آنٹی سے وعدہ کریں کہ چھوٹے بھائی کو بھی ادب سے مخاطب کریں گی۔"

بچے تو بچے...... وہ مجھے بھی بات چیت کی باریکیاں سکھایا کرتی تھیں۔

"اللہ بھابی پلیز...... آپ بُرا نہ مانیے گا۔ آپ اِتنی زور سے ہنسا نہ کریں۔"

"مگر کیوں بھئی...... یہ ہنسنے پر کرفیو کیوں لگا رہی ہیں آپ؟"

"پلیز بھابی...... جب آپ ہنستی ہیں تو حلق کا کوا تک نظر آ جاتا ہے۔ اور پھر آپ کا "چوکا" بھی اونچا ہے منہ کھول کر ہنسنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"اے ہے......تو کیا میں منہ بند کر کے ہنسا کروں۔" میں کھسیا جاتی۔

"نہیں......آپ صرف مسکرانے پر اکتفا کیا کیجئے۔"

تب مجھ سے مسکرانا تو کجا...... رویا بھی نہ جاتا۔ حالانکہ سبکی اور شرمندگی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر مجھے تہس نہس کیے دیتا اور میں اس کے طوفانی تھپیڑوں سے بے دم ہو جاتی۔ اور اب وہ خود آدابِ گفتگو بھلائے بیٹھی تھیں۔

کہاں مسکرانا چاہیے اور کہاں قہقہہ لگانا چاہیے۔ اپنے سارے ہی اسباق وہ بھول چکی تھیں۔

مگر اس تمام پھوہڑپنے کے باوجود...... ان کے بال حسبِ دستور بے حد خوبصورت لگ رہے تھے جیسے ہمیشہ روٹین کے مطابق لگا کرتے تھے۔ فرمانبردار سے شائستہ بال، مجال ہے کہ ایک بال بھی ادھر سے اُدھر ہو۔ صاف ستھرے دھڑاکے کے ساتھ خوبصورتی سے پوری پشت کو ڈھکے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان پر استری کی گئی ہو۔ اتنی چمک تو سلمیٰ بھابی کے بالوں میں بھی نہ تھی۔ جن پر ہم بچپن میں مرا کرتے تھے، ان کی بل کھاتی...... ٹھمکتی سی چٹیا...... کولہوں کے ردھم کے ساتھ ہلا کرتی تھی۔ کم بخت اس قدر تو پھوہڑ نکلی...... مگر اپنے بالوں پر خاصی محنت کرتی ہے۔ میں دل ہی دل میں جلی۔

خدا کرے...... جوئیں پڑ جائیں اس کے بالوں میں۔ خارش ہو جائے۔ سارا دن سر میں کھجا کھجا کر بے حال ہو جائے۔ افلاطون کہیں کی۔!

"آج ملازمہ نہیں آئی۔" انہوں نے ہنس کر اپنی کوفت کم کرنے کی کوشش کی۔

"جی۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" ہم چندرا کر بولے۔

"نوکر کا آرام بھی جان کو عذاب میں ڈال دیتا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں؟

"ارے بھئی...... جب تک وہ کام کرے ہمیں آرام ہے اور جس دن وہ نہ آئے۔ تو ہم اس کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ خود سے کام ہو ہی نہیں سکتا۔"

"نوکر سے کام لینا بھی ہر ایک کو نہیں آتا۔" گو ہم نے ہنس کر کہا۔ مگر ان کے خاصے کس کر لگا۔ ہونٹ چبا کر رہ گئیں۔

تب ہم اپنے دل میں ڈھیروں اطمینان کی ٹھنڈک لیے اپنے گھر آ گئے۔

کچھ دن وہ نہیں آئیں تو پھر جانے کو دل چاہا۔ اب کے ہم ضد کر کے گئے۔ جانے کیوں ان کا پھوہڑپنا دیکھ کر ہمیں ایسا طمانیت کا احساس ہوا تھا کہ کیا بتائیں۔ اتنی خوشی تو کلر ڈی وی خرید کر بھی نہیں ہوئی تھی۔ جو کمیٹی ڈال کر ہم نے بے حد مشکلوں سے خریدا تھا اور ہمارے چھوٹے سے گھر کی آسائش اور زیبائش دونوں کا کام دے رہا تھا۔

دوبارہ ہم...... گئے تو ان کے گھر کی حالت پہلے سے بدتر تھی...... وہ باورچی خانے میں تھیں۔ ہم بھی وہیں پہنچ گئے۔ مرچ مسالے، بازار سے جن تھیلیوں اور پیکٹوں میں آئے تھے۔ ان میں ہی رکھے تھے۔ آٹے کا تھیلا زمین پر رکھا تھا۔ آٹے کا خالی کنستر چولہے کے پاس دھرا تھا۔ فرش دُھلنے سے نیچے کا آٹا فرش پر جم گیا تھا۔ ڈھیروں مکھیاں باورچی خانے میں بھنک رہی تھیں۔ اور بے شمار لال بیگ آزادانہ گھوم رہے تھے۔ دیگچے اور بھگونے اندر کیبنٹ میں رکھنے کے بجائے، باورچی خانے کی کھڑکی پر دھرے تھے۔ بغیر دھلے ہوئے اور دُھلے ہوئے برتن سب یکجا تھا۔ خوبصورت اوون بدسلیقگی کی وجہ سے بدشکل ہو گیا تھا۔ اس کی "روڈز" کی سلاخ نیچے پڑی تھی۔ چائے اُبل اُبل کر اس پر جم گئی تھی۔

"بھابی......! آپ مرچ مسالوں کو کم از کم ٹین کے ڈبوں میں ہی رکھ لیں۔" ہم نے لہجے میں بلا کی شیرینی گھولتے ہوئے کہا۔

انہوں نے ایک نظر ہمیں دیکھا اور ایک پیاری سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔ آج میری طبیعت بہت خراب ہے۔"

"جی مجھے لگ رہا ہے۔" میں نے ان کو مزید کھسیاہٹ سے بچایا۔

آج بھی ان کے بال پشت پر پھیلے ہوئے بے انتہا خوبصورت لگ رہے تھے اور میری سوکھی مریل سی چٹیا ان کے بالوں کے آگے ایک ادنیٰ سی ملازمہ لگ رہی تھی۔ واہ خوبصورت بالوں کا بھی کیا رعب اور دہشت ہوتی ہے۔ پوری شخصیت کو بانکپن عطا کر دیتے ہیں۔ لاکھ ہمارے نقوش خاصے تیکھے تھے۔ مگر بالوں نے ساری لٹیا ہی ڈبو دی تھی...... سوکھے بدرونق چھدرے بال ساری پرسنالٹی کو گھن کی طرح چاٹ گئے تھے۔

ایک یہ مسز احمد تھیں...... پھوہڑ، بدسلیقہ...... مگر ان کے خوبصورت بال...... چند لمحوں کے لیے ان کی تمام کوتاہیوں پر پانی پھیر دیتے تھے۔ واقعی احمد صاحب ان گھٹاؤں میں گھر کر ان کی ساری زیادتیاں بھول جاتے ہوں گے۔ جب ہی تو ان کا پھوہڑپنا بھی بڑے الھڑپنے سے چل رہا تھا۔

☆☆☆

تیسری دفعہ ہم لوگوں کو احمد صاحب کے ہاں۔ ایمرجنسی میں جانا پڑا۔ ہم سب لوگ کسی

تقریب سے آ رہے تھے۔ اتفاقاً احمد صاحب کے گھر کے قریب ٹیکسی خراب ہوگئی۔ رات کے وقت سواری کا ملنا خاصا دشوار ہوگیا۔ غیاث بولے' چلو احمد صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔ وہ اپنی گاڑی میں ہمیں گھر تک ڈراپ کر دیں گے۔ سو ہم سب پیدل مارچ کرتے ہوئے ان کے گھر تک پہنچے۔

اس وقت احمد صاحب اپنی کار کی صفائی کر رہے تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہم ان کو سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اور اندر جا کر بھونچکے سے رہ گئے۔ اس دفعہ کی صورتحال پچھلی دو سے زیادہ متاثر کن تھی۔ 'مسز احمد' سر جھاڑ بہت ہی عجیب سی لگ رہی تھیں۔ ان کے خوبصورت براؤن بالوں کی وِگ باورچی خانے کی کیل پر ٹنگی تھی۔ جو وہ بیل سنتے ہی لپک کر اوڑھ لیا کرتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے خشک بال' ہماری چوٹی کے سامنے انتہائی بے حیا سے لگ رہے تھے۔ ان کے سر کے وسط میں تو اچھا خاصا گنج تھا۔ موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ ان کی براؤن آنکھوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ چہرے پر نہ تو تروتازگی تھی اور نہ ہی شگفتگی...... کس قدر بدشکل لگ رہی تھیں۔ ہمارے سینے کی ہر معطر سانس' ہمیں حقیقت کی نوید دے رہی تھی۔

ہماری ساس' حیرت سے منہ پھاڑے۔ ان کو دیکھ رہی تھیں۔ "دلہن...... احمد کی بیوی کہاں ہیں؟" انہوں نے بولا کر ہم سے پوچھا۔

"ارے یہی تو ہیں...... آپ کے سامنے کھڑی ہیں۔" ہم ہنسے۔

"نہیں بھئی......!" وہ بے یقینی سے بولیں۔ "یہ قطعاً وہ نہیں ہیں۔"

"آیئے خالہ جان بیٹھئے نا......" وہ ہونقوں کی طرح بولیں وگ کا راز فاش ہونے پر وہ خاصی سراسیمہ سی نظر آ رہی تھیں۔ گھر حسبِ معمول بُری طرح بھنک رہا تھا رات کے کھانے کے جھوٹے برتن میز پر بکھرے پڑے تھے۔ چھوٹا بچہ ٹی وی لاؤنج میں ننگا سو رہا تھا۔ اس کی دودھ کی بوتل یونہی فرش پر لڑھک رہی تھی۔ بڑی لڑکی نے کسی بات پر ضد کی اور ان کے منہ سے گالیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا فوارہ کھل گیا۔

"کمینی...... بات ہی نہیں سمجھتی۔" وہ جوتی لے کر اس کے پیچھے لپکیں۔

اور ہماری ساس نے تو مارے حیرت کے' اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے۔

"اے دلہن...... دیکھ رہی ہو۔ تم یہ سب۔"

"ہاں...... میں تو کئی دفعہ دیکھ چکی ہوں...... اب آپ دیکھیے۔"

"اے ہے...... بچے ایسے پالے جاتے ہیں۔"

"اماں جان...... ساری عورتیں ہماری طرح تھوڑی خدمت گزار ہوتی ہیں کہ گھر میں بھی

اپنی جان سکھا دیں...... بچوں کے لیے بھی سارے عذاب خود سہیں۔ اور منہ سے اُف نہ کریں۔"

"ہاں بھئی...... کہہ تو تم صحیح رہی ہو......" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

"اللہ بھابی! آپ ان کے آگے کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔" ہماری نند بڑی چاہت سے ہمیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ارے ہٹو...... ہم میں...... کہاں سے حسن...... اُمڈ آیا۔"

"عورت کا سلیقہ ہی اس کا حسن ہوتا ہے بھابی!"

"باتیں تو یہ احمد کی دلہن بڑے قابلوں کی طرح کرتی تھیں۔" ہماری ساس کو ان کے گھر کی حالت دیکھ کر اچھا خاصا غصہ آنے لگا تھا۔ "کتنا پیارا گھر ہے۔ دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ مگر ساری چیزیں پھوہڑ پنے سے کس بُری طرح برباد ہو رہی ہیں۔"

بچی کو مار کر وہ باورچی خانے میں چائے بنانے لپکیں۔ تو گیلے باورچی خانے میں ان کا پاؤں بُری طرح پھسلا۔ ان کی چیخ سی نکل گئی۔ میں بھاگ کر ان کے پاس گئی۔ پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔

"اے ہے پاؤں کیسے پھسلا......؟" ہماری ساس نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ بچے کم بخت...... گلاس کا بچا ہوا پانی ہر طرف پھینک دیتے ہیں۔" انہوں نے دو چار گالیاں بچوں کو سنا کر کہا۔

"اے ہے...... تم ان کو منع کیا کرو اور بلکہ ان سے بھی چھوٹے موٹے کام لیا کرو...... اچھا ہوا کہ پیر بچ گیا۔ خدانخواستہ کچھ ہو جاتا...... تو یہ گھر اور یہ بچے کون سنبھالتا۔"

"ارے بھاڑ میں جائے یہ گھر...... چولہے میں جلیں یہ بچے۔" وہ جل کر بولیں۔ انداز بھی بڑا جاہلانہ تھا۔ کہیں سے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ یونیورسٹی لیول تک اپنا وقت گنوا چکی ہیں۔

ہماری نند' ان کی "وِگ" اپنے سر پر اوڑھ کر دیکھنے لگیں تو وہ اور کھسیا گئیں...... "ارے بی بی اس کو تو رکھ دو یہ میں نے بڑے شوق سے لندن سے خریدی تھی۔"

نند کا کیل تک ہاتھ گیا نہیں...... تو وہ اس کو پیاز کی...... ٹوکری پر رکھ کر چلی آئیں۔ ان کے اس طرح ٹوکنے پر وہ خاصا برا مان رہی تھیں۔

"بھابی...... آپ کی طبیعت خاصی خراب لگ رہی ہیں۔" ہم نے طنز سے کام لیتے ہوئے بڑے دُلار سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں بہت خراب ہے بلڈ پریشر تو بہت ہی "لو" جا رہا ہے۔ صبح سے اُٹھا تھوڑی جا رہا تھا۔ بس ڈائجسٹ لیے لیٹی تھی کہ چلو اس کو ہی ختم کر لوں۔ بھئی یہ سلسلے وار ناول تو اپنی جان

کرداروں کی دھڑلے بازیوں میں اُٹکائے رکھتے ہیں۔ یہ لکھنے والیاں بھی غضب کا تماشا دکھاتی ہیں۔ کرداروں کو نچانا خوب جانتی ہیں۔ پڑھنے والوں کو جب دل چاہے رُلا دیا۔ اور جب دل چاہے ہنسا دیا۔"

"بڑا گہرا مطالعہ ہے آپ کا۔"

"بھئی پڑھنا تو میری ہابی ہے۔ بے شک گھر کے کاموں کو نظر اُٹھا کر نہ دیکھوں۔ مگر پڑھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جب دل زیادہ اُداس ہوتا ہے تو اپنے کنوار پنے کے زمانے کی سہیلیوں کے خط نکال کر پڑھتی ہوں...... سینکڑوں خط ہیں میرے پاس۔ مت پوچھو کہ کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ ماضی میں پہنچ گئی ہوں۔ تب گھنٹوں بیٹھی سوچتی رہتی ہوں۔ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ آج تو سوچ سوچ کر میری طبیعت خود ہی خراب ہو گئی۔"

"ملازمہ بھی تنگ کر رہی ہو گی۔" ہم نے مزید دلاسہ دیا۔

"جی ہاں۔ بالکل۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولیں۔

"مگر آپ کو کیسے پتا چلا۔؟" وہ بناہی اپنی چھجے دار موٹی بھنویں گھما کر چلتر پنے سے بولیں۔

"بس ایسے ہی...... میرا خیال تھا۔" میں شانے اُچکا کر افسرانہ شان سے بولی۔

"اچھا......!" ان کی مری ہوئی آواز نکلی۔

تب اس لمحے۔ میں اپنے آپ کو......" بے حد سبک اور ذہنی طور پر بے حد ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ میں آکاش کی وسعتوں میں بادلوں کے سنگ پرواز کر رہی ہوں۔ اوپر بہت...... مسز احمد تو مجھے بے حد نیچے نظر آ رہی تھیں۔ کسی غیر اہم نکتے کی طرح' غیر واضح۔ اور میں ان کی ماتحت تو کبھی بھی نہ رہی تھی۔ یہ آواز میرے اندر سے لہک لہک کر آ رہی تھی۔

جسے سُن کر میں خود ہی جھوم رہی تھی۔

❀❀❀
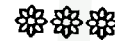
آرزو نکھر آئی

رمضان کے آخری عشرے میں بازاروں کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق عید کی تیاری کی جائے...... بازاروں کا بھی رش مجھے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ پُر ہجوم بازاروں میں گھومنا مجھے ہمیشہ پسند رہا ہے...... مگر آج کل یہ میرا مشغلۂ خاص ہے۔ پیر کے دن تعطیل کی وجہ سے میں دوپہر سے ہی بوہری بازار نکل گئی تھی۔ زیب النساء اسٹریٹ پر خریداری کرتی ہوئی خواتین کو دیکھتی ہوئی میری سُرخ اسپورٹس کار طارق روڈ کی طرف دوڑنے لگی...... تھکن اور گرمی کی شدت سے میرا بُرا حال تھا...... مگر رابی سنٹر میں جاتی ہوئی ایک عورت مجھے سطوت سے مشابہ لگی۔ میں نے اپنی گاڑی جلدی سے پارک کی۔ اور جلدی سے رابی سینٹر میں داخل ہو گئی۔ سبز سلیولیس شرٹ میں ملبوس اس سنہرے بالوں والی عورت کو ڈھونڈنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ بلیک سوٹ اپنے سینے سے لگا کر قد آدم آئینے میں مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ قطعی مختلف تھی۔ سیدھے سادے پھیلے پھیلے سے ہونٹ ذرا بھی دلفریب نہیں لگ رہے تھے۔ پھر بھی اپنا شک دور کرنے کے لیے میں نے اُسے سامنے سے آ کر دیکھا...... نہیں...... وہ سطوت ہرگز نہیں تھی۔ جسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں نڈھال ہو چکی تھی! لبرٹی کے سامنے کی دکانوں میں' میں نے چہل قدمی کے انداز میں ایک جائزہ لیا اور اپنی سرخ اسپورٹس حیدری مارکیٹ کی طرف رواں کر لی۔ کراچی کی مارکیٹوں میں حیدری مارکیٹ نے جس تیزی سے ترقی کی ہے۔ وہ خاصی حیران کن ہے۔ یہاں اس قدر رش تھا' میں نے نیچے کا ایک ہی چکر لگایا تھا کہ میرے پیر شدید تھکن سے جواب دینے لگے۔ اوپر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے میں گھر چلی آئی! ویسے بھی مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔

"ایک چھٹی کا دن ہوتا ہے' وہ بھی کم بخت اوائی توائی میں ختم کر دیتی ہے۔" لتاں بُری طرح بڑبڑا رہی تھیں۔ "کھانا لاؤں؟"

"ہاں اماں۔ جلدی سے لے آیئے۔ قسم سے بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"گھر میں ہوتی تو وقت پر کھاتی۔ سب نے ایک ساتھ روزہ کھولا۔ اتنا اچھا لگا۔"

"مگر میرا کہاں روزہ تھا!"

"نہ سہی۔ مگر سب کے ساتھ کھاتی تو۔ رمضان میں ایک کھانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"ہاں اماں۔ آپ کہہ تو صحیح رہی ہیں؟"

"ارے...... ہم نے ہمیشہ ہی تجھے درست رائے دی ہے مگر تو مانے جب ناں......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے غور سے دیکھنے لگیں۔

"اتنی ساری باتیں آپ کی مانتی ہوں۔ پھر بھی آپ کو مجھ سے گلہ ہی رہتا ہے۔ یہ چقندر گوشت میں کبھی چکھ کر نہیں دیتی تھی...... دیکھئے کیسے خوشی خوشی میں کھایا ہے۔"

"اری چندا۔ اپنے چہرے کی طرف دیکھ۔ پہلے سے کتنا بہتر ہوگیا ہے۔ جلے ہوئے داغ ...... معلوم بھی نہیں ہوتے۔"

"اماں۔ پہلے جیسی بات تو نہیں رہی۔" اس ذکر نے ہی میرے لہجے میں تلخی گھول دی۔

"اس جیسی بات تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں تو جلنے کی بات کر رہی ہوں۔"

"آنکھوں کے نیچے تو خاصے نشان ہیں۔" میں نے چشمہ اُتار کر انھیں دکھایا۔

"مگر چشمہ پہن کر تو نظر نہیں آتے۔" انھوں نے امید بھری آواز میں کہا۔

"آپ کو کیا پتہ، مجھے تو ہر لمحے نظر آتے ہیں۔ سوتے، جاگتے چلتے پھرتے، یہی داغ میری آنکھوں میں رہتے ہیں۔"

"پاگل ہوگئی ہے تُو۔ بھول جا اس سانحے کو۔ یہ غم اور تکلیفیں نہ ہوں۔ تو خوشیوں کا مزہ کیوں منفرد لگے۔"

"اماں، میری تو ساری خوشیاں۔ ان داغوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔" میرا دل پھر غم سے پھٹنے لگا۔

اماں نے میرا سر اپنے زانو پر رکھا تو آنسو خود ہی بھل بھل بہنے لگے۔

"اری تُو رو رہی ہے۔" اماں کی انگلیاں بالوں میں پھرتی ہوئی نیچے آئیں تو بے آواز آنسوؤں میں بھیگ گئیں۔

"نہیں اماں۔ خواہ مخواہ ہی نکل آئے۔" میں پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"اری سب قسمت کی بات ہوتی ہے۔ اگر قسمت اچھی ہوتی تو بے چارہ مظفر ہی کیوں

مرتا۔" ان کا لہجہ بھی سوگوار سا ہوگیا۔

"پلیز اماں کوئی دوسری بات کیجئے۔"

"ہمارا تو خیال تھا کہ شاید تمہارے دیور نواب منظور کچھ پیش قدمی کریں۔ مگر وہ تو ایسے شہر بدر ہوئے کہ کبھی شکل ہی نہیں دکھائی۔ بھائی کا پیسہ خوب امرت بن کر لگا۔ حد ہوگئی کمین پنے کی۔"

"اماں جان کیوں بے کار کی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ سے اتنی بار کہا کہ ان لوگوں کا، کسی قسم کا ذکر میں بالکل نہیں سننا چاہتی...... مگر آپ ہیں کہ......؟" میں پہلو بدل کر بے چین ہوگئی۔

"اچھا۔ نہیں کرتی ذکر مگر تو ان آنسوؤں کو تو روک۔ جو یوں چپ چاپ بہے جا رہے ہیں۔ جیسے بے مول موتی ہوں۔"

'ہر موتی تھوڑی سُچا ہوتا ہے'۔ یہ میں سوچ کر ہی رہ گئی۔

"انور کی اماں کئی دفعہ آ چکی ہیں۔ انور بھی آیا تھا۔ اب تو ماشاء اللہ اس کی بھی ترقی ہوگئی ہے...... دفتر کی طرف سے اچھا خاصا کوارٹر بھی مل گیا ہے۔ جب بھی آتا ہے، تمہیں پوچھتا ہے اور انور کی اماں تو اس رشتے کے لیے خاصی خوشامدیں کر رہی ہیں اور تو ہے کہ منہ سے کچھ پھوٹ کر نہیں دیتی، اب بتا کہ کیا جواب دوں ان لوگوں کو، کب تک آلے ٹالے میں رکھوں گی۔ اور پھر انور بُرا لڑکا نہیں ہے۔" اماں نے اپنی بات سنا ہی ڈالی جسے وہ دل میں دابے بے چین پھر رہی تھیں۔ میں نے اُکتا کر کہا۔

"اب کسی رئیس زادے کا بھی آئے تب بھی نہیں کرتی۔ یہ شادی کا جوا زندگی بھر کے لیے ایک ہی کافی ہے میرے لیے اور یہ انور اور شاکر میرے پیسے کی وجہ سے منڈلا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ میرے بیوٹی پارلر کی کمائی بہت ہے...... مگر میں اپنا پیسہ کسی کو نہیں دینا چاہتی۔ بڑی محنت کی ہے اس پارلر پر۔"

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ میں شہر کے قلب میں "مون بیوٹی پارلر" انتہائی کامیابی سے چلا رہی ہوں۔ میرا یہ بیوٹی پارلر ایک ہزار گز کے مکان پر قائم ہے اور شہر کا سب سے جدید بیوٹی پارلر ہے۔ میرے یہاں کام کرنے والی لڑکیاں اپنے فن میں ماہر ہیں۔ میرے ہاں آنے والی میری مستقل گاہک ہیں۔ یہ سب زیادہ تر سروس پیشہ، ہاؤس وائف، کنواری، مطلقہ وغیرہ ہیں۔

مجھے ان میں مسز توقیر سب سے زیادہ پسند ہیں...... انتہائی تحمل مزاج خاتون ہیں۔ پارلر آنے سے پہلے ہمیشہ اپوائنٹمنٹ لے کر آتی ہیں۔ میں ان کو جو ٹائم دوں گی اسی ٹائم پر آتی ہیں۔ اگر میرے ہاں کام کرنے والی لڑکیاں مصروف ہوں تو وہ بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ کر کسی بھی

پرانے میگزین کی ورق گردانی کرنے لگتی ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ ان کا ٹائم کسی دوسرے کو دیا جا رہا ہے۔ وہ مہینے میں ایک دفعہ ضرور اپنے چہرے پر فیشل کرواتی ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ چہرے کا کھنچاؤ اور تھکن ختم کرنے کے لیے فیشل بہت ضروری ہے۔ اس سے چہرہ نہ صرف صاف ستھرا ہو جاتا ہے بلکہ طبیعت میں بھی شگفتگی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر چوتھے ماہ اپنے بالوں کا اسٹائل تبدیل کروا لیتی ہیں۔

مس رابعہ سلطان کسی کمپنی میں کام کرتی ہیں۔ ہمیشہ جلدی میں آتی ہیں اور جلدی میں بھاگتی ہیں۔ مگر ہماری پُرانی کلائنٹ ہیں اس لیے کسی نئے نویلے کسٹمر کو اٹینڈ کرنے سے پہلے ہماری بیوٹیشن انھیں اٹینڈ کرتی ہیں۔

مس وجیہہ مرزا اور مس احتل حبیب اس بیوٹی پارلر کی اوّل دن سے گاہک ہیں۔ آئی برو سیٹ کرنے سے پیڈی کیور، مینی کیور تک وہ اسی بیوٹی پارلر سے کرواتی ہیں اور ہمیشہ مطمئن ہو کر جاتی ہیں۔ ٹینا، رانی، شافعہ اور تبسم بڑی جولی لڑکیاں ہیں۔ وہ خواہ مخواہ اپنے بال سیٹ کروانے آئیں یا پارٹی میک اپ کے لیے...... ہمیشہ نئے نئے لطیفے سناتی ہیں...... ٹیپ کے ساتھ آواز ملا کر خود بھی گاتی ہیں۔ ان تمام لڑکیوں میں مس مدیحہ سید مجھے منفرد سی لگتی ہے۔ وہ ہمارے ہاں اکثر شام کا میک اپ کرانے آتی ہے...... مگر بالکل اکیلی...... اس کے ساتھ کوئی سہیلی یا بہن نہیں ہوتی۔

''اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ آتی ہو؟'' ایک دن میں نے اس سے شوخی سے پوچھا...... میرا یہ خیال تھا کہ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو جائے گا...... مگر وہ بڑے تاسف سے حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

''آنٹی۔ ہماری قسمت ایسی کہاں؟''

''کیوں؟ قسمت کی کیا بات ہوئی...... میں نے تو یوں ہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا تھا۔ اب ہر لڑکی اپنے پلّو کے ساتھ کوئی بوائے فرینڈ کا جھمیلا تھوڑے باندھے رکھتی ہے۔''

''اچھا آنٹی آپ ان لڑکیوں کو کیا کہیں گی جو شادی سے پہلے اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ خوب ہلّہ گلّا کرتی پھرتی ہیں۔ زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتی ہیں! بے شک ان سے شادی نہ بھی ہو۔ مگر زندگی میں کھل کر ہنس تو لیتی ہیں۔ آگے کس کو پتہ ہے کہ آئندہ زندگی میں ہنسنا ہوگا یا رونا۔''

''مدیحہ! تمہاری سوچ مجھے خاصی منفی سی لگی۔ پارٹ ٹائم عشق کرتی ہوئی لڑکیاں مجھے چور لگا کرتی ہیں۔''

''اوہ...... تو آنٹی اس میں بھلا چوری چکاری کی کیا بات ہوئی؟''

''گڑیا...... ماں باپ کا اعتماد ختم کرنا بھی تو ایک چوری ہوئی نا؟''

''آپ کچھ بھی کہیے...... مجھے وہ لڑکیاں بہت خوش قسمت نظر آتی ہیں جو عشق بھی خوب دھڑلے سے کرتی ہیں اور شادی کے بعد اپنی حماقتوں پر خوب ہنستی ہیں۔ خوشیاں ہر دور میں ان کے آنگن میں کھلکھلاتی سی پھرتی ہیں اور بعض ہر لحاظ سے بدنصیب ہوتی ہیں۔'' وہ کڑوے لہجے میں ہنسی۔

''بعض دفعہ حماقتیں زندگی بھر آٹھ آٹھ آنسو بھی رُلاتی پھرتی ہیں۔''

''کبھی رُلاتی ہوں گی۔ آج کل کون سچی محبت کرتا ہے۔ سب وقت گزاری کے لیے حیلے بہانے تراشتے پھرتے ہیں۔ مجھے تو پورا یقین ہو چلا ہے کہ آج نہ کوئی بیوی اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی ہے اور نہ ہی کوئی شوہر اپنی بیوی سے۔''

اور مدیحہ کا جملہ میرے سینے میں ایک برچھی گھونپتا اتر گیا اور میں گم صم سی اس کم عمر لڑکی کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کیسی گہری بات کہہ دی تھی اس نے۔ اس کا یہ سچ میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

میں یعنی مینا احمد اپنے کالج کی شوخ ترین لڑکی شمار ہوتی تھی۔ شکل و صورت بھی اللہ تعالیٰ نے خوب صورت بنائی تھی۔ پورے کالج میں میرے حسن کا چرچا عام تھا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں میری اپنی لیکچرار بھی مجھے مبہوت ہو کر دیکھا کرتی تھیں۔ میں اپنے حسن سے خود آگاہ تھی۔ لوگوں کی ستائشی نظریں میرے اندر کا اعتماد بڑھاتی چلی جاتی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اگر میں کسی ٹیسٹ میں فیل ہو جاتی تو لیکچرار کے سامنے اپنے معصوم سے چہرے سے یہ کہہ دیتی کہ آپ میرا دوبارہ ٹیسٹ لے لیں۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے صحیح ٹیسٹ نہیں دے سکی تو وہ میری بات کا فوراً اعتبار کر لیتی تھیں۔ سہیلیوں کا جھمیلا بھی بہت بڑا تھا۔ ہر لڑکی مجھ پر فدا تھی۔ سب میری دوستی پر یوں فخر کرتیں جیسے میرے گروپ میں شامل ہو کر ان کی شخصیت بھی وزن دار ہو گئی ہو۔ کالج کا ہر پروگرام میرے بغیر ادھورا تھا۔ مجھے گانا نہیں آتا تھا۔ مگر ہر فنکشن میں کالی پیلی سُریلی لڑکیوں کے درمیان مجھے کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ میں صرف ہونٹ ہلاتی رہتی تھی اور جج صاحبان میرے حُسن سے متاثر ہو کر اکثر گائیکی کا پہلا انعام ہمارے گروپ کو دے دیا کرتے۔

اداکاری میں میں نابلد تھی مگر ملکہ، شہزادی کے روپ میں...... اسٹیج پر خاموش بیٹھی ہوتی اور

حاضرین کی نظریں میرے وجود سے ہٹ نہیں پاتی تھیں۔ وہ بھی شاید ایک اسٹیج ڈراما تھا جو ہمارے کالج میں گونگے بہرے بچوں کی امداد کے سلسلے میں روزانہ ہو رہا تھا۔ کالج کی لڑکیاں گلی گلی اس ڈرامے کے ٹکٹ بیچتی پھر رہی تھیں۔ ڈرامے کے ٹکٹ اندازے سے زیادہ بکے تھے اور ڈرامے کے چرچے پورے شہر میں ہو رہے تھے۔ اس شام شاید ڈرامے کا آخری شو تھا...... پرنسپل نے اخباری نمائندوں کے ساتھ شہر کے چند مخیر حضرات کو بھی آنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ نواب مظفر حسین اپنے چند رفقاء کے ساتھ وہ ڈراما دیکھنے چلے آئے۔

اور جب ڈرامے میں میری انٹری ہوئی تو یکدم وہ کھڑے ہو گئے تھے۔ ساتھیوں نے ہاتھ دبا کر انھیں بٹھایا مگر ان کی نظریں ہمہ وقت میرے چہرے پر ٹکی تھیں۔ جب میں ستار ہاتھ میں لے کے خوشی میں بجا رہی تھی تو ان کی آنکھوں میں قندیلیں سی روشن تھیں۔ ڈراما ختم ہوا تو وہ وفورِ شوق سے تالیاں بجا رہے تھے۔

نواب صاحب نے ڈرامے کی مد میں جہاں ایک کثیر رقم دی۔ وہاں انفرادی طور پر مجھے دس ہزار کا انعام دیا۔ میرا کردار ایک عام شہزادی کا جز وقتی کردار تھا۔ مگر میرے حُسن کی تپش نے شاید انھیں بوکھلا دیا تھا۔

میں ستاروں بھرا دوپٹا اوڑھے ہی اوڑھے ان سے انعام لینے آئی تو ان کی آنکھیں میرا ہی احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

''کہاں رہتی ہیں آپ؟'' وہ سرگوشی بھرے انداز میں بولے تھے۔

''اسی شہر میں۔'' میں شوخی سے ہنس پڑی تھی۔

''مگر کہاں؟'' ان کا اشتیاق دیدنی تھا۔

''اسی زمین پر۔'' میں نے اٹھلا کر کہا تھا۔ ایک وجیہ نواب زادہ مجھ پر لٹو ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں واقعی اترا سی گئی تھی۔

''مینا۔ اگر دل چاہے تو اس نمبر پر ٹیلی فون کر لینا۔'' انھوں نے اپنا کارڈ انعام کے چیک کے ساتھ مجھے تھماتے ہوئے کہا تھا۔

''ضرور جناب!'' میں نے کورنش بجا لاتے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ فوٹو گرافر کو میرا جھک کر آداب کرنے کا انداز اتنا بھایا کہ مجھے فلیش کی روشنیوں میں نہلا ڈالا۔ اگلے دن تمام اخبارات ڈرامے سے زیادہ میری تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔

اور اماں چیک دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھیں۔

''کون کہتا ہے کہ یہ میری بیٹی ہے۔ یہ تو میرا بیٹا ہے بیٹا۔ اتنی کم عمری میں اس قدر انعامات

حاصل کر چکی ہے۔ اور جب پڑھ لکھ لے گی تو نہ جانے کتنا کمائے گی۔''

''اور میرا ذہن نواب صاحب کی ذات میں اُلجھا ہوا تھا...... میں بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ میرے حُسن میں اتنی طاقت ہے کہ نواب صاحب کو زیر کر سکتی ہوں۔

''آپی! یہ آپ ہی آپ کیوں مسکرائے جا رہی ہیں آپ؟'' چھوٹی بہن سیما نے مجھ سے پوچھا تو میں اپنے خیالوں سے چونک اٹھی۔ نواب صاحب کا کارڈ تھاما۔ اور پڑوس سے انھیں فون کرنے چل دی۔

''ہیلو'' ان کی بھاری آواز ائرپیس پر ابھری۔

''میں مینا بول رہی ہوں۔''

''ارے مون تم!'' ان کا لہجہ کھل سا گیا۔

''جی میں۔ میں۔''

''آج پورے تین دن بعد فون کر رہی ہو۔'' لہجے میں شکایت تھی۔

''میں تین دن میں یہی سوچتی رہی کہ آپ کو فون کرنا چاہیے یا نہیں۔''

''مجھے تم سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔''

''اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہوئی؟''

''بھئی جب میں نے تمھیں خود اپنا کارڈ دیا تھا تو اس قدر سوچ بچار کی کیا ضرورت تھی۔''

''بس ڈر سا لگا کہ کہیں آپ ڈانٹ نہ دیں۔''

''ایسا کبھی مت سوچنا مون۔'' ان کا لہجہ خمار آلود ہو گیا۔

''آپ کو ہمارا ڈراما اچھا لگا تھا۔'' میں اشتیاق بھرے لہجے میں بولی۔

''ہم نے ڈراما دیکھا ہی نہیں۔'' وہ ہنسے۔

''ارے یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں، یقیناً مجھے بنا رہے ہیں، آپ نے تو انعام بھی دیا تھا اس ڈرامے پر۔ اور۔''

''بس بس۔ یقین کرو کہ تمہارے سوا ہم نے کسی کو نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ ڈراما کیا تھا، کہانی کیا تھی اور کردار کیا تھے، یہ میں بالکل نہیں دیکھ پایا میری نظریں تو اس ملکوتی شہزادی کو دیکھ رہی تھیں جو آسمان سے اتر کر زمین پر چلی آئی تھی۔'' وہ بے خود ہو کر بولے۔

''چلیے، آپ کو میرا کردار تو پسند آیا۔'' میں کھسیا کر بولی۔

''ہاں، مون۔ تم اس قدر پسند آئی ہو کہ اب انتظار کی سکت نہیں ہم ہیں۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ نواب صاحب!''

"میناجی! نہ ہم فلمی ہیرو ہیں' نہ کسی افسانے کے ہیرو کہ اپنی بات کو گھما پھرا کر آپ سے کہتے۔ ہم دوٹوک بات کہنے کے عادی ہیں' آپ نے ہمیں مار دیا ہے۔ ہم سچ سچ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو دیکھ کر ہم تو کہیں کے نہیں رہے۔"

"اب میں' فون بند کر دوں۔" نواب صاحب کی باتیں سن کر میں شرم سے سرخ ہو گئی تھی' مانا کہ میرے دل کی بھی خواہش تھی کہ نواب صاحب میری آرزو کریں' مگر اس قدر جلد یہ سب سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول کر رہ گئے تھے۔

"فون بند کرنے سے پہلے' یہ سن لو کہ آج شام' تم ہم سے مل رہی ہو۔"

"کہاں؟" میرا سانس سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"کلفٹن چلیں گے۔ ساحلِ سمندر پر۔ اپنا ایڈریس بتا دو۔ ڈرائیور تمہیں گھر سے پک کرے گا۔"

پھر میں اماں سے سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ان کے ساتھ چلی آئی تھی۔ نواب صاحب میرے ہاتھ تھامے مخمور نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"ایسے مت دیکھیں مجھے۔" میرا چہرہ شرم سے لالوں لال ہو گیا تھا۔

"پھر کیسے دیکھوں؟" وہ ہنسے

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے پیٹھ موڑ کر ادا سے کہا۔

"مون! پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے' یہ ہم ہی جان سکتے ہیں' تم نے تو ہمیں تباہ کر دیا۔"

"خدا نہ کرے' کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔" میرے لہجے میں بے قراری عیاں تھی۔

"ہم سے شادی کرو گی؟" وہ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولے۔

"یہ فیصلہ تو ہماری اماں کریں گی۔" حیا بار آنکھیں نیچے جھک کر بولیں۔

"آپ کی اماں کی خدمت میں' ہم کب حاضر ہوں؟"

"میرے خیال سے جمعہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے بلا تکلف کہہ دیا۔

اُف سات دن بعد' اتنے دن ہم یونہی خالی پھرتے رہیں۔ ہم اماں جان کی خدمت میں کل ہی حاضر ہوں گے...... اور ان سے التجا کریں گے کہ زیادہ سے زیادہ اس جمعے تک شادی ہو جائے۔"

"ارے اتنی جلدی۔" میں نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں' جان...... اب آپ کے بغیر رہنا خود پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔"

اور پھر وہ واقعی اگلے دن اماں کے پاس حاضر تھے۔ مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے دالان

سے لے کر صحن تک بھر گئے تھے۔

"اماں کبھی انھیں دیکھتیں اور کبھی ان ٹوکروں کو...... ان کا دل چاہ رہا تھا کہ نواب صاحب کی بات کاٹ کر رضامندی کا نعرہ بلند کر دیں مگر وہ ان کی بات سننے پر مجبور تھیں۔

وہ بڑے مہذب لہجے میں اماں سے کہہ رہے تھے کہ ہماری بہن یا والدہ حیات ہوتیں تو وہ آ کر اس سلسلے میں بات کرتیں' مگر اب ہم خود اپنی شادی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آئے ہیں۔ آپ ہمیں اپنا بیٹا بنا لیجیے۔ یقین کیجیے مینا ہمارے ساتھ سکھی رہے گی۔"

"مجھے یقین ہے' جو تم کہہ رہے ہو' درست کہہ رہے ہو' مگر ہم غریب لوگ تمہارے شایان شان شادی کرنے کی سکت نہیں رکھ سکتے اور اتنے بڑے گھر میں رشتہ کرنے سے ہمیں یہ خوف علیحدہ دامن گیر ہوگا کہ ہماری بیٹی احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائے۔" اماں نے انتہائی ذہانت سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"شادی کی تیاری کی فکر کرنے کی آپ کو چنداں ضرورت نہیں ہے' مجھے آپ کے ہاں سے ایک دھجی نہیں چاہیے۔"

"مگر میں خالی ہاتھ اپنی بیٹی کو رخصت نہیں کرنا چاہتی...... آخر میری بھی برادری ہے' لوگ مجھے طعنے دے کر کھا جائیں گے۔ لڑکی کی شادی کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہے...... تاکہ تھوڑی سی تیاری میں بھی کر سکوں۔"

"اماں جان! تیاری میں ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں مگر وقت نہیں دے سکتے...... آپ شادی کی طرف سے بے فکر ہو جائیے۔ اب کے جمعے کو ہم برات لا رہے ہیں۔ آپ تیار رہیے گا۔ مینا کا تمام تر جہیز کل ہی آپ کے گھر میں پہنچ جائے گا۔"

پھر واقعی نواب صاحب نے ایک شان دار جہیز میرے گھر پہنچا دیا۔ بَری بھی خوب تزک اہتمام سے آئی تھی۔ مہر میں انھوں نے ایک ہزار گز کی کوٹھی میرے نام کر دی۔ نکاح کے فوراً بعد کوٹھی کے کاغذات انھوں نے میرے حوالے کر دیے۔

شادی کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ نواب صاحب کس قدر محبت کرنے والے انسان ہیں۔ ان کی وسیع و عریض کوٹھی میں ان کے بھائی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی نواب صاحب کے بزنس میں اس قدر مصروف رہتا کہ گھر میں شاذ و نادر ہی نظر آتا۔ ہاں ملازمین کی ایک بڑی تعداد ضرور تھی جو گھر میں سناٹے کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔

انسان آرام کا کس قدر جلد عادی ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مجھے تو یوں لگتا جیسے میں ہمیشہ سے اسی انداز میں رہتی چلی آئی ہوں۔ شادی کو سال بھر ہو چلا

تھا مگر مجھے لگتا تھا کہ میں ازل سے اس محل میں رہ رہی ہوں۔ وہ تمام آسائشات جو کبھی غیر ضروری دکھائی دیتی تھیں۔ اب اپنی زندگی کا حصہ نظر آنے لگی تھیں۔

جس دن میری ہیر ڈریسر نہ آپاتی ' مجھے اپنے بال سنوارنے دوبھر لگتے۔ غیر ملکی کھانے جو کبھی شوق میں چکھے تھے تو ابکائی آ گئی تھی ' اب دیسی کھانوں کے مقابلے میں مزہ دینے لگے تھے۔

نواب صاحب کو ڈانس پسند تھا۔ ایک ٹیوٹر رکھ کر تھا تھئی کی تربیت لے ڈالی۔ مجھے پیرا کی پسند تھی تو سوئمنگ بھی سیکھ لی۔ نواب صاحب کو بچے بھی بہت پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس محل میں کوئی کلکاریاں مارنے والا بچہ محل کے گمبھیر سناٹے کو ختم کر دے۔ مگر مجھے کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ نواب کے کہنے سے پیشتر ہی میں نے بالا بالا تجربہ کار لیڈی ڈاکٹرز سے اپنا معائنہ کروایا۔ ان سب کا ایک ہی کہنا تھا کہ میں بانجھ ہوں اور کبھی ماں نہیں بن سکتی۔

یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری تھی۔ مگر اپنے صدمے کا تذکرہ میں نے نواب صاحب سے نہیں کیا۔ شادی کے ڈھائی سال کے بعد جب نواب صاحب نے مجھے ڈاکٹر کو دکھانے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے انتہائی لگاوٹ سے انھیں ٹال دیا۔

''ابھی تو سیر سپاٹے کے دن ہیں...... ابھی سے بچوں کی چیاؤں ' میاؤں شروع ہو جائے گی تو زندگی کو خاک انجوائے کریں گے۔''

''اتنی ڈھیر ساری دولت کا کوئی والی وارث بھی تو ہونا چاہیے۔ ایک تو ویسے ہی ہم نے دیر سے شادی کی...... اگر بچوں کی آمد میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوں گی...... تو کیا بڑھاپے کی سرحدوں پر جا کر بچے کھلاؤں گا؟''

''خدا آپ کو سلامت رکھے...... میرے والی وارث آپ ہیں اور آپ ہی رہیں گے۔'' میں نے اتنی لگاوٹ سے ان سے کہا کہ وہ مسکرا کر بات کو پی گئے۔ ان کی چھٹی حس نے اس ضمن میں مزید بولنے سے انھیں روک دیا تھا۔ مگر جہاں دیدہ انسان تھے...... میری ایک ناں سے ان کا دماغ سو سو مطلب اخذ کرتا تھا۔

ایک شب جب اپنڈکس کے درد میں وہ مجھے اسپتال لے کر گئے تو بالا ہی بالا انھوں نے لیڈی ڈاکٹر سے میرے چیک اپ کے لیے بھی کہہ دیا۔ جس نے اپنے معائنے کے بعد انھیں یہ جان لیوا خبر سنائی کہ میں قدرتی طور پر بانجھ ہوں۔

نواب مظفر مرزا کی زندگی کے زیادہ ایام عیاشی میں ہی گزرے تھے۔ وہ تو شادی کے نام سے بدکتے تھے...... عورت کا حصول ان کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہ ساری زندگی اسی طور پر بسر کرتے آئے تھے وہی انداز ان کے بھائی نواب منظور مرزا کا تھا۔ وہ بھی شادی کو ایک طوق سے

تعبیر کیا کرتے تھے مگر مجھ سے شادی کا جوا جہاں میرے حسن سے متاثر ہو کر کھیلا تھا وہاں اس کا ایک خاص مقصد اولاد کی خواہش بھی تھا...... ورنہ انھیں شادی کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ جب سے انھیں یہ احساس ہوا تھا کہ میری حیثیت ایک بے ثمر درخت کی سی ہے...... میرے وجود سے انھیں وحشت ہونے لگی تھی۔ میرا شعلے دیتا ہوا حسن انہیں بھسم کرنے لگا تھا۔

''اونہہ...... صرف شوپیس ہی ملا جسے سوائے سجانے کے کوئی اور کام نہیں لیا جا سکتا۔'' وہ اپنے مقدر کو خود ہی کوس ڈالتے۔ کلکاریاں مارتے ہوئے بچے انھیں کبھی اتنے پسند نہیں رہے تھے...... جتنے کہ انھیں اب پیارے لگنے لگے تھے۔

صبح لان کی روش پر ٹہلتے...... مالی کا پوتا اگر سامنے آ جاتا تو پاس بلا کر پیار کرتے...... اس سے اس کی دلچسپیوں کے بارے میں سوالات کیے جاتے۔

نواب منظور مرزا...... بھائی کے احساسات سمجھ کر پہلے حیران اور پھر پریشان ہو گئے تھے۔

''آپ کوئی بچہ ' کیوں نہیں گود لے لیتے؟'' انھوں نے مشورہ دیا۔

''نہیں منظور...... کسی دوسرے کی اولاد ' کبھی اپنی نہیں ہوتی۔''

''پھر کیا سوچا ہے آپ نے......؟''

''اس کا حل دوسری شادی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''مینا آپ کا دامن کبھی نہیں چھوڑے گی...... اس کا حسن ایک ایسی بلا کی طرح طاقت رکھتا ہے کہ آپ اس سے کسی صورت پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اور دوسری بیوی۔ مینا کی موجودگی میں کبھی ذہنی طور پر خوش و خرم نہیں رہ سکے گی۔''

''اس کا فیصلہ تم ' ہم پر چھوڑ دو...... یہ تمام معاملات ' ہم خود نمٹا لیں گے......'' وہ خوش دلی سے ہنس کر بولے۔

☆☆☆

''آپ ' اپنی اماں کے ہاں رہ آیئے۔'' وہ مجھے بار بار کہتے......

''یہ آپ کہہ رہے ہیں؟'' میں انھیں لاڈ سے آنکھیں دکھاتی۔

''ہاں بھئی...... کل ' کلاں ' آپ کی اماں ہم سے ناراض ہو گئیں تو پھر......؟''

''ہو جانے دیجیے ناراض...... اب ہم ' آپ کے بنا نہیں رہ سکتے...... سچ...... اب تو وہاں جا کر...... اتنی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ کیا بتائیں؟''

''ہم اپنے بزنس کے سلسلے میں باہر جانے والے ہیں۔ اکیلے آپ یہاں گھبرائیں گی۔'' وہ پانسہ پھینکتے۔

"اللہ کہاں جا رہے ہیں آپ کتنے خراب ہیں...... ہم سے پوچھے بغیر پروگرام بنا لیا۔ انگلینڈ امریکا آسٹریلیا...... مگر پلیز مجھے سوئٹزرلینڈ بہت پسند ہے...... وہیں چلیے......"

"ارے کمال کرتی ہیں آپ۔ یہ کوئی ہنی مون ٹور تھوڑی ہے۔ فیکٹریز کی مشینری لینے کے لیے ہمیں جاپان جانا پڑ رہا ہے اب ہر جگہ آپ کو لیے لیے تھوڑی جا سکتے ہیں۔" وہ اپنے لہجے میں رُکھائی لائے۔

"بس میں نے کہہ دیا...... میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔" میں ان کے سینے پر سر رکھ کر ادا سے کہتی۔ اور آنسو بھل بھل ان کے سینے پر بہتے۔

"مون۔ آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے پلیز۔" وہ میرے قُرب سے بھاگنے کے راستے ڈھونڈتے۔

"سنیے۔ بھائی منظور کو بھیج دیجیے نا؟"

"اب ایسا ممکن نہیں رہا؟"

"کیوں ہمیشہ تو وہ جاتے ہیں! اب بھی جائیں گے تو کیا ہوگا؟"

"کاروبار میں خاصا نقصان ہو رہا ہے۔"

"ہونے دیجیے۔ بہت پیسہ ہے ہمارے پاس یہ بھی بہت ہے ہمارے لیے!"

"تم پاگل ہو اور بس...... پیسے کا کام مزید پیسہ کمانا ہوتا ہے اور اگر ایک دفعہ ختم ہونے لگے تو اسے روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ خرچ کرتے چلے جائیں تو قارون کا خزانہ تک خالی ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر لے چلیے مجھے اپنے ساتھ...... میں آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے دُور نہیں دیکھ سکتی۔" میں نے ان کی پشت پر اپنا سر ٹکا کر ادا سے کہا۔

اور وہ جز بز ہو کر رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا خوبصورت چہرہ کس طرح اپنے چانٹوں سے سرخ کر دیں اور مجھے لاتیں مار مار کر اپنے گھر سے نکال دیں۔

میری سفید رنگت جسے وہ چنبیلی کی کلیوں سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ اب انھیں وہ کفن کی سفیدی کی طرح بھیانک نظر آنے لگتی تھی۔ "جان! یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ باہر ضرور جاؤں گی...... بلکہ ہر اس جگہ...... جہاں آپ جائیں گے۔"

تب ان کی "ہوں" اس قدر دھیمی تھی کہ ان کا ٹوٹا ہوا ہنکارہ مجھے اپنی کامیابی کی نوید دے رہا تھا۔

"اللہ آپ کتنے اچھے ہیں۔" ان کے ہاتھ میں نے اپنی آنکھوں سے لگا لیے تھے۔ "کس

قدر خیال کرتے ہیں میرا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ جان کر مجھے چھیڑ رہے تھے۔ ہے نا...... میں سچ کہہ رہی ہوں؟" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مجھے تمہارا از حد خیال ہے۔" ایک بے عنوان سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر رینگ گئی تھی۔

مگر میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نواب صاحب کا ذہن کمینہ پن بھی لیے ہوگا۔ مجھ پر تیزاب پھینکنے کا منصوبہ سوچا سمجھا بھی ہو سکتا ہے۔

اب سوچتی ہوں تو تب بھی یونہی لگتا ہے کہ کسی نے میرے دماغ میں میخ گاڑ دی ہو۔ حقائق جان کر بھی میں متحیر ہو جاتی ہوں کہ ذلالت کی اس نہج کو کیا کہوں۔

حالانکہ اس دن انہوں نے خود ہی مجھ سے کہا تھا۔ "جاؤ مینا اپنے لیے شاپنگ کر آؤ۔ تمہیں اپنی امّاں اور بہنوں کا کوئی خیال ہی نہیں رہتا۔ ان سب کے لیے بھی چار چار جوڑے خرید لاؤ۔" انھیں معلوم تھا کہ بے وجہ خریداری کی میں بے حد شوقین تھی مگر انھیں یہ کبھی نہیں معلوم تھا کہ میں اپنے گھر والوں کو ان سے چھپ کر اس قسم کے گفٹ دیتی رہتی ہوں۔

"کیا سوچنے لگیں تم؟" مجھے چپ چاپ بیٹھا دیکھ کر وہ میرے پاس چلے آئے۔

"اوکے ڈیئر!" میں نے گاڑی کی چابیاں اٹھا کر خوش دلی سے کہا۔

"ڈرائیور کو لے جاؤ۔ تم گاڑی اناڑیوں کی طرح چلاتی ہو۔" وہ خوش دلی سے بولے تھے۔"

"ایز یو وِش۔" میں نے بے پروائی سے کاندھے اُچکا کر چابیاں واپس رکھ دی تھیں۔

"تمام دکانیں چھاننے مت بیٹھ جانا۔" مظفر نے میرے بال بگاڑتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"اچھا کیا میں ایسی ہوں؟" میں نے آنکھیں دکھائیں۔

"تم کیا ہو؟ یہ میں ہی سمجھ سکتا ہوں...... دکان دار سے ایسی زبان چلاتی ہو کہ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ نہ جانے کیسے کم دیتے ہیں وہ لوگ۔ ورنہ ڈانٹ کر بھگا دینا چاہیے انھیں۔"

"ابھی کوئی مائی کا لال مجھے بھگانے والا پیدا نہیں ہوا۔ خریداری کے طریقے خواتین ہی جان سکتی ہیں۔ آپ جیسے مرد نہیں۔"

"اسی لیے تو آپ کے ساتھ نہیں جا رہے۔" انھوں نے پھر بال بگاڑے اور باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں بیگ اپنے کاندھے پر لٹکا کر باہر نکل آئی۔ ڈرائیور پہلے ہی سے میرا منتظر تھا۔

گاڑی سڑک پر تیزی سے نکلی اور پُر ہجوم سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی...... اور میں شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

اچانک مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک دو نوجوان میری گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میرے لب مسکرا اُٹھے۔ اس قسم کے واقعات سے میں عموماً دوچار ہوتی رہتی تھی...... اکثر منچلے میرے خداداد حُسن کو دیکھ کر سراہتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اُتار دیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے دل بھر کر دیکھیں...... اور دل بھر کر ستائشی جملے ادا کریں۔ (یہ میرا مشغلہ ہوتا تھا)۔

ٹریفک سگنل پر گاڑی رُکی تو نوجوانوں کا اسکوٹر شاید پیچھے ہی کہیں رک گیا تھا۔ میں گردن کھڑکی سے باہر نکال کر انھیں دیکھنے لگی...... اچانک سبز بتی کا اشارہ ہوا اور گاڑیاں دھیمی رفتار سے چل پڑیں۔ ابھی گاڑی نے اپنی رفتار نہیں پکڑی تھی کہ وہ اسکوٹر جو ٹریفک کے اژدھام میں کہیں پھنس گیا تھا۔ تیزی سے لہراتا ہوا آیا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان نے مجھے فلائنگ کس کر کے ہاتھ ہلایا اور میرے لبوں پر آپ ہی آپ دیے سے جل اُٹھے۔ یکدم نہ جانے اس نوجوان کو کیا ہوا کہ اس نے شیشی سے کوئی سیال مادّہ میری جانب اُچھالا۔ جو میرے دائیں رخسار کو چھوتا ہوا گردن تک چلا آیا اور میرے لبوں سے چیخوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا...... ڈرائیور نے گھبرا کر گاڑی روک دی۔

"خیریت تو ہے بیگم صاحبہ!" وہ ہراساں سا پوچھ رہا تھا۔

"لگتا ہے کسی نے میرے چہرے پر کوئی تیز مادّہ پھینک دیا ہے' چہرے پر سخت سوزش ہو رہی ہے۔" میں تکلیف سے کراہ کر بولی۔

"آپ کو' میں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔" ڈرائیور نے قریب کھڑے مجمع سے گھبرا کر کہا۔ جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

"ہاں' یہی بہتر رہے گا۔" مارے تکلیف کے میں نیلی پڑی جا رہی تھی۔

"اسپتال' میں ایک ماہ تک ایڈمٹ رہی...... چھوٹے' چھوٹے کئی آپریشن...... میرا چہرہ بحال کرنے میں ناکام رہے۔ میرے چہرے کا حُسن تباہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے پلاسٹک سرجری کا مشورہ دیا تھا۔ جسے مظفر نے فوری طور پر کرانے سے انکار کر دیا تھا۔

"آخر کیا مضائقہ ہے۔" میں نے اس سلسلے میں ان سے خاصی تکرار کی تھی۔

"تمہارا بلڈ پریشر خاصا لو جا رہا ہے اور میں اس سلسلے میں کسی قسم کا رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔" ان کا محبت بھرا انداز بدستور وہی تھا۔

"ٹھیک ہوں میں کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ مجھے اپنی وہی شکل چاہیے جو کسی ظالم نے ملیامیٹ کر دی ہے۔" میں آنسو بہا کر کہتی۔

خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو' کچھ بھی نہیں ہوا تمہیں...... تم اب بھی اتنی ہی پیاری ہو' جیسی پہلے تھیں۔" مظفر مجھے دلاسا دیتے۔

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں۔ پوری دنیا تو نہیں کہہ سکتی؟"

"پوری دنیا سے تمہیں کیا مطلب؟"

"دنیا میں رہ کر' اس سے ناطہ توڑا تو نہیں جاتا۔"

"مگر میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی کا ناتہ صرف اور صرف میری ذات تک محیط ہو اور بس!"

ان کا لہجہ بڑا گمبھیر تھا...... اور آنکھیں دُور کہیں سوچ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"میں پلاسٹک سرجری کے بعد گھر آتی تو زیادہ بہتر تھا۔"

"پاکستان میں سرجری کا کام اتنا ایڈوانس نہیں ہے۔ میں باہر کراؤں گا۔" مظفر مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہتے۔

"مگر کب؟" میں اس معاملے میں ذرا بھی صبر سے کام لینا نہیں چاہتی تھی۔

"اطمینان رکھو...... میں ابھی مشورہ کر رہا ہوں۔"

"آخر آپ کی یہ مشورہ بازیاں کب ختم ہوں گی۔ میرا چہرہ بگڑے ہوئے چار ماہ گزر گئے ہیں...... مجھ سے نہیں ہوتی' آپ کی یہ سستی برداشت!"

"تم مجھے شاید کبھی نہیں سمجھو گی۔" وہ آف موڈ کے ساتھ وہاں سے اُٹھ گئے مگر میں شاید۔ ان کو جلد ہی نہ صرف سمجھ گئی بلکہ پہچان بھی گئی۔

نواب مظفر واقعی بہت بڑے فنکار تھے۔ ایسے فنکار جن کی اداکاری کی داد دی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ کتنے گہرے تھے وہ...... کسی سڑی ہوئی بدبودار نالی کی طرح گہرے...... جو تمام تر غلاظت سمیٹے ہوئے رواں دواں تھی۔

ایک شام ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ ہونے کے باوجود بھی نہیں گئی تھی۔ ہاں اپنے کمرے سے نکل کر اسٹیڈی روم میں ایک صوفے پر ڈھے گئی تھی۔ یہ اسٹیڈی روم...... رہائشی کمروں سے خاصے فاصلے پر واقع تھا۔ اس وقت میرا دل اتنا مضطرب تھا کہ بے وجہ رونے کو دل چاہ رہا تھا...... میں نے کمرے میں بتی تک روشن نہیں کی تھی۔ اندھیرے میں یوں چپ چاپ آنسو بہانا میری عادت کا ایک حصہ بنتا چلا جا رہا تھا جس سے مظفر لاعلم تھا۔

اچانک برابر کی لائبریری سے مجھے مظفر کے قہقہے کی آواز سنائی دی درمیانی دروازہ کھلا

ہونے کی وجہ سے آواز بالکل صاف آ رہی تھی۔ مظفر فون پر باتیں کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ 'رہائشی کمرے چھوڑ کر' مظفر اس وقت' کس کو فون کر رہے ہیں؟' میرا رواں رواں ان کی آواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ فون پر اپنے نئے بننے والے پلازا کی ڈیزائنر مس سطوت کو تسلی دے رہے تھے۔

''تم بے فکر رہو سطوت! مینا جیسی چھچھوری عورت کو میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ جو سڑکوں پر بھی اپنے محسن کا خراج چاہتی ہے۔ اس جیسی ذلیل عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی...... میرا خیال تھا کہ چہرہ بگڑنے کے بعد وہ از خود میرا پیچھا چھوڑ دے گی۔ مگر خاصی ڈھیٹ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں امریکا میں اس کے علاج پر اپنے دس لاکھ روپے تباہ کر دوں گا۔ بار بار آنے جانے اور متواتر علاج کرانے میں کم و بیش اتنا ہی خرچہ ہوگا اور میں اس پر پہلے ہی بہت خرچ کر چکا ہوں...... ایک بانجھ' بدشکل عورت کو مزید برداشت کرنا قطعی میرے بس میں نہیں ہے۔ میں تنگ آ چکا ہوں اس سے...... تھک گیا ہوں میں اس سے محبت بھرے مکالمے بول بول کر...... میرے الفاظ میرے لبوں پر آنچ دینے لگتے ہیں...... جب میں ان کی ادائیگی اس ڈائن کے سامنے کرتا ہوں۔''

دوسری جانب سے معلوم نہیں کیا کہا گیا تھا مگر مظفر بہت محظوظ ہوئے تھے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہے تھے...... ''ہاں سطوت......! میں تمہاری کیفیت خوب سمجھتا ہوں۔ تم سے دوری اب مجھے بھی برداشت نہیں ہے یقین کرو' میں اسی ہفتے مینا کو طلاق دے دوں گا۔ اس کی مکروہ شکل سے مجھے بھی خوف آنے لگا ہے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو ذرا چھینٹا مارنے کو کہا تھا' مگر ان کم بختوں نے تو اس کا بایاں حصہ پورا ہی جھلسا ڈالا...... پوری چڑیل لگنے لگی ہے...... اب گاڑی میں چہرہ چھپا کر ڈاکوؤں کی طرح بیٹھتی ہے۔ قریب سے کوئی لفنگا گزرے یا شریف' مجال ہے کہ کسی کو آنکھ بھر کر دیکھ لے۔ مجھے تو اس ڈائن پر رحم بھی آنے لگا ہے۔ جب وہ آپریشن اور پلاسٹک سرجری کے لیے بلکتی ہے۔'' مظفر نے بڑے طوفانی انداز میں قہقہہ لگا کر ریسیور کریڈل پر رکھا۔

اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ دوسری تیزاب کی بوتل سے مظفر کے ساتھ ساتھ سطوت کا چہرہ بھی مکروہ کر ڈالوں...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک محبت کرنے والا شوہر۔ جو ہمہ وقت میرے چرنوں میں اپنی محبت کی کلیوں کا ڈھیر لگائے رکھتا تھا۔ ایسا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس نے کتنی مذموم حرکت کی تھی۔ میں کئی گھنٹے اسٹڈی روم میں بیٹھی یہی سوچتی رہی اور جب میں اپنے تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ کمرے میں آئی تو مظفر بڑی خوش دلی سے میری طبیعت پوچھ رہے تھے۔ ''ڈاکٹر نے کیا کہا مون؟''

''ڈاکٹر کہہ رہی تھی...... کہ لگتا ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر آپ کو جھلسایا ہے۔'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں سنایا۔

''ہاں' بالکل ہو سکتا ہے۔ بھئی بڑے لوگوں کے دشمن بھی کم نہیں ہوتے۔ وہ تو شکر کرو کہ کوئی تمہیں اغوا نہیں کر کے لے گیا۔ ورنہ وہ تو تمہاری واپسی کی شرط کے لیے بھاری تاوان رکھتے۔''

''کاش ایسا ہی ہو جاتا۔'' میں بڑبڑائی۔

''اوہ۔ کیسی باتیں کر رہی ہو تم...... اُلٹے سیدھے ہاتھوں میں جا کر' کیا تم محفوظ رہتیں؟'' ان کا خود ساختہ لہجہ تفکر آمیز تھا۔

''انسان تو کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔'' میرے لبوں سے ایک آہ بلند ہو گئی۔

''یہ حالات تو پوری دنیا میں ایسے ہی ہیں۔'' انھوں نے فلسفہ جھاڑا۔

''شاید یہی قیامت کے نشانیاں ہیں...... کہ انسان' کا دشمن ہے۔'' میرا لہجہ زخموں سے چور ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے' آج بڑی سنجیدہ ہو رہی ہو؟''

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ میری بقیہ زندگی اسی مکروہ چہرے کے ساتھ گزرے گی۔'' میں لفظ چبا چبا کر بولی۔

''تم پریشان مت ہو۔ میں نے آج ہی شام ڈاکٹر سے بات کی ہے' وہ امریکا میں تمہاری سرجری کے لیے نمبر ون سرجن سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔'' مظفر نے مجھے جھوٹی تسلی دی تو میں کھلکھلا اٹھی...... سطوت کے ساتھ ان کی بات چیت کے جملے کانوں میں سیسہ سا ڈالنے لگے تھے۔

''اللہ آپ کتنے اچھے ہیں...... خدا نے کیسا منفرد عطیہ میری جھولی میں ڈالا۔ آپ تو واقعی میرے مسیحا ہیں...... میرے لیے کتنے متفکر رہتے ہیں آپ۔'' میں لاڈ سے بولی (اب جھوٹ بولنا میں نے سیکھ لیا تھا)

''جان۔ یہ پریشانی تو ہے ہی میری۔'' ان کے لہجے میں کتنا تردد تھا۔

'کمینے آدمی' تم ڈرامابازی خوب کر لیتے ہو' میں دل میں سوچ کر ہنس پڑی۔

''کیا سوچنے لگیں؟''

''جب ہماری شادی ہوئی تھی تو لوگوں نے آپ کی عمر پر اعتراض کیا تھا کہ آپ مجھ سے بہت بڑے ہیں' مگر میں سوچتی ہوں کہ زیادہ عمر کے شوہر اپنی کم عمر بیوی سے زیادہ محبت کرتے ہیں...... کیوں' میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

"ارے جان! آپ کی تو ہر بات درست ہوتی ہے۔" ان کی ہنسی مجھے خاصی مکارانہ لگی......

مگر قدرت کو اُس کا بھی امتحان لینا مقصود تھا...... اُسی شب نواب مظفر کو دل کا دورہ پڑا......

"مینا...... میری دوائیں سائیڈ ٹیبل میں ہیں...... پلیز اس میں سے ایک چھوٹی سرخ گولی نکال کر میرے منہ میں رکھ دو......" وہ سدت درد سے تڑپتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

میں بادلِ نخواستہ اُٹھی...... دراز کھولی...... 'دوائیں سامنے ہی رکھی تھیں...... میں نے اُٹھا کر انہیں ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

"مون' میں مر رہا ہوں' مجھے دوا دے دو۔ یہ بہت اچھی دوا ہے...... درد سے فوری افاقہ ہوگا۔"

'مر جاؤ...... خبیث بڈھے' تمہیں مر ہی جانا چاہیے......' میرا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا...... لیکن ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "یہاں تو کوئی دوا نہیں ہے۔"

"تم...... ڈاکٹر...... کو...... فون کرو......" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے تھے...... مارے تکلیف کے وہ دانتوں تلے ہونٹ کاٹ رہے تھے۔ تب میں الٹے سیدھے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب' شاید گھر پر نہیں ہیں...... بیل جا رہی ہے کوئی اُٹھا ہی نہیں رہا......" میں نے پریشانی اپنے لہجے میں گھول کر کہا (ورنہ دل تو قہقہے لگا رہا تھا)

"بھائی کو بلا دو......" یہ آخری آواز تھی...... جو نواب مظفر کے لبوں سے ادا ہوئی تھی...... اُس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔

اور میں اطمینان سے بیٹھی ان کی رکتی چلتی سانسوں کو گھور رہی تھی...... صبح فجر کے بعد ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی...... اور اُن کی گردن ڈھلک گئی...... تب میں چیختی ہوئی نواب منظور مرزا کے کمرے کی طرف دوڑی۔ دوسرے ملازمین بھی میری آواز پر دوڑے چلے آئے۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" سب کا ایک ہی سوال تھا

"مظفر کی طبیعت خراب ہے۔ انہوں نے مجھے جگا کر دل کے درد کے بارے میں بتایا ہے۔"

نواب منظور مرزا بھی ننگے پاؤں دوڑے چلے آئے۔ اور بھائی کو دیکھ کر سراسیمہ سے ہو گئے...... دل کے بہلاوے کے لیے ڈاکٹر کو بلایا...... اُس نے ان کی موت کی تصدیق کر دی۔

'سطوت بیگم...... تم بھی چلو بھر پانی میں ڈوب مرو...... اگر نواب مظفر میرے نہیں رہے...... تو تمہارے بھی نہیں ہو سکے' میں دل میں سوچ کر ہنس پڑی......

عدت کے بعد...... نواب منظور مرزا نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میں اپنے گھر

چلی جاؤں۔

"مگر یہ جائیداد' فیکٹریز...... میرے شوہر کی ہیں......"

"اگر آپ اُس وصیت نامے کو دیکھ لیں تو بہتر ہوگا جس میں نواب صاحب نے تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا وارث مجھے ٹھہرایا ہے......"

"مگر میں ان کی بیوی تھی......" میں چلائی۔

"ہوں گی...... مگر انہوں نے آپ کے نام ایک دھیلا بھی نہیں رکھا......"

میں نے گھر کے سیف میں سے اپنے زیورات نکالنے چاہے تو معلوم ہوا کہ نواب منظور مرزا وہاں سے سب پار کر چکے ہیں وہ تو شکر تھا کہ وہ مکان جو انہوں نے نکاح کے بعد مجھے بطور حق مہر کے طور پر دیا تھا...... اُس کے کاغذات اماں کے گھر تھے۔ ورنہ نواب منظور مرزا انہیں بھی اُڑا سکتے تھے۔

"یہ یاد رہے کہ آپ جہیز کے نام پر کوئی دھجی اس گھر میں نہیں لائی تھیں...... سب سامان بھائی جان کی طرف سے تھا...... چند گھریلو استعمال کے کپڑوں کے سوا کسی قیمتی کپڑے کو آپ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں......" نواب منظور مرزا نے انتہائی نیچ پنے سے مجھ سے کہا۔

"بہتر ہے......" میں تین کپڑوں میں اپنے گھر چلی آئی۔

☆☆☆

"اری مکان اپنا کرائے پر چڑھا دیے' خاصی آمدنی ہو جائے گی۔" اماں نے کہا۔

"نہیں اماں میں بہت زیادہ کمانا چاہتی ہوں...... مجھے دس لاکھ چاہئیں......" میں اپنے آنسو پی کر بولی......

"پاگل ہے تُو...... اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے......"

"میں کماؤں گی......" میں ایک جوش کے عالم میں بولی۔

"کوٹھے پر جا کر ناچے گی کیا......؟"

"میں ایسی نہیں ہوں......" میں رو پڑی......

"سوائے ایک مکان کے تیرے پاس ہے ہی کیا...... یا میاں سے بچایا ہوا...... ایک آدھ لاکھ ہوگا...... اور بس۔"

"میں اُس مکان میں ایک بڑا بیوٹی پارلر کھولوں گی۔"

"چل گیا بیوٹی پارلر......" اماں نے جل کر کہا۔

"واہ' چلے گا کیوں نہیں...... اس زمانے میں خواتین اپنا بے حد خیال رکھتی ہیں۔"

"دو چار ہی رکھتی ہوں گی...... بڑے بھیا کی بہو کو دیکھ لو...... بینک میں کام کرتی ہیں' جس دن بینک سے چھٹی کرتی ہے اُس دن سر تک نہیں گوندھتی...... سلیم کی دلہن کو دیکھ لو کالج میں پڑھاتی ہے سوائے لپ اسٹک کے مجال ہے کوئی میک اپ کرتی ہو۔ جب بھی جاؤ سر جھاڑ' منہ پہاڑ نظر آتا ہے۔"

"نہیں اماں...... آپ نہیں جانتیں...... میک اپ سازی بھی ایک کاروبار ہے۔ جب میں نے شوق ہی شوق میں اسے سیکھا تھا اُس وقت اس منافع بخش کاروبار کا اندازہ تک نہیں تھا...... مگر اب آپ دیکھیں گی......"

اور اب...... میرا یہ بیوٹی پارلر شہر کے مشہور پارلرز میں شمار ہوتا ہے۔ ہمارے کلائنٹ جانے پہچانے ہیں...... جن سے روایتی ہنسی مذاق کے ہم عادی ہیں...... مگر آج مدیحہ کی باتیں...... میرے سینے میں ایسا خنجر گھونپ گئی تھیں...... کہ میرا ماضی...... میری نظروں کے سامنے ایک فلم کی طرح گزر گیا تھا......! مدیحہ کی باتیں کوڑے بن کر میرے ذہن پر لگ رہی تھیں واقعی ٹھیک کہا تھا اُس لڑکی نے' اگر مظفر کو مجھ سے محبت نہیں تھی تو میں نے کون سی محبت کا ثبوت دیا تھا۔ ایک جاں بہ لب شوہر میرے سامنے تڑپتا رہا اور میں سفاکی سے اُس کی سانسیں گنتی رہی۔

مجھے اپنے فعل پر اتنی شرمندگی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اپنی ان کمینی باتوں سے میں نے اماں تک کو لاعلم رکھا تھا مگر آج میری گردن جھکی ہوئی تھی۔

وہ اکثر...... کہا کرتی تھیں کہ اگر مظفر زندہ ہوتا تو مجھے اتنی تنگ و دو کبھی نہیں کرنی پڑتی...... وہ نہیں' جانتی تھیں کہ اگر مظفر مجھے طلاق دے دیتے تب بھی مجھے ان دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا...... مگر شاید...... ضمیر کی خلش مجھے اتنی بے چین نہ رکھتی...... مظفر کی موت کا خواب مجھے بار بار نہیں دکھائی دیتا اماں کا بار ہا یہ کہنا......

"اری بیویاں کم بختیں...... یوں ہی جی جان سے اپنے میاں سے محبتیں کیا کرتی ہیں...... نگوڑے نے جائیداد سے ایک دھیلی نہیں دی...... مگر مجھے معلوم ہے کہ اُس کی محبت تیری رگوں میں خون کے ساتھ دوڑ رہی ہے۔"

اب میں کیسے کہہ دیتی کہ میری رگوں میں محبت کی سرخی ختم ہو گئی ہے...... وقت کے ساتھ ساتھ پیسہ کمانے کی حرص تو مزید بڑھ رہی ہے مگر اپنی پلاسٹک سرجری کروانے کا خواب میں نے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ویسے بھی میں غم کی ایک ایسی اسٹیج پر پہنچ رہی ہوں کہ مجھے دوسری شادی کا کوئی اشتیاق بھی نہیں ہے۔

حالانکہ میرا جسم ویسا ہی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے...... میرے بال سیاہی مائل اور دراز

ہیں...... جنہیں میں جوڑے کی شکل میں لپیٹے رکھتی ہوں' پہلے کی طرح بال کھولے رکھنا مجھے قطعاً پسند نہیں رہا۔ بیوٹی پارلر سے فارغ ہو کر میرا واحد مشغلہ ایک ہی ہے۔ میں اپنی سرخ اسپورٹس کار میں بارونق بازاروں میں گھوما کرتی ہوں...... میری نظریں عقاب کی سی تیزی سے ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں اور جب میں بُری طرح تھک جاتی ہوں تو گھر لوٹ آتی ہوں......

ہاں میں سطوت کو ڈھونڈتی ہوں...... تاکہ اُسے بتا سکوں کہ زندگی کے میدان میں اگر مجھے شکست ہوئی ہے تو کامیابی اُس کے حصے میں بھی نہیں آئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ مظفر صاحب کے دل میں طلاق دینے کا خیال صرف سطوت کی وجہ سے آیا تھا۔ اگر سطوت شادی شدہ شخص سے یوں محبت کی پینگیں نہ چڑھاتی تو شاید میرا انجام یہ نہ ہوتا۔

ان پانچ سالوں میں مجھے یوں لگتا ہے کہ سطوت کو زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے...... وہ مجھے کبھی کسی بازار میں نظر نہیں آئی...... یا شہر کراچی اتنا بڑا ہے کہ میں اُسے ڈھونڈ نہیں پائی ہوں۔ مظفر نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ ایک ڈیزائنر ہے...... شہر کراچی کی بے شمار ہاؤس ڈیزائنرز سے میں مل چکی ہوں اُن میں سے کوئی بھی سطوت کے نام سے واقف نہیں ہے۔ اپنی اس تمام تگ و دو سے میں ناامید نہیں ہوئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ کبھی نہ کبھی سطوت مجھے ملے گی ضرور...... تب میں اُس کو اُس کی ناکامی کا پُرسہ ضرور دوں گی...... اور یہی میرا مقصدِ حیات ہے!

☆☆☆

نزلے زکام سے فارغ ہو کر...... میں نے اپنے پارلر میں ایک ہفتے بعد قدم رکھا تھا...... چند نئے کلائنٹس نظر آئے تھے۔

"لگتا ہے کہ نئے کسٹمر ہمارے پارلر کی جانب خاصا رجوع کر رہے ہیں!" میں نے راحیلہ سے ہی پوچھا جو میری غیر موجودگی میں پارلر کی انچارج ہوا کرتی تھی۔

"یہ سب آپ کی محنت ہے میڈم...... ورنہ پارلر چلانا کوئی اتنی آسان بات بھی نہیں ہے۔" راحیلہ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ میں ابھی راحیلہ سے گفتگو کر رہی تھی کہ انور کی بہن اپنی سہیلیوں کے ہمراہ پارلر میں داخل ہوئی......

"اللہ باجی...... آج آپ سے ملاقات ہو ہی گئی......" اُس نے اپنی خوشی سے پھولی سانسوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"جی فرمائیے!" میرا لہجہ قطعی کاروبارانہ سا تھا۔

"ہم لوگ آپ کے گھر اتنی دفعہ گئے......" اُس نے اپنی سہیلیوں کو نظر کا میٹھا سا اشارہ میری جانب کر کے کہا۔

"آج آپ نے کیسے زحمت کی......" میرا چہرہ یونہی تنا تنا سا تھا۔

"بس اپنی سہیلیوں کو آپ سے ملوانا تھا۔"

"یہاں میں کسی سے گپ شپ تو نہیں کر سکتی' یہاں مجھے اپنے کسٹمرز کو دیکھنا پڑتا ہے...... اور پھر مجھ سے مل کر یہ لڑکیاں بھلا کیا کریں گی......" میں نے انتہائی روکھائی سے کہا...... اور اُس کے فق ہوتے چہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے دلہن روم میں آ گئی۔

"اور جب میں واپس آئی تو انور کی بہن اپنی سہیلیوں کے ہمراہ واپس جا چکی تھی......!

"میڈم! آپ کی وہ مہمان خاصے پاؤں پٹخ کر گئی ہیں۔" راحیلہ نے مجھے بتایا۔

"میں بھی یہی چاہتی تھی......" میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میڈم...... میں سمجھی نہیں۔!"

"تم سمجھ بھی نہیں سکتیں...... یہ وہ لوگ ہیں جو خود کچھ کرنے کی سکت نہیں رکھتے...... اور دوسروں کے کاندھوں پر سفر کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا مضائقہ ہے...... یوں بھی راستہ کچھ طے ہو ہی جاتا ہے۔" راحیلہ کی لماں کے ساتھ خاصی دوستی تھی اس لیے اُسے میرا مطلب سمجھنے میں کچھ دیر نہیں لگی۔

"میں آنکھ دیکھی مکھی نگل نہیں سکتی...... میں انور ٹائپ کے نوجوانوں کو خوب سمجھتی ہوں...... جو بیوی کی دولت سے عیش کرتے ہیں اور دل پشوری باہر کرتے ہیں۔ انہیں بیوی کا وجود صرف مضبوط پشت پناہی کے لیے درکار ہوتا ہے اور بس!"

"رحمان صاحب ایک ہفتے سے فون پر آپ کو پوچھ رہے تھے...... میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی......" راحیلہ گفتگو کا رخ دوسری جانب کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... فون گھر پر بھی کیا تھا...... اُن کا پارلر فیل ہو گیا ہے...... کسٹمر آنے بند ہو گئے تھے...... ان کی جھگڑالو بیگم اپنے کلائنٹس بڑھانے میں ناکام ہو گئی ہیں۔"

"وہ آپ سے کیا چاہتے ہیں؟" راحیلہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"شادی......" میں ہنس پڑی۔

"رئیلی......؟" اس کا لہجہ حیرت زدہ سا تھا۔

"ہاں راحیلہ! آج کل شادیاں کاروباری انداز میں زیادہ ہونے لگی ہیں...... میرے وجود سے ان کی کمائی میں چھنا چھن اضافہ ہوگا۔ اور یہی وہ چاہتے ہیں...... ورنہ ان کی بیوی شکل و صورت کی اچھی خاصی ہیں۔ چار تو ان کے بچے ہیں۔"

"آپ نے تو ان حضرت کو خوب لتاڑ دیا ہوگا۔" راحیلہ ہنس کر بولی۔

"ظاہر ہے...... ایسی طبیعت صاف کی ہے کہ اب وہ مہینوں میرے پارلر کے سامنے سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔" میں نے فلک شگاف قہقہہ لگا کر کہا۔

"مگر میرے قہقہے کی آواز فضا میں ہی ساکت ہو کر رہ گئی...... جب میں نے پارلر میں داخل ہوتے ہوئے سطوت کو دیکھا...... کہاں تو میرے پیر اُس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تھے اور اب میں یوں ساکت کھڑی تھی جیسے کسی نے میرے پیروں میں میخیں گاڑھ دی ہوں۔ مس ناہید نے اُسے اٹینڈ کیا تھا...... وہ غالباً چہرے کا فیشل کروانے کے لیے آئی تھی......

میں نے اُسے غور سے دیکھا...... اُس کا جسم بھر سا گیا تھا...... چہرے پر سرخی پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ میں ہمت کر کے اُس کی کرسی کے پاس آ کھڑی ہوئی...... اور ناہید کو دوسرے کسٹمر کو اٹینڈ کرنے کو کہا......

"ان کا فیشل آپ کریں گی......" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں' میں کرلوں گی۔"

مگر سطوت نے میری جانب نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ وہ میری آواز سن کر بھی مجھے پہچاننے سے قاصر رہی تھی......

"فیشل کے بعد' آپ میک اپ کروانا بھی پسند کریں گی......؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں...... مجھے پارٹی میک اپ کروانا ہے۔"

"کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ تقریب کی نوعیت کیا ہوگی؟"

"ارے یونہی گیٹ ٹو گیدر کے سلسلے میں ہم جمع ہوں گے۔" وہ اپنے ہونٹ سکوڑ کر بالائی لب کا کونہ دباتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ اندر سائیڈ روم میں تشریف لے آئیں گی۔" کسٹمر کے بڑھتے ہوئے رش کو دیکھ کر میں نے اُس سے کہا......!

اور وہ خوشی خوشی میرے کمرے میں چلی آئی......

"آپ تشریف رکھیے میڈم۔" میں نے اُسے شیشے کے سامنے گھومنے والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا...... لفظ میڈم کی ادائیگی کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ وقت کتنی تیزی سے بدلتا ہے...... ایک دن وہ تھا جب یہی عورت میری ہر بات کے جواب میں تعظیماً مجھے سراہنے پر مجبور تھی

"آپ کا پارلر بہت اچھا ہے۔ پورے شہر میں اس کا ڈنکا بجا ہوا ہے۔"

"مگر آپ تو پہلی مرتبہ ہمارے پارلر میں تشریف لائی ہیں۔"

"شادی کے بعد' میں باہر چلی گئی تھی...... جب میں یہاں تھی' اُس زمانے میں' میں نے اس

پارلر کی اتنی دھوم نہیں سنی تھی...... مجھے آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔ میرے ملنے والوں نے بہت تعریف کی تو آج میں آپ کے پارلر میں چلی آئی......'' وہ کھنک دار آواز میں ہنسی......

''بہت اچھا کیا' سطوت...... کہ تم خود ہی مجھ سے ملنے آ گئیں......'' میرا لہجہ خود ہی پراسرار ہو گیا......

''ارے' آپ میرا نام بھی جانتی ہیں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''حیرت ہے' آپ مجھے ابھی تک نہیں پہچانیں......'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہوں...... آپ کی آواز' تو لگتا ہے کہ کہیں سنی ہے مگر میں نے اس سے قبل آپ کو دیکھا کبھی نہیں......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی......

''سوچیے...... شاید آپ کو یاد آ جائے......'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں جناب! مجھے قطعی یاد نہیں آ رہا کہ اس سے قبل میری آپ سے کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو تو۔ آپ کو آج پہلی دفعہ دیکھ رہی ہوں...... اس پارلر میں' میں کبھی آئی ہی نہیں......''

''حیرت ہے' اتنی جلدی' آپ مجھے بھول گئیں...... اور میرا ایک ایک دن آپ کو یاد کرتے ہوئے بیت رہا ہے......''

''کمال ہے...... نجانے آپ کیا سمجھ رہی ہیں؟ یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' چلیے آپ ہی مجھے بتا دیں کہ آپ کون ہیں......؟'' وہ چہرے پر لگائی ہوئی کریم ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے بولی......

''میں مینا ہوں۔'' میرا لہجہ تھرتھرا رہا تھا۔

''کون مینا......؟ میں نادم ہوں کہ اب بھی آپ کو نہیں پہچان سکی۔'' وہ جھینپتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''نواب مظفر احمد کو جانتی ہیں......'' میں نے تلخ سے لہجے میں پوچھا۔

''نواب صاحب کو...... جی...... جی ہاں...... ان سے کون واقف نہیں تھا......'' وہ گھبرا کر بولی......

''میں انہی کی بیوی تھی...... جس کے گھر میں نقب لگانے آپ فلیٹ ڈیزائنر کے روپ میں داخل ہوئی تھیں۔'' میں نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا......؟

''اوہ...... آپ مسز نواب ہیں......'' اس کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا۔

''ہوں نہیں...... تھی کہیے......''

''مجھے افسوس ہے کہ نواب صاحب دل کے دورے میں جاں بحق ہو گئے......'' وہ کھسیائے

ہوئے لہجے میں پُرسا دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میرے لیے تو اُسی دن مر گئے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تم سے پینگیں چڑھا رہے ہیں۔''

''اب ایک مرے ہوئے شخص کے بارے میں باتیں کرنے سے کیا حاصل؟'' سطوت کا لہجہ مصالحتی تھا۔

''مگر مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم نے اس خبیث بڈھے سے کیوں پینگیں چڑھائیں...... مگر صرف تمہاری وجہ سے' اس کمینے شخص نے میرے چہرے پر تیزاب پھینکا...... جس سے میں اپنی شکل کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہی......''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو......؟'' سطوت نے اپنی زرد ہوتی ہوئی رنگت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''جس رات نواب صاحب کو دل کا دورہ پڑا...... اس شام ہونے والی فون کی گفتگو میں سن چکی تھی...... جو وہ تم سے کر رہے تھے۔''

''مگر میں نے تو تمہارے چہرے پر تیزاب نہیں پھینکا......'' سطوت ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''مگر یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم ان کی قربت کی خواہش مند تھیں اور یہ اُسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ جب وہ مجھ سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اور اُس ذلیل شخص نے یہ اوچھی حرکت کی کہ مجھے تباہ کر کے رکھ دیا۔''

''نہیں' یہ خیال غلط ہے۔ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔''

''تم غلط بیانی سے کام مت لو سطوت' تم میرا چہرہ غور سے دیکھو...... کیا یہ ویسا رہا ہے' جب تم میرے گھر آئی تھیں؟'' میں نے اپنا چشمہ اتار کر چہرے پر لپیٹا ہوا دوپٹا کھول کر اُسے دکھایا...... آنکھوں کے نیچے کی کھال سکڑ کر سمٹ گئی تھی...... بایاں رخسار متعدد آپریشنز کے بعد دب سا گیا تھا۔

''اوہ میرے خدا...... تمہارا چہرہ کس قدر بدل گیا ہے۔'' سطوت کے لبوں سے بے اختیار ایک سسکی سی نکلی۔

''اب افسوس کرنے سے فائدہ...... تم نے تو میری زندگی تباہ کر رہی دی......'' میں اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مینا جی...... کیا آپ یقین کریں گی...... کہ میں بھی نواب صاحب کی بیگم تھی؟''

"بکتی ہو تم...... بکواس کرتی ہو۔ تم نواب صاحب کی دولت کے خواب ضرور دیکھ رہی تھیں...... مگر میری زندگی تباہ کرنے کے باوجود تمہیں یہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکی...... یہ تمہاری بد نصیبی تھی کہ نواب صاحب کی زندگی نے وفا ہی نہیں کی۔"

سطوت اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی......!

"ہاں ہوا نا افسوس...... کہ ایک دولت مند سہارے سے تم محروم رہ گئیں...... نواب صاحب کا نام تمہارے نام کا حصہ نہیں بنا...... آج تمہیں بھی تکلیف ہوئی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مینا جی آپ کچھ بھی نہیں جانتیں' کچھ بھی نہیں......" سطوت بدستور رو رہی تھی...... اُس کے آنسو میرے تڑپتے ہوئے دل کو آسودگی پہنچا رہے تھے...... میرا دل چاہ رہا تھا کہ سطوت یونہی میرے سامنے بیٹھی روتی رہے اور اس کی زندگی بیت جائے۔

"مینا جی! نواب صاحب دل کے دورے سے نہیں مرے تھے۔ ان کو زہر دیا گیا تھا۔"

"بکتی ہو تم...... قیاس ہے تمہارا...... وہ میرے سامنے دل کے عارضے میں ختم ہوئے ہیں۔"

"نہیں مینا...... میں سچ کہہ رہی ہوں...... نواب صاحب کو اُن کے بھائی نے زہر دیا تھا...... اگر اُس شب تم ان کو آواز دے بھی ڈالتیں تو بھی وہ ان کی جان بچانے کا کوئی بھی جتن نہیں کرتے۔"

"نہیں یہ جھوٹ ہے' بہتان ہے سراسر۔ ان دونوں میں بے حد محبت تھی...... وہ اپنی جائیداد کا تمام تر مختار و مالک اپنے بھائی کو بنا کر گئے...... ان کو وصیت میں سوائے بھائی کے کوئی دوسرا نام نہیں ملا...... اور اُس شب...... جب میں نے نواب منظور مرزا کو پکارا تو وہ ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے آئے تھے...... ڈاکٹر کو بھی طلب کیا گیا تھا...... مگر وہ مر چکے تھے۔"

"یہ سب ایک ناٹک تھا...... جس ڈاکٹر کو اُنہوں نے بلایا تھا وہ ڈاکٹر نہیں تھا...... بلکہ ان کا وہ خاص آدمی تھا...... جس کے توسط سے وہ رفتہ رفتہ ان کے جسم میں زہر پہنچاتے رہے تھے وہ ایک خاص قسم کا زہر تھا جو دل کی دھڑکنوں میں رکاوٹ ڈالتا تھا...... اُس کے استعمال سے ان کی خون کی نالیاں بلاک ہونی شروع ہو گئی تھیں۔"

"مگر تم یہ سب کیسے کہہ سکتی ہو؟ یہ کہانیاں گھڑنے کا تمہیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے...... شاید تم اپنے کردار کی حفاظت کے لیے ایسی بودی باتیں مجھے سنانا چاہتی ہو کہ جس سے متاثر ہو کر' میں اُس واقعے کو بھول سکوں کہ کس طرح میرے چہرے کو جھلسایا گیا۔"

"مینا...... اگر آپ میری بات پر یقین کریں تو میں آپ کو اس کہانی کا بقیہ حصہ بنانے کے

لیے تیار ہوں مگر آج نہیں...... میں جلد ہی تمہارے پاس آؤں گی......!"

"کب آؤ گی......؟" میں شاید اُس کی باتوں سے متاثر ہو گئی تھی۔

"بہت جلد۔" وہ اپنے بالوں سے اسکارف کھول کر پسینہ پونچھتے ہوئے بولی' پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

اور میں کئی گھنٹے اپنی کرسی پر ساکت وصامت بیٹھی رہی' نواب صاحب کے فون کی آواز...... میرے کانوں میں ابھی تک زندہ تھی۔

"آج کیا' پارلر بند کرنے کا ارادہ نہیں ہے......؟ آپ کے گھر سے کئی دفعہ فون آ چکا ہے۔" ناہید نے مجھ سے پوچھا۔

"اوہ...... واقعی بہت دیر ہو گئی......" میں نے ایک نظر وال کلاک پر ڈالی تو رات کے گھرے ہونے کا اندازہ ہوا۔

"سب لڑکیاں چلی گئیں......؟" میں نے پوچھا۔

"یس میڈم......!" ناہید نے مجھے بتایا۔

"اچھا...... چوکیدار سے کہو کہ پارلر بند کرے۔ میں پورچ سے گاڑی نکالتی ہوں۔"

ناہید کو ڈراپ کرتی ہوئی جب میں گھر پہنچی تو سوائے اماں کے سب سو چکے تھے۔

"حد ہو گئی ہے مینا...... یہ وقت ہے تیرے آنے کا...... دیکھ تو سہی کتنی رات بیت گئی ہے...... ڈر نہیں لگتا تجھے اکیلے آتے ہوئے۔" اماں نے غصے سے کہا۔

"ارے ڈر کی کیا بات ہے؟" مجھے اماں کے ہول پر ہنسی آ گئی۔

"اکیلی جوان جہان لڑکی رات کو اکیلی گاڑی چلاتے ہوئے گھر آتی ہے۔ کوئی تجھے راستے میں پکڑ لے' میرے منہ میں خاک' کوئی تجھے اغوا کر لے تو!"

"اماں جانی...... کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...... کس میں ہمت ہے بھلا...... جو مجھے اغوا کر سکے...... ایسا کوئی ماں کا لال ابھی پیدا نہیں ہوا اماں......"

"اری...... تیزاب بھی تیرے منہ پر اُن ہمت والوں نے ہی بیچ بازار میں اور دن ہاڑے پھینکا تھا...... ایسے کمینے لوگ بہت کچھ کر سکتے ہیں...... سب جانتے ہیں کہ تو ماہانہ ہزاروں روپے کما رہی ہے......"

"اچھا' آج کی کوئی خاص بات ہو' وہ جلدی سے سنا ڈالیئے......" میں' اے سی کو میڈیم پر کرتے ہوئے ٹانگوں پر کمبل ڈالتے ہوئے بولی۔

"آج اشرف کی اماں آئی تھیں...... وہ تیرے لیے بہت خوشامدیں کر رہی ہیں......"

"کیا انھوں نے میرا شاندار بیوٹی پارلر دیکھ لیا ہے۔۔۔۔۔" میں تمسخر سے بولی۔

"پاگل ہے تُو' سیدھے سادے لوگ ہیں وہ۔۔۔۔۔ اُن کی تو کسی بہو بیٹی نے پارلر کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔"

"پلیز اماں۔۔۔۔۔ کچھ عرصے تک۔۔۔۔۔ آپ اشرف' شاکر اور انور کی کہانیاں مجھے سنانا بند کر دیں۔۔۔۔۔ ہو چکی میری شادی۔۔۔۔۔ دیکھ لی۔۔۔۔۔ برت لیا۔۔۔۔۔ میں نے شوہر کی محبت۔۔۔۔۔ ایمان سے اماں۔۔۔۔۔ مجھے تو اتنی محبت ملی ہے کہ میرا دل ابھی تک لبالب بھرا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اُس میں گنجائش ہی نہیں کہ کسی دوسری محبت کو جگہ دے سکوں۔ مجھے اتنی محبتیں ملی ہیں کہ اس کے طفیل ساری زندگی گزار سکتی ہوں۔ اپنے حسن کی داد بھی ایسی وصول کی ہے کہ ابھی تک اس کے نقوش میرے چہرے' میرے دل پر ثبت ہیں۔"

☆☆☆

اور پھر واقعی سطوت میرے بیوٹی پارلر پر نہیں آئی۔۔۔۔۔ میں اُس کا انتظار کر کر کے تھک گئی۔

اس دن بھی شاید میں اپنی کلاس میں تھی کہ ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"مجھے میڈم مینا سے ملنا ہے۔۔۔۔۔" میری غالباً پشت تھی؟

"آپ آفس سے فارم وغیرہ لے آئیں۔۔۔۔۔" میں نے دیکھے بغیر کہا۔۔۔۔۔ ایڈمیشن لینے والی لڑکیاں۔۔۔۔۔ کلاسوں تک چلی آتی تھیں جو مجھے ہمیشہ نامناسب لگا کرتا تھا۔

"مگر میناجی۔۔۔۔۔ میں تو صرف آپ کے پاس آئی ہوں۔" مجھے سطوت کی آواز سنائی دی۔

"سطوت تم۔۔۔۔۔" میں نے مڑ کر اُسے خوش دلی سے دیکھا جیسے وہ کہیں کھو کر مجھے ملی ہو۔

"ہاں۔۔۔۔۔ مینا۔۔۔۔۔ میں اپنے وعدے کے مطابق آ گئی ہوں۔"

"ناہید۔۔۔۔۔ پلیز تم ذرا یہ کلاس لے لو۔۔۔۔۔ میں اپنی مہمان کے ساتھ مصروف ہوں مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔۔۔۔۔" میں انٹر کام پر ہدایت دیتی ہوئی سطوت کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

سطوت کو دیکھ کر' میں یوں خوش ہو رہی تھی جیسے وہ میری دشمن نہ ہو۔

"میناجی۔۔۔۔۔ میں آپ سے استدعا کروں گی کہ آپ کو میری باتوں کا یقین کرنا ہوگا۔ اگر میں جھوٹی ہوتی تو آپ کے پاس دوبارہ آنے کی جرأت نہیں کرتی۔۔۔۔۔!"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ مگر میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میرے دماغ سے نواب مظفر کی وہ باتیں نہیں نکلتیں جو وہ فون پر تم سے کہہ رہے تھے۔"

"اچھا' میری باتیں بھی سُن لو۔۔۔۔۔ بے شک یقین نہ کرنا۔۔۔۔۔"

"ہاں' کہو۔۔۔۔۔" میں اُس کی جانب پوری متوجہ تھی۔

"میں نواب مظفر کی پہلی بیوی تھی۔۔۔۔۔ یہ دیکھو نکاح نامہ۔" اُس نے اپنی فائل میں سے نکاح نامہ نکال کر دکھایا۔

"کمال ہے۔۔۔۔۔ تمھاری شادی مجھ سے پہلے ہوئی۔۔۔۔۔" اب میری حیران ہونے کی باری تھی۔

"صرف اسی شہر میں دس بارہ عورتیں ہوں گی جو نواب صاحب کی بیوی ہونے کا اعزاز حاصل کر سکی ہیں اور بے شمار بغیر شادی کے۔۔۔۔۔ اُن کے ساتھ رہتی تھیں۔"

"اعزاز یا ذلت۔۔۔۔۔" میں پھنکاری۔

"ہاں کچھ بھی کہو۔۔۔۔۔ اُنھیں خوبصورتی متاثر کرتی تھی۔۔۔۔۔ حسین لڑکیوں سے شادی کرنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔۔۔۔۔ اُن کے لیے ہر لڑکی کا انتخاب اُن کے چھوٹے بھائی نواب منظور مرزا نے کیا۔"

"نہیں یہ جھوٹ ہے' میرا انتخاب سو فی صد نواب مظفر نے خود کیا تھا۔ میرا ڈراما دیکھ کر وہ میرے حسن کے آگے دل ہار گئے تھے۔"

"مت بھولو کہ تمھارا وہ ڈراما کئی ہفتے سے چل رہا تھا۔ نواب منظور اُن سے قبل ہی دیکھ چکے تھے۔۔۔۔۔ انھوں نے از خود انھیں وہاں بھیجا تھا۔"

"مگر وہ ایسا کیوں چاہتے تھے۔۔۔۔۔؟"

"وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کروڑوں روپوں کی جائیداد کی جانب نواب مظفر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں۔۔۔۔۔ وہ بھائی کے شغل سے واقف تھے۔"

"تم ان کی بیوی تھیں۔۔۔۔۔ خوبصورت بھی تھیں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں باز رکھا اُن کو۔۔۔۔۔؟"

"میرا تعلق ایک کچی آبادی کے گھرانے سے تھا۔۔۔۔۔ میرے پیسے سے میرے گھر کے چودہ لوگوں کا پیٹ پل رہا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر میں نواب صاحب کی بیوی تھی۔۔۔۔۔ کوئی داشتہ نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ میرا وجود وہ کسی کے سامنے لاتے ہوئے گریز کرتے تھے۔۔۔۔۔ مگر ہماری کچی آبادی میں بہر حال وہ دولہا بن کر آئے تھے جس سے مجھے اپنے کنبے میں عزت حاصل تھی مگر مجھے وہ حقوق حاصل نہیں تھے جو متوسط طبقے کی بیویوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ میں کسی قسم کی روک ٹوک کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ تم سے شادی کرنے کا منصوبہ انھوں نے میرے سامنے بیٹھ کر بنایا تھا۔"

"حیرت ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جب تم بیوی تھیں۔۔۔۔۔ اور اپنے حقوق کے لیے تو اپنی آواز بلند نہیں کر سکتی تھیں۔۔۔۔۔ مگر یہ دیکھ کر خوش ہوئی تھیں کہ دوسری عورتوں پر تیزاب پھینکا جائے غالباً یہ منصوبہ بھی تمھارے سامنے بیٹھ کر بنایا گیا ہوگا۔۔۔۔۔ یا تم نے خود ہی سوچا ہوگا۔۔۔۔۔ بالآخر میں

تمہاری سوت تھی...... تمہارے اوپر آئی تھی...... تمہیں مجھ سے کسی قسم کی محبت تو ہونے سے رہی......"

"خدا گواہ ہے کہ اس بارے میں میں بالکل لاعلم تھی...... نواب مظفر جتنے خبیث آدمی تھے...... تم سوچ بھی نہیں سکتیں مجھے تو یہ جان کر ازحد تاسف ہوا تھا جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُن کے آدمیوں نے تمہیں جھلسا ڈالا......"

"حیرت ہے کہ سوکن کی تکلیف پر رنج بھی ہو سکتا ہے۔" میں بے اختیار ہنس دی۔

"میں بیوی ہوتے ہوئے بھی بیوی کہاں تھی...... وہ تو شادی کی آڑ میں مجھے رکھیل سمجھے ہوئے تھے۔"

"نواب صاحب کو اولاد کی اتنی خواہش تھی...... تم نے کیوں نہ اُن کے دو چار سپوت پیدا کر دیے...... تاکہ تمہاری حیثیت بھی مضبوط ہو جاتی اور اُن کا دل بھی بچوں میں اٹک جاتا۔"

"کاش میں ایسا کر سکتی...... مگر خدا غارت کرے نواب منظور کو...... شادی کے ابتدائی دنوں میں میری طبیعت ناساز ہوئی تو نواب صاحب کی فیملی ڈاکٹر جس کا تعلق نواب منظور سے تھا...... اُس نے مجھے ایسے انجکشن لگائے جو مجھے بانجھ بنانے کے لیے کافی تھے۔"

"ایسے انجکشن تو میرے بھی لگے تھے۔ حالانکہ میری تو طبیعت بھی ناساز نہیں ہوئی تھی۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مینا جی...... یہ سب نواب منظور کی چالیں تھیں...... وہ اُن کے سوتیلے بھائی تھے...... بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کے والد نے ان کو لے کر پالا تھا...... نواب مظفر ذلیل اور کمینی خصلتیں رکھنے کی باوجود اپنے بھائی سے بے حد محبت کرتے تھے اور اُن کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے کے عادی بھی تھے...... شاید اس لیے کہ بھائی کے علاوہ انھوں نے کسی کی محبت حاصل ہی نہیں کی تھی اور اولاد ہونے کی صورت میں یقیناً اُن کی محبت کے سوتے اپنی اولاد کی جانب مڑ جاتے اور ان کے بچے ان کی جائیداد کے قانونی وارث کہلاتے اور نواب منظور کسی صورت میں یہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد اُن کے علاوہ کسی اور کو ملے۔"

"پھر تو اس قسم کے انجکشن اُن تمام خواتین کے لگے ہوں گے جو نواب مظفر کے عقد میں آئی ہوں گی......؟"

"ہاں...... بالکل یہی ہوا...... یہ گناہ نواب منظور کے ہی سر جاتا ہے۔ مگر ان تمام باتوں سے مسز چغتائی آگاہ ہو گئی تھیں...... انھوں نے کبھی اس لیڈی ڈاکٹر کے ہاں بطور آیا کے بھی ملازمت کی تھی...... وہ جانتی تھیں کہ اُس ڈاکٹر کا روزگار کس قدر گھناؤنا ہے۔"

"مسز چغتائی کا اس معاملے سے کیا تعلق تھا......؟" میں سانس روک کر بیٹھ گئی۔

"وہ اس لیے کہ نواب مظفر نے پہلی دفعہ اپنے بھائی کو بتائے بغیر مسز چغتائی سے شادی کی۔ وہ مسز کا اضافہ از خود کرتی تھیں تاکہ کسی شبہ نہ ہونے پائے۔"

"اس قدر بدصورت عورت سے انھوں نے کیسے شادی کر لی...... اُن کی بدصورتی نے انھیں کیسے متاثر کر لیا......؟"

"تم یہ سمجھو...... عموماً کالے کلوٹے، کم شکل کے مرد خوبصورت بیوی کے خواہاں ہوتے ہیں اور خوبصورت مرد قبول صورت لڑکی کو بھی بصد خوشی قبول لیتے ہیں۔ نواب مظفر کی تو داشتائیں تک حسینائیں تھیں اور بیویاں ایک سے ایک چھانٹ کر حسن کے پلڑے میں تلنے کے قابل تھیں تب انھوں نے سیاہ رنگت کی مس چغتائی (جو مسز چغتائی کہلاتی تھی) سے شادی رچالی اس شادی کے لئے رازداری کی شرط مس چغتائی نے خود رکھی تھی کہ وہ نواب منظور کے کردار سے واقف ہو گئی تھیں۔"

"پھر کیا ہوا......؟" میرا سانس رُکنے لگا تھا......

"ہونا کیا تھا...... مس چغتائی حاملہ ہو گئیں...... مگر ان کی رازداری کی شرط بدستور چل رہی تھی...... "مسز چغتائی کا سرورق اُن کا پردہ بھی رکھے ہوئے تھا مگر نواب مظفر نے خوش ہو کر یہ راز بھائی کے سامنے ظاہر کر دیا تھا کہ اب تم چچا بننے والے ہو...... نواب منظور مرزا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے...... انھوں نے تین دن کے اندر اندر زہریلی دوا اپنے ملازم کے ذریعے نواب مظفر کے حلق سے اتار دی......"

"تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا......؟"

"آخری دن...... انھوں نے مسز چغتائی سے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ وہ اب اس راز کی زیادہ پاسداری نہیں کر سکتے...... انھوں نے یہ بات اپنے بھائی کو بتا دی ہے...... یہ بات سن کر وہ تو اُسی وقت حواس باختہ ہو گئیں...... اور اُنھیں اپنی بدقسمتی کا یقین ہو گیا تھا......! وہ بچے کی جان بچانے کے لیے اپنے فلیٹ سے روپوش بھی ہو گئیں۔

اور جب وہ اپنے نومولود بیٹے کو لے کر آئیں تو نہ صرف نواب مظفر ختم ہو چکے تھے۔ بلکہ اُن کے بھائی منظور تمام تر جائیداد بیچ باچ کر بیرون ملک سدھار چکے تھے۔"

"تم واقف ہو اُن سے......؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ میری پرانی واقف کار ہیں۔ وہ میری حیثیت سے واقف تھیں۔ یہ سب باتیں انھوں نے مجھے خود بتائیں۔"

''اُف خدایا...... اس دنیا میں کیسے بہروپیے موجود ہیں۔ خدا غارت کرے نواب منظور کو...... کتنے گھرانوں کی لڑکیاں اُن کے ستم کا نشانہ بنیں۔ کاش مظفر اپنی ٹکر کی کسی لڑکی سے شادی کر لیتے تو ایک ہی کہانی ہر ایک لڑکی کے ساتھ نہ دہرائی جاتی۔''

''دولت کی کشش غریب گھرانوں کو زیادہ چکا چوند کرتی ہے۔ اسی لیے اُن کا نظرِ انتخاب اسی ٹائپ کے گھرانے رہے۔''

''کچھ پتہ بھی ہے' نواب منظور کس ملک بھاگ کر گئے؟''

''ہاں۔ معلوم کیوں نہیں ہے۔ پیسے کے بل بوتے پر انھوں نے امریکی شہریت حاصل کر لی۔ وہ ٹیکساس میں رہتے ہیں۔''

''اور تم اتنے عرصے باہر کس ملک میں رہیں؟''

''میں بھی ٹیکساس میں تھی۔ حال ہی میں اپنے والدین سے ملنے آئی ہوں۔ میرے شوہر ابھی بھی ٹیکساس میں ہی ہیں۔''

''نواب منظور سے کبھی تمہاری ملاقات ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... مینا...... میری تو ان سے روز ہی ملاقات رہتی ہے؟''

میں نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''وہ اس لیے کہ نواب منظور میرے موجودہ شوہر ہیں۔ نواب مظفر کے انتقال کے بعد انھوں نے مجھ سے شادی کر لی تھی۔''

''اور تم نے کر لی......؟'' مارے غصّے کے میرا بُرا حال تھا۔

''پھر کیا کرتی...... نواب مظفر نے مجھے کون سے سکھ پہنچائے تھے۔ تعلیم میرے پاس نہیں...... بانجھ مجھے بنا دیا گیا تھا...... خالی صورت لے کر میں چاٹتی۔ یا در در کھٹکھٹاتی پھرتی۔''

''پھر بھی سوچو کہ وہ کس قدر خبیث شخص ہے۔'' مارے غصّے کے میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔

''ہاں وہ تو ہے۔'' وہ ہنس دی۔

''گویا پیسے کی کشش نے یہاں بھی رنگ دکھایا۔'' میں جل کر بولی۔

''کچھ بھی کہو مینا جی...... میں اس حقیقت سے نظریں کسی صورت نہیں چرا سکتی کہ میری دس بہنیں ہیں۔ میری شادی کے بعد میرے باپ پر فالج کا اٹیک ہو گیا...... میری ماں گٹھیا کی مریض...... بوڑھے دادا' دادی کا ساتھ...... جس کا کوئی بھائی نہ ہو...... دو پیسے کی کہیں سے آس نہ ہو۔ وہ بدترین ماحول میں بھی گزارا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''بدترین زندگی کہاں' تم تو عیش کر رہی ہو۔'' میرے لہجے میں ناگ پھنکار رہے تھے۔

''یہ تم کہہ رہی ہو۔ نواب منظور بدترین خصلت کا حامل شخص ہے۔ اُس کے نچلے دھڑ پر فالج ہو گیا ہے۔ وہ ہمہ وقت ڈھیل چیئر پر بیٹھا غلیظ گالیاں بکتا رہتا ہے۔ کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ اپنی دوا سات تالوں میں رکھتا ہے۔ خود ہی پیتا ہے۔ اپنا کھانا خود سامنے بنوا کر کھاتا ہے۔ شک اور وہم نے اُس کے اعصاب تباہ کر دیے ہیں۔ قدرت اُس کے اعمال کی سزا دے رہی ہے...... اور جب وہ بلک بلک کر روتا ہے...... تو مت پوچھو مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ اُس سے میرا ناچنے کو دل کرتا ہے۔''

''تمہارے ماں باپ خیریت سے ہیں......؟''

''ہاں وہ سب لوگ عیش و عشرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں...... بلکہ میں نے پندرہ لاکھ روپیہ اُڑا کر مسز چغتائی کو بھیجا...... اب وہ اور اُن کا بچہ سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔''

''تم اُن بے آسرا عورتوں کی مدد بھی کرو جنھیں نواب مظفر نے طلاق دے کر دربدر کیا۔ اس پیسے پر آخر اُن کا بھی حق بنتا ہے۔''

''ہاں' میں ایسا ضرور کروں گی۔ میرا پاکستان آنے کا مقصد ایک یہ بھی تھا کہ اُن بے کس اور بے بس عورتوں کو تلاش کروں جو نواب منظور کی سفّاکی کا لقمہ بنیں......؟ مینا اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات تم سے بھی کہوں۔'' سطوت رک رک کر...... ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''ہاں...... ہاں...... کہو......'' میرا دل اُس کی جانب سے قطعی صاف ہو چکا تھا۔

''اگر تمہیں ناگوار نہ گزرے...... تو میں امریکہ میں تمہارے چہرے کی پلاسٹک سرجری پر دس لاکھ روپے خرچ کر سکتی ہوں۔''

''مگر کیوں بھئی...... تم ایسا کیوں چاہتی ہو......؟'' میری ہنسی رُکنے میں نہیں آ رہی تھی۔

''نقصان تو بہرحال تمہارا بھی ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم پھر پہلے جیسا حسن دوبارہ حاصل کر لو۔''

''بہن سطوت' میں ایسا نہیں سوچتی...... یہ حسن اور یہ جوانی ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں...... تو پھر لاکھوں کا زیاں میں کیوں کروں......؟''

''مگر قصوروار تو نواب منظور اور نواب مظفر ہی تھے۔''

''بہن سطوت' کچھ قصوروار میں بھی ہوں۔'' میں ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جس حسن پہ ناز کرتی ہوں' وہ سب عارضی ہے۔ محض دکھاوا ہے میں نے اس تعلیم کو بھلا دیا تھا جس میں واضح طور پر غرور کرنے والوں کے لیے تنبیہہ کی گئی ہے بلکہ میں تو اپنے حسن کا خراج راہ چلتوں سے وصول کرنے کی عادی تھی۔ نوجوانوں کی فلائنگ کس...... مہکتے

جملے...... میرے رخساروں کی سُرخی مزید گہری کر دیتے تھے...... میرا مان بڑھا دیتے تھے۔ میں ان تقریبات میں زیادہ شرکت کرتی تھی...... جہاں کا شریک ایک ایک مہمان میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا۔ اُن بازاروں میں جان بوجھ کر جاتی تھی' جہاں مجھے دیکھ کر آوازے لگتے۔ منچلے فلمی گیت گاتے...... ایک دوسرے کے ٹہوکا مار کر میری جانب متوجہ کرتے...... اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر دُہرے ہو جاتے۔ ایک آنکھ داب کر وِش کرتے...... تب میری چال میں نخوت آ جاتی۔ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ ایک نغمگی پیدا کر دیتی...... دھجی سا دوپٹہ بائیں شانے سے ڈھلک کر زمین پر گرنے لگتا...... اور میں اپنی کافرانہ اداؤں پر غور کیے بغیر تنی ہوئی چلی جاتی...... مگر اس جھلسے ہوئے چہرے نے جہاں بہت کچھ مجھے سکھایا...... وہاں یہ آداب بھی سکھا ڈالے ہیں......"

"تمہارے جواب نے تو مجھے لاجواب کر دیا' ورنہ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی......" سطوت اپنا دوپٹا سینے پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"کیا سوچ رہی تھیں تم۔" میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"میرا خیال تھا کہ میری اس پیشکش کے جواب میں تم ایک اینٹ میرے سر پر مار دو گی۔"

"وہ کیوں بھلا......؟"

"میرا خیال تھا کہ تم تنک کر یوں کہو گی...... اے سطوت' تم دس لاکھ مجھ سے لے لو۔ مگر اس کے طفیل اپنے نواب منظور کے ایک زہر کا انجکشن لگا دو۔"

"خدا نہ کرے کہ میں کسی کی جان لوں۔ خدا کا صد شکر ہے کہ نواب مظفر بھی میرے ہاتھوں نہیں مارے گئے...... ورنہ مجھے ندامت تھی اپنے سلوک پر۔" میں نے کہا۔

"اب میں چلوں......" سطوت اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا خدا حافظ......" میں اُسے باہر تک چھوڑنے آئی۔

آج میرا ذہن ہلکا تھا۔ پچھتاوے کی آگ سرد ہو چکی تھی۔ "ناہید تم پر پارلر بند کرا کے چلی جانا۔" انٹرکام پر ہدایت دے کر میں گھر چلی آئی...... بہت عرصے کے بعد میرے لب خود ہی کچھ گنگنا سے رہے تھے۔

"ارے۔ آج میری مینا اتنی جلدی آ گئی......" لتاں مجھے سرِ شام گھر میں دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئیں۔

"گھر میں کوئی آیا ہوا ہے کیا؟" ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں کو سن کر میں نے پوچھا۔

"ہاں اشرف کے گھر والے آئے ہوئے ہیں۔"

"منع کروانے کے باوجود آ گئے۔ بڑے ڈھیٹ ہیں۔" مجھے ہنسی آ گئی۔

"بھئی میں نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم لوگ لڑکی کی کمائی کی وجہ سے شادی کر رہے ہو۔ ہمیں ایسی شادی نہیں کرنی۔" لتاں سادہ لوحی سے بولیں۔

"پھر کیا کہا انھوں نے...... آپ لڑکی اپنے گھر بٹھالیں۔ صرف بیوٹی پارلر سے شادی کر دیں۔" میں نے لتاں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"پاگل ہے بالکل......" لڑکے نے کہا تھا۔ "شادی کے بعد نہ انھیں اپنے پارلر جانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ہمیں بیوٹی پارلر سے مطلب۔ بے شک وہ پارلر اپنی کسی بہن یا والدہ کے نام کر دیں۔ ہمیں صرف لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ غریب ضرور ہیں مگر پہلے اُسے کھلائیں گے' بعد میں خود کھائیں گے۔"

"پھر تو لتاں لوگ ٹھیک ہی ہیں...... آپ فوراً ہاں کر دیجئے ناں۔" میں لتاں کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اوپر اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

اور لتاں خوشی سے سرشار مہمانوں کو رضا مندی دینے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئیں۔

❀❀❀

جیون اک امتحان

گو بات کافی پرانی ہے۔

مگر اتنی پرانی بھی نہیں کہ اس بات سے وابستہ افراد اس دُنیا میں نہ ہوں۔ اس کہانی میں جن لوگوں کا ذکر ہے' ماشاء اللہ (ایک آدھ کے سوا) سب ہی حیات ہیں۔ اور تمام کے تمام شہر کراچی میں موجود ہیں۔

ہوش سنبھالتے ہی یہی سننے میں آیا تھا کہ ہمارے خاندان میں کافی سورما گزرے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان سورماؤں کا تعلق ہوائی' بّری اور بحری فوجوں سے نہیں بلکہ لشکرِ عشق سے ہے۔

میرے نزدیک عشق کا میدان بھی ہوائی برّی اور بحری افواج کے میدانوں سے کم نہیں۔

عشق ایک فل ٹائم جاب ہے' جس میں ایک لمحے کی چھٹی نہیں مل سکتی۔ (بہر حال یہ میرا قطعی ذاتی خیال ہے جس سے آپ کا متفق ہونا ضروری نہیں)

ہاں' تو میں ذکر کر رہی تھی اپنے خاندان کے سورماؤں کا!

یوں' تو ہمارا پورا خاندان ہی عاشقوں کا تھا۔ سیدھی سادی ارینج میرج ان لوگوں کی ہوئی تھی جو خاندان بھر میں مُنہ لگانے کے قابل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ (بزدل اور کمزور تھے)

آج بھی سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ کیسے کیسے عشق ہمارے خاندان میں ہوئے۔

اگر ہیر رانجھا' سسّی پنوں اور لیلیٰ مجنوں حیات ہوتے تو یقیناً ہمارے خاندان کے عاشقوں کے آگے پانی بھرتے۔

سنا تھا کہ ہماری نانی جان' شادی سے قبل ہندوؤں کی ایک اونچی ذات سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے بھائی کمشنر اور والد سیاست کے منجھے ہوئے مہرے تھے۔ نانی کملا دیوی دہلی کالج میں پڑھا کرتی تھیں ہمارے نانا اس زمانے میں محکمہ تعلیم میں افسر کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ کالج میں انسپکشن ٹیم کے ساتھ گئے اور یونین کی صدر مس کملا دیوی کے چرنوں میں دل

ہار آئے۔ کملا دیوی کو مسلمان کرنے اور ہندوستان سے پاکستان لانے میں انھیں کتنے پاپڑ بیلنا پڑے' یہ ایک الگ کہانی ہے۔ مگر ایک اندازے کے مطابق اس شادی پر متعصب ہندوؤں نے بڑا واویلا مچایا تھا اور نانا کے محلے کوچہ چیلان میں کوئی بیس مسلمان شہید کیے گئے تھے۔ مگر ہم نے اپنی نانی جان کو قدسیہ بیگم کے روپ میں دیکھا۔ جو رنگین غرارہ اور سفید چکن کا کُرتا پہنا کرتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ تسبیح ہوتی تھی۔ (شادی کے بعد کملا دیوی کے سراپے کی کوئی نشانی انھوں نے اپنے پاس نہیں رکھی تھی۔)

یہی حال دادا کا تھا۔ غصہ' گالی گلوچ اور عشق کرنے میں کبھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ سومنات پر تو صرف سترہ ہی حملے ہوئے تھے مگر ہمارے دادا نے اٹھارہ عشق کیے۔ چھوٹے موٹے رومانس کو تو وہ گنتی میں ہی نہیں لاتے تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان کے سارے عشق ان کی جائے رہائش سے خاصے فاصلے کے شہروں میں ہوئے مگر ان کی شادی پڑوس کی گلشن آرا سے ہوئی جو اُن کے دوست کی بہن بھی تھیں اور حسن و ذہانت سے مالا مال بھی۔

امی اور ابا جان کی شادی ان کی شاعری کی وجہ سے ہوئی۔ دونوں اپنے اپنے کالجوں کے شاعر تھے۔ امی اپنی غزل میں اپنے دل کا حال' کالج کے مشاعروں میں پیش کرتیں تو ابا اپنا حال یوں ان دونوں کو اوّل اور دوم انعام بھی ملتا۔ اور دل کی راہیں بھی متوازی ردھم پر چلتیں۔ (ان دنوں مشاعرے' عاشقوں کی خاصی مدد کیا کرتے تھے) امی بے حد خوبصورت تھیں۔ ان کے خاندان کے تمام تر لڑکے' ان کی حصول یابی کے خواہشمند تھے مگر ابا جان غیر خاندان کے ہونے کے باوجود عشق کی یہ بازی جیت گئے۔ (آخر دادا کا نام بھی تو اونچا رکھنا ہی تھا۔)

ہم نے یہ سنی سنائی کہانیاں سمجھنے کے بعد اپنی امی سے پوچھا تھا کہ آپ نے ابا جان سے کیونکر شادی کر لی؟ جب کہ آپ کے خاندان میں ایک سے ایک دولت مند لڑکے تھے جو آپ سے شادی کے خواہش مند بھی تھے۔

تب امی نے انتہائی سادگی سے ہمیں بتایا تھا۔

محمود گالف کے بہت اچھے کھلاڑی تھے' گھڑ سواری بھی جانتے تھے' جب کہ ہمارے خاندان کے لڑکے کبوتر باری اور تاش جیسے لیچڑ کھیل کھیلا کرتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ محمود نماز' روزے کے بے حد پابند تھے۔ مجھے ان کے' انھی اوصاف نے متاثر کیا تھا۔

تب ہماری نظر میں دادا کے وہ اٹھارہ عشق گھوم گئے کہ یقیناً انھوں نے بھی عام روش سے ہٹ کر ڈگر اپنائی ہوگی۔ ورنہ اس زمانے میں ایک ناکام عشق کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سننے میں تو یہاں تک آیا تھا کہ انڈیا میں ایک فلم ''تن ڈولے'' کی تمام تر کہانی ہمارے دادا کی

روداد عشق سے ماخوذ تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس میں اصل ہیرو، ہیروئن کی جگہ نرگس اور پردیپ کمار تھے۔ (دادا، دادی نے کوئی رول ادا نہیں کیا تھا گو کہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو حقیقی اداکاری کے باعث یقیناً انھیں آسکر ایوارڈ ملتا جس کا انھیں ملال ہو نہ ہو، مگر ہمیں ضرور تھا کہ بین الاقوامی شہرت ہمارے خاندان میں آتے آتے رہ گئی۔)

ابا جان اور امی کی وجہ سے، ہمارا گھرانا خاصا مذہبی سا تھا۔ نماز کی عادت ہمیں بچپن سے ہی تھی۔ رمضان کا انتظار ہم سارا سال ہی کیا کرتے تھے۔ ہمارے ہوش سنبھالنے سے جوانی تک کا وقت خاصا خاموشی سے گزرا تھا۔ شاید اس لیے کہ چھوٹے موٹے 'عشق' پننے سے پہلے ہی شادی کی بھینٹ چڑھتے رہے۔

ہمیں اس امر پر بھی خاصی حیرت تھی کہ اہل خاندان کے عشق کا خانہ شادی کے بعد بھی خالی دکھ رہے تھے۔ (وہ محبتیں، چاہتیں، لگاوٹیں قصہ پارینہ بن چکی تھی)

''یہ سب ناقص غذا اور ملاوٹی چیزیں کھانے کا اثر ہے کہ اب عشق بھی گہرا نہیں رہا۔'' میں ہنس کر کہتی۔

''ہاں آپی، لگتا یہی ہے کہ اب لوگوں کے پاس رومانس کرنے کرانے کے لیے ٹائم نہیں ہے۔'' وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں کہتی۔

عشق کرنیوالے لوگ اسے بڑے مقدس سے لگا کرتے تھے۔ مگر خاندان کے لڑکےلڑکیوں میں تازہ ترین کوئی ایسا نام نہیں تھا جو افقِ عشق پر سورج بن کر چمکتا۔ (تب میں اور تانیا ماضی کی شاہکار داستانوں پر فخر کرلیا کرتے)

''شاید اب لوگ ناسمجھی کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ عشق کو عشق ہی نہیں سمجھتے۔'' میں تانیا کے ساتھ مذاق میں کہتی۔

جس کے جواب میں وہ حسرت سے آہیں بھرتی۔

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ خوبصورت ترین والدین کی اولادیں نہ صرف معمولی شکل کی تھیں بلکہ تانیا کی کمر میں ہلکا کب اور میرے پیر میں اچھا خاصا لنگ تھا۔ ہاں، شجاع بھائی دُبلے پتلے ضرور تھے مگر خدانخواستہ ان میں کوئی جسمانی عیب نہیں تھا۔

امی اور ابا جان کو تو جیسے ہم دونوں بہنوں کا یہ عیب ایک غم کی طرح چمٹ گیا تھا۔ جب کہ ہم دونوں ان باتوں کو ہنسی میں اُڑا دیتے تھے۔ ہم دونوں بہنیں امی اور ابا جان کو مغموم دیکھ کر انھیں اپنی پُرمزاح باتوں سے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ ہر وقت خوش رہتے۔ مگر تنہائی میں لیٹ کر ہمارا واحد غمگسار ہمارا تکیہ ہوتا جس کے سینے پر سر رکھ کر ہم دل کھول کر روتے۔

خاندان کے حسین لڑکےلڑکیوں کے درمیان ہم دونوں بہنوں کا معمولی وجود انتہائی غیر اہم نظر آتا تھا۔ بڑی خالہ کے سات لڑکے تھے۔ اور چھوٹی خالہ کے پانچ مگر وہ اپنی بہوؤں کی تلاش دور دراز کے رشتے داروں میں کر رہی تھیں۔ یہی حال ماموؤں اور تایاؤں کا تھا۔ گھر میں لڑکے ہونے کے باوجود، کوئی رشتہ ہمارے لیے نہیں آ رہا تھا۔

یوں تو امی خاصی صحت مند تھیں مگر دل کی بیماری، صرف ہماری وجہ سے انھیں ہوئی تھی۔

''میری لڑکیوں سے کون شادی کرے گا؟'' یہی ایک خیال ہمہ وقت ان کے ذہن پر کوڑے برساتا رہتا۔

ہم خود یہ محسوس کرتے تھے کہ ابا جان اگر کسی بات پر ہنستے ہوئے ہم دونوں کو دیکھ لیتے تو ان کی ہنسی راستے میں ہی دم توڑ دیا کرتی تھی اور کھلکھلاتا چہرہ مُرجھا سا جاتا تھا۔

وحید کرمانی ابا جان کے پرانے دوست بھی تھے اور غمگسار بھی۔

بھائی کو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ جہیز کے ساتھ کچھ نقد رقم بھی دے دی جائے تو غریب گھرانوں کے لڑکے مل جاتے ہیں۔ تم اچھا جہیز بناؤ اور پیسے جمع کرو، میں غریب مگر تعلیم یافتہ لڑکوں کو ذہن میں رکھوں گا۔ تاکہ تانیا اور ملیحہ کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔

''اگر تانیا اور ملیحہ کا مسئلہ اس صورت میں حل ہو جائے تو کوئی بُرا نہیں ہے۔'' ابا جان نے یہ بات شجاع بھائی کو بڑے خوش ہو کر سنائی۔

''آپ غم کیوں کرتے ہیں، میں جمع کروں گا پیسہ اپنی بہنوں کے لیے۔'' انھوں نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

اور پھر وہ واقعی پیسہ بنانے کی مشین بن گئے۔ آفس، پارٹ ٹائم اور پھر کسی کی دکان پر بیٹھنا۔

امی نے گھر کے اخراجات میں کمی کرنی شروع کر دی۔ حد تو یہ تھی کہ پارٹ ٹائم ملازمہ تک کو علیحدہ کر دیا۔ اور سارا گھر کا کام خود کرنے لگیں۔ شجاع بھائی جب تھکے ہارے گھر آتے تو ہم دونوں بہنیں اپنے آپ کو مجرم سا سمجھنے لگتیں۔

''گھر کی خوشیوں کو نظر صرف ہماری وجہ سے لگی ہے۔'' تانیا افسردگی سے کہتی۔

''اگر ہم دونوں نہ ہوتے تو یہ گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوتا۔'' میں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

''ملیحہ! اگر ہم دونوں خودکشی کرلیں تو سارا کھڑاگ ختم ہو جائے گا۔'' ایک دن تانیا نے بڑے چپکے سے مجھ سے کہا۔

"ہُشت، ایسی بات سوچنا بھی نہیں۔" مارے خوف کے میں زرد پڑ گئی۔

"اچھا، مرنے سے ڈرتی ہو؟" وہ بے خوفی سے ہنسی۔

"نہیں پگلی، یہ بات نہیں ہے۔" مجھے اس کی ذہنی کیفیت سمجھتے ہوئے رونا سا آ گیا۔

"یقیناً یہی بات ہے۔" اس نے مجھے گھورا۔

"نہیں تانیا، یہ بات نہیں۔" میری آواز، مجھے اپنی نہیں لگی۔

"ارے میری ڈرپوک باجی! سو فیصد یہی بات ہے۔" اس نے تمسخر سے مجھے دیکھا۔

"تانیا، کیا تم یہ چاہو گی کہ امی، ابا ہمارے غم میں مر جائیں، یا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔" میں نے پیار سے پوچھا۔

"ملیحہ باجی! ہمارے مرنے کے بعد تو سب کے مسائل حل ہو جائیں گے۔" اس نے آنکھیں بند کر کے غم سے نڈھال لہجے میں کہا۔

"یہی تو تمہاری نادانی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا لوگ ہماری موت کے دس غلط مطلب اخذ کریں گے۔ امی، ابا جان وضاحتیں کرتے کرتے تھک جائیں گے۔ امی ویسے ہی دل کی مریضہ ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور غم سے مر جائیں۔ تب سوچو کہ ابا جان اور شجاع بھائی کا کون خیال رکھے گا۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" وہ ہونٹ کاٹ کر رو پڑی۔

"اور پھر حرام موت کو گلے لگانے سے، ہمیں آخرت میں بھی جہنم میں رہنا ہوگا۔" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے سمجھایا۔

"پھر ہم کیا کریں گے، لوگ ہمیں ہمدردی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہم پر رحم کھاتے ہیں۔ ہمارے دہشت ناک مستقبل سے امی، ابا جان کو ہولاتے ہیں کہ کوئی فرد اس جسمانی عیب کی وجہ سے ہمیں قبول لنے کو تیار نہیں ہوگا۔" اس سے تردّد سے کہا۔

"اللہ سے بہتری کی امید رکھو، یقیناً وہی رحم کرنے والا ہے۔ اگر ہم پژمردہ رہنے لگیں تو شجاع بھائی پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔ دیکھتی نہیں ہو کہ صرف ہم دونوں کی وجہ سے وہ کتنی محنت کرتے ہیں۔ ایک تو وہ پہلے ہی دھان پان سے تھے، اب مزید کمزور ہو گئے ہیں۔" میں نے سمجھایا۔

"اگر شجاع بھائی کی شادی ہو جائے تو گھر کے ماحول پر خوشگوار اثر پڑے گا۔" یہ خیال تانیا کے ذہن میں آیا تھا اور میں اس کا عملی جامہ پہنانے کے لیے پھرکی بن گئی۔ امی کے ساتھ ساتھ ابا جان کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا مگر شجاع بھائی اس قدر شرمیلی طبیعت کے تھے کہ کسی سے عشق کرنا تو کجا، وہ آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔

کاش، شجاع بھائی خاندان کے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے تو شاید کوئی اچھی سی بھابی دیکھنے کی آس جلدی پوری ہو جاتی مگر وہ تو نہ صرف شرمیلے تھے بلکہ کم گو بھی اور لڑکیوں کے معاملے میں اکل کھرے بھی تھے۔

میں کئی دفعہ اپنے کالج کی خوبصورت سہیلیوں کو لے کر گھر آئی کہ اگر شجاع بھائی کو پسند آ جائیں تو ہم ان میں سے کسی کو اپنی بھابی بنا سکیں۔ مگر شجاع بھائی یوں نظریں نیچی کر کے گزر جاتے، جیسے نظر اٹھا کر دیکھنا بھی قانونی طور پر منع ہو۔ امی کے ساتھ ساتھ ابا جان بھی نہال تھے کہ شجاع بھائی میں کوئی وصف بھی عاشقوں والا نہیں ہے۔

شجاع بھائی ہم دونوں بہنوں سے خاصے بڑے تھے۔ ان کے ہم عمر دوستوں کی شادیاں ہو رہی تھیں مگر وہ شادی کے نام پر صاف انکار کر دیتے۔

"مجھے شادی کرنا ہی نہیں ہے۔" ان کا جواب اُکتایا ہوا ہوتا۔

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" ایک دن ابا جان نے خاصے درشت لہجے میں پوچھا۔

"مجھے اپنی نوکری سے عشق ہے۔ اسی میں نام کمانا چاہتا ہوں۔" سرشار لہجے میں کہا گیا۔

"نوکری سے بھی کوئی عشق کرتا ہے؟" تانیا خاصا جل کر بولی تھی۔

"ہاں، کام کرنے والے لوگ کرتے ہیں۔" شجاع بھائی اس کی چھوٹی سی پونی کھینچتے ہوئے شرارت سے کہہ کر چلے گئے تھے۔

شجاع بھائی ٹی وی پر چیف کیمرہ مین تھے۔ ان کی عکاسی بے حد خوبصورت ہوتی تھی اور وہ بلاشبہ ایک بہترین کیمرا مین تھے۔ شوبزنس کے رسائل میں ان کا ذکر ہمیشہ اچھے لفظوں میں ہوتا تھا۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ شجاع بھائی میں ایک خامی یہ تھی کہ وہ ایک چاپلوس قسم کے آدمی کبھی نہیں بنے۔ اندرونِ ٹیلی ویژن انھوں نے اپنی کوئی لابی نہیں بنائی۔ سیاسی گٹھ جوڑ سے بے نیاز تھے اور اس کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا کہ سلسلے وار سیریز کی کامیابی جب بہترین عکاس کے خانے میں ڈالی جانے لگی۔ تو شجاع بھائی کا ٹرانسفر ڈھاکہ ٹی وی پر کر دیا گیا۔ (یہ ان دنوں کی بات ہے جب مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کا چولا نہیں پہنا تھا)

"چھوڑ دے نوکری، میں تجھے اتنی دور نہیں جانے دوں گی۔" امی نے خاصا رو کر کہا۔

"میرے بہت سے ایسے دوست ہیں جو تمہیں دوسری نوکری بہ آسانی دے سکتے ہیں۔" ابا جان کا لہجہ بھی وثوق سے بھرا ہوا تھا۔

"شجاع بھائی! آپ کے بغیر تو ہمیں بالکل مزہ نہیں آئے گا۔" میں اور تانیا روہانسی سی

ہو گئیں۔

''مشرقی پاکستان میں رہنے کے باعث' مجھے کچھ الاؤنسز زیادہ ملیں گے۔'' وہ مضبوط سے لہجے میں بولے۔

''ہمیں نہیں چاہیے ایسا پیسہ' جو ہمارے لال کو ہم سے دور لے جائے۔'' امی بلک اٹھیں۔

''امی' کیسی باتیں کہہ رہی ہیں آپ' مت بھولیے کہ ہمیں تانیا اور ملیحہ کی شادی کے لیے ایک بڑی رقم جمع کرنی ہے۔'' شجاع بھائی عزم سے بولے۔

''اگر قسمت میں ہوا تو ایسے ہی ہو جائے گی۔'' ان کی ممتا تڑپ رہی تھی۔

''کمال کر رہی ہیں آپ' میں کوئی ملک سے تھوڑا ہی دور جا رہا ہوں۔ اپنے ملک میں ہی تو ہوں۔ جتنا وقت ناظم آباد سے کلفٹن جانے میں لگتا ہے۔ اتنے وقت کی تو کراچی سے ڈھاکہ تک کی فلائٹ ہے۔'' بھائی نے سمجھایا۔

''مگر میرا دل نہیں مان رہا۔ تو تجھے کیسے جانے دوں؟''

آہ! اب سوچتی ہوں کہ ماں کا دل کیسے صحیح اندازے کر لیا کرتا ہے۔

''ابا جان! آپ سمجھائیے پلیز۔'' شجاع بھائی اپنی حالت پر قابو پانے کے لیے پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ شاید انھیں امی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''شجاع بیٹے! تم بہترین کیمرہ مین ہو' یہاں پر بھی خاصا کما سکتے ہو۔'' ابا جان نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''ابا جان! میں اپنے کام میں مزید ترقی چاہتا ہوں۔ ڈھاکہ میں بے حد ٹیلنٹ ہے' میں وہاں سے یقیناً ترقی کر کے آؤں گا۔ ٹرانسفر تو ملازمت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ میں آپ کے پاس آتا جاتا رہوں گا۔'' شجاع بھائی کا جواب خاصا مستحکم تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہم سب بھیگی آنکھوں سے شجاع بھائی کو ایئرپورٹ چھوڑنے گئے تھے۔ ہم نے ڈھاکہ سے ان کا پہلا پروگرام ''زرتیر تالے تالے'' دیکھا۔ یہ رقص کا ایک پروگرام تھا۔ پروگرام کا پروڈیوسر تو شجاع بھائی کا ایک بنگالی دوست تھا مگر عکاسی کے فرائض شجاع بھائی نے ادا کیے تھے۔

واہ' کیا خوبصورت عکاسی تھی ان کی۔ کبھی کیمرہ صرف آنکھوں کو گھیرے میں لے لیتا تو کبھی پیروں کی انگلیوں پر جا جمتا۔ اس زمانے میں ڈبل کیمرے کی جہت نئی نئی سامنے آئی تھی۔ ناچتی ہوئی ایک لڑکی جب کیمرہ ٹرک سے پانچ نظر آنے لگتیں تو واقعی بہت اچھا لگتا تھا اور سب سے خاص بات یہ بھی تھی کہ بنگالی لڑکیاں کلاسیکل رقص اتنی مہارت سے کرتی تھیں کہ ہم دم

سادھے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

تانیا تو وہ پروگرام دیکھ کر ہی آئینے کے سامنے تھا...... تھا...... تھی...... تھا...... کرنے لگی تھی۔

دل میرا بھی بہت چاہتا تھا مگر میں اپنے پیر کے لنگ کے باعث مجبور تھی۔

اور پھر ہمیں یہ دیکھ کر از حد خوشی ہوئی کہ شجاع بھائی کو ''زرتیر تالے تالے'' پروگرام کے فرائض مستقل مل گئے' ہم فخر سے اپنی سہیلیوں کو بتاتے اور پھر ماشاء اللہ شجاع بھائی اپنے پروگرام میں نئے نئے زاویے پکچرائز کرنے لگے۔ ان کی عکاسی کی دھوم مغربی پاکستان میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔

ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک شجاع بھائی کی تنخواہ کا ڈرافٹ گھر آ جاتا۔ اور امی پریشان ہو کر لکھتیں کیا سارے پیسے ہمیں ہی بھیج دیے۔ اپنے پاس بھی کچھ رکھا یا نہیں؟

اور امی کے تابڑ توڑ کئی خطوط کے جواب میں ان کا مختصر سا خط آ جاتا کہ آپ لوگ میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں بہت آرام سے ہوں۔ ٹی وی سے فارغ ہو کر میں کسی پرائیویٹ ادارے کے لیے بھی کام کرنے والا ہوں۔ خط نہ لکھوں تو پریشان مت ہوا کریں۔ مگر امی کا روز خط لکھنا ان کی ممتا کی پکار تھی۔ وہ شجاع بھائی کو خط لکھے بغیر بے چین سی رہا کرتی تھی۔

اور پھر یونہی سال بھر گزر گیا۔ شجاع بھائی اپنی سالانہ چھٹیوں تک میں گھر نہیں آ سکے۔

اب امی کے خطوط کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ ایک ہی بات مختلف طریقوں سے لکھتی تھیں کہ گھر واپس آ جاؤ اور شادی کر کے اپنی دلہن کو ساتھ لے جاؤ تاکہ وہاں تمہیں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔

شجاع بھائی' امی کے خطوط کا جواب تو دیتے مگر شادی کا جواب گول کر جاتے۔

''کیسا لڑکا ہے؟ سنتا ہی نہیں۔'' وہ غصے سے کہتیں۔

''سب ہم جیسے تھوڑی ہوتے ہیں۔'' ابا شوخی سے کہتے۔

''آخر کوئی نہ کوئی پسند بتاتا تو لڑکی منتخب کرنے میں آسانی ہو جاتی۔'' وہ ابا کے جواب سے چڑ کر کہتیں۔

''اس کی کوئی پسند ہی نہیں ہے تو وہ بے چارہ کیا بتائے۔''

''میرے لیے تو مشکل ہو گئی؟ کیسے ڈھونڈوں لڑکی؟''

''کیوں' شہر کراچی میں لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے؟''

''بعد میں' میری پسند کی لڑکی اچھی نہیں لگی تو پھر؟''

''میرا بیٹا ایسا ہرگز نہیں ہے۔''

تب امی نے شجاع بھائی کے لیے دلہن ڈھونڈنے کا بیڑا خود اٹھا لیا۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی

تھی کہ جس دن امی نے شجاع بھائی کے لیے لڑکی پسند کر کے ان کا رشتہ پکا کیا۔ ٹھیک اسی دن شجاع نے ڈھاکہ میں لیلیٰ سے شادی کر لی۔

لیلیٰ نزتیر تالے تانے میں مرکزی رقص کیا کرتی تھی۔ دبلی پتلی سانولی سلونی لیلیٰ میں نہ جانے انھیں کیا نظر آیا تھا کہ سوچے سمجھے بغیر انھوں نے یکدم شادی کر لی۔ (خون کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا ہی تھا)

امی اور ابا جان تک جب یہ خبر پہنچی تو انھیں خاصا رنج ہوا۔

امی نے غصّے سے خط میں شجاع بھائی کو لکھا کہ ایک غلطی تو تم کر چکے ہو مگر اب دلہن کو لے کر گھر آ جاؤ۔ تاکہ تمہارا ولیمہ ہم اپنے شہر میں کر سکیں۔

اس کے جواب میں شجاع بھائی اکیلے کراچی آ گئے۔ لیلیٰ ان کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ بقول ان کے کہ اسے اُردو بولنی بالکل نہیں آتی اس لیے وہ یہاں آتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

"ارے پھر آپ کا ولیمہ کیسے ہوگا؟" تانیا نے متوحش ہو کر پوچھا تھا۔

"ولیمہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پیسے سے میں اپنی دونوں بہنوں کو سونے کا ایک ایک سیٹ بنوا دوں گا۔" وہ خوشدلی سے بولے۔

"نہیں بھیا، میں سیٹ لے کر اتنی خوشی نہیں ہوگی جتنی خوشی آپ کے ولیمے سے ہونی تھی۔" تانیا اداس لہجے میں بولی۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے دُکھ سے پوچھا۔ "ہم نے تو آپ کی شادی کے اتنے سارے پروگرام بنائے تھے۔ آپ نے ہمارے بغیر ہی اپنا بیاہ رچا لیا۔ آپ نے ہماری خوشیاں پامال کر کے رکھ دیں۔ نہیں چاہیے ہمیں کوئی گفٹ آپ کی طرف سے۔"

میں اور تانیا بھیا سے لپٹ کر بے اختیار رو دیے۔ جب دل کی بھڑاس نکل چکی تو میں نے دیکھا، شجاع بھائی اپنا زرد چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے کپکپاتے ہونٹ دانتوں تلے کاٹ رہے تھے۔ (شاید وہ پہلے سے زیادہ دُبلے ہو گئے تھے۔ زیادہ محنت نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالا تھا۔)

"ہاں، ملیحہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں قاتل ہوں تم سب کی خوشیوں کا بخدا میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا، مگر نہ جانے یہ کام مجھ سے کیونکر ہو گیا، جس سے میں ہمیشہ دامن بچاتا رہا۔ شاید وہاں پہنچ کر میں وہ نہیں رہا، جو یہاں تھا۔ شاید وہاں کی مٹی محبت کے لیے اتنی زرخیز تھی کہ اس کی مہک میرے من میں پھوٹتی چلی گئی۔ لیلیٰ سے میں چند بار ہی ملا تھا مگر اس سے مل کر یوں لگا کہ اُس بن رہنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ تب تنہائی کا ایک ایک پل اتنا دشوار لگا کہ فوری شادی کے سوا

اور کوئی راستہ میرے پاس نہیں تھا۔"

آپ بھابی کو لے کر آتے، کم از کم ہم انھیں دیکھ تو لیتے۔

"شاید وہ تم لوگوں کو پسند نہ آتی۔ خالی خولی اسکرین بیوٹی ہے اس کی، ورنہ ایک دم کالی کوئل ہے وہ۔" وہ ہنسے (مگر میں سمجھ گئی کہ یہ ہنسی اوپری ہے)

"پھر وہ آپ کو کیسے پسند آ گئیں؟ آپ تو کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔" تانیا نے چہک کر جملہ کسا۔

"نظر اٹھا کر ہی تو نہیں دیکھا تھا بس اچھی لگی۔ اس کی باتیں میرے دل میں گھر کرتی چلی گئیں۔" وہ باتیں کرتے ہوئے کھو سے گئے تھے۔

شجاع بھائی بہ مشکل ایک ہفتہ رُکے اور پھر واپس ڈھاکہ چلے گئے جہاں نئی دلہن ان کی منتظر تھی۔

اور پھر لیلیٰ کا خوف تھا یا اس کی دور اندیشی۔ اس نے شجاع بھائی کو کبھی کراچی نہیں آنے دیا۔ بنگال کو جادو شاید سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ہاں، وہ پیسے باقاعدگی سے بھیجتے تھے۔ امی کا خیال تھا، شاید وہ لیلیٰ کو بتائے بغیر بھیجتے ہوں گے۔ ورنہ وہ یہاں بھی بھانجی مار دیتی۔

امی خط لکھ لکھ کر ہار گئیں، مگر بے سود۔

ابا جان نے اپنے توسط سے انھیں پیغام بھجوائے مگر شجاع بھائی کراچی نہیں آئے۔ دو تین ماہ بعد ان کا مختصر ترین خط آ جاتا جس میں اپنی خیریت کی چند سطریں لکھ دیتے۔

اور پھر یونہی دو سال گزر گئے۔ امی، ابا جان ان کی شکل دیکھنے کو ترس گئے۔ امی نے نہایت درشت خط لکھنے شروع کر دیے تھے جس میں تمام نزلہ لیلیٰ بھابی پر گرا کرتا تھا۔ امی نے انتہائی غصے میں انھیں لکھ دیا تھا کہ اگر تم ماں باپ سے ملنے سے گریزاں ہو تو ہمیں تمہارے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب اگر تم نے ڈرافٹ بھیجا تو ہم تمہارے مُنہ پر واپس مار دیں گے۔ امی کے خط کا نہ جانے انھوں نے کیا مطلب لیا کہ شجاع بھائی نے یک دم خط لکھنا بند کر دیے۔

وہ کم بخت کیوں چاہے گی کہ اس کا خصم والدین سے کوئی رابطہ رکھے۔ نہ جانے اس جادوگرنی نے میرے بیٹے پر کیا جادو کر دیا کہ وہ اپنوں کی شکلوں سے بیزار ہو گیا۔ امی کے اٹھتے بیٹھتے یہی جملے ہوتے، جو لیلیٰ بھابی کو دیکھے بغیر سنائے جاتے تھے۔

کرمانی صاحب کے توسط سے میرا اور تانیا کا رشتہ طے ہوا تو ابا جان نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم دونوں کی شادیوں سے قبل شجاع بھائی سے ڈھاکہ جا کر خود مل آتے ہیں تاکہ وہ کراچی آ کر بہنوں کی شادیوں میں شرکت کر لیں۔ اس سے قبل کہ امی، ابا ڈھاکہ جاتے، پتہ چلا کہ ٹی وی کی نوکری

چھوڑ کر وہ کھلنا کے کسی غیر معروف فلم اسٹوڈیو سے منسلک ہوگئے ہیں اور کسی فلم میں لیلیٰ بھابی سائیڈ ہیروئن کا کام بھی کر رہی ہیں۔

"نہ جانے کس نیچ خاندان میں شادی کر لی ہے۔ شجاع تو پھنس ہی گیا۔" امی نے لمبی آہ بھر کے کہا۔

مجھے اور تانیا کو یہ افسوس تھا کہ شادی کے کارڈ تک شجاع بھائی تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ کیونکہ شجاع بھائی کا صرف ڈرافٹ آتا تھا۔ مگر ان کے خط آنا بالکل بند ہوگئے تھے۔

مگر جانے انھیں یہ کیسے پتا چل گیا۔ انھوں نے شادی سے ایک ہفتہ پہلے ایک لاکھ روپے کا ڈرافٹ بھیجا۔ اور اپنی اور لیلیٰ کی جانب سے محبتوں اور دعاؤں کے کارڈز بھیجے مگر اپنی شدید مصروفیت کی وجہ سے شادی میں شرکت سے معذوری کا اظہار کیا گیا تھا۔

میں اور تانیا کارڈز کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے کہ شادی کے بعد ہمارا بھائی زن مریدی کے مراحل کس تیزی سے طے کر گیا تھا کہ اپنی معذور بہنوں کی شادی میں سر پر ہاتھ رکھ کر رخصت کرنے کا روادار نظر نہیں آ رہا تھا۔

میری اور تانیا کی شادیاں خوب دھوم دھام سے ہوئیں۔ اچھے جہیز اور ایک بڑے کیش سے ہمارے لیے اچھے قسم کے دولہا خریدے گئے تھے جو شادی کے بعد جہیز اور کیش کے مطالبے کو انتہائی شرمندگی سے اپنی والدہ اور بہنوں کے کھاتے میں ڈال رہے تھے۔ ان کی یہ شرمندگی میرے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

کچھ عرصے بعد شجاع بھائی اور لیلیٰ بھابی کا خیال ذہن کے افق پر معدوم سا ہوگیا۔ مگر جب لیلیٰ کی کئی بنگالی فلمیں مغربی پاکستان میں بھی ریلیز ہوئیں۔ تو شجاع بھائی بے حد یاد آگئے۔

ہم نے بنگالی زبان سے نابلد ہوتے ہوئے بھی وہ فلمیں دیکھ ڈالیں۔ دبلی پتلی سی لیلیٰ بھابی واقعی ساحرانہ قوتوں کی حامل نظر آتی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور لمبے دراز بال دیکھنے کے قابل تھے۔ فلمیں دیکھتے ہوئے میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے لیلیٰ کی گردن دبا دوں جنھوں نے اپنی زلفوں کی چھاؤں میں شجاع بھائی کو یوں قید کر لیا تھا کہ وہ گھر کا راستہ ہی بھول گئے تھے۔

شروع کی فلموں کی عکاسی شجاع بھائی نے ہی کی تھی۔ مگر لیلیٰ بھابی کی جب دوسری فلمیں ریلیز ہوئیں تو ان کی عکاسی شجاع بھائی نے نہیں کی تھی۔ میں نے مذکورہ فلم اسٹوڈیو کے ایڈریس پر شجاع بھائی کو کئی خط لکھے مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ وہاں جا کر ہم سے کسی قسم کا کوئی رابطہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

ایسا کیوں تھا؟

اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"مرد اتنا مجبور نہیں ہو سکتا......" ابا جان ہمیشہ یہی کہتے تھے۔

ہماری شادیوں کو کئی ماہ گزر گئے تھے۔ ایک دن میں اور تانیا امی کے گھر آئے ہوئے تھے کہ ڈاک سے اجنبی ہینڈ رائٹنگ میں خط موصول ہوا۔ لفافہ کھولا تو اس میں لیلیٰ بھابی کا خط تھا جس میں انھوں نے شجاع بھائی کی بیماری کی اطلاع دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ خدانخواستہ شجاع بھائی کا آخری وقت ہے۔ خدا کا شکر تھا کہ اس خط میں انھوں نے اپنا ایڈریس لکھا تھا۔ امی ابا خط پڑھ کر پریشان ہوگئے۔ اسی دن پہلی فلائٹ سے کھلنا پہنچے اور دو دن بعد شجاع بھائی اور لیلیٰ بھابی کراچی آ گئے۔

شجاع بھائی کو دیکھ کر ہم حیران تھے' یہ وہ شجاع بھائی نہیں تھے جو یہاں سے گئے تھے۔ آواز نحیف ہوگئی تھی۔ چلنے پھرنے سے وہ قاصر تھے اور ان کا دبلا پتلا جسم تو ہڈیوں کا ایک ڈھانچا تھا۔

ایسا کیوں ہوا' کیا ہوگیا تھا؟ یہ جاں بہ لب حالت کیوں ہوئی۔ اس کا کون ذمے دار تھا۔ ہم سب آنسوؤں کے ساتھ انھیں دیکھ کر سوچ رہے تھے۔ تب پہلی بار شجاع بھائی نے بتایا کہ ڈھاکہ جانے سے بہت پہلے ان کو یہ پتا چل گیا تھا کہ کینسر کے موذی جراثیم ان کے جسم میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ شادی سے انکار کرتے رہے۔

وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسے کما کر اپنی بہنوں اور والدین کے لیے کچھ جمع کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے از خود ڈھاکہ ٹرانسفر کرایا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ یہاں رہے تو امی ابا جان ہم بہنوں کی شادیاں کرنے کے بجائے صرف ان کے علاج معالجوں پر روپیہ لٹا دیں گے۔

"مگر بھیا' ہمیں تو تمہاری زندگی عزیز ہے۔" بھیا کی باتیں سن کر میرا کلیجا پھٹ گیا۔

(کاش' ہمارے بھائی جان زندہ رہتے بے شک ہم ساری عمر کنوارے رہتے)

"میری گڑیا' مجھے تم دونوں کی خوشیاں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں۔" وہ ایک لاغر سی ہنسی ہنسے۔

"لیلیٰ بھابی! یہ سب باتیں آپ کو لکھنی چاہیے تھیں۔" میں نے ناراض لہجے میں کہا۔

"ملیحہ! اسے کچھ مت کہنا' لیلیٰ بہت عظیم ہے۔ اس نے میرا بے حد ساتھ دیا ہے۔ میری بیماری جانتے ہوئے بھی بضد ہو کر مجھ سے شادی کی۔ اور ہر لحاظ سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ میرا علاج بھی کراتی رہی۔ اور اسے میں نے از خود منع کیا تھا کہ میری بیماری کی کوئی خبر تم لوگوں کو نہ

دے۔"

"میں تمہیں لندن لے کر جاؤں گا' میں تمہیں ہرگز مرنے نہیں دوں گا۔" ابا جان شجاع بھائی کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر بولے۔

امی کو تو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ ہر وقت شجاع بھائی کی پٹی سے لگی ہوئی بیٹھی رہتیں۔ اور دم سادھے انھیں دیکھتی رہتیں۔ اور ابا جان تو نہ جانے کہاں کہاں بھاگے پھر رہے تھے۔ مقامی ڈاکٹرز سے چیک اپ کرایا گیا تو معلوم ہوا' کینسر نے اپنی جڑیں اس قدر پھیلا رکھی تھیں کہ ان کا بچ جانا قطعی ناممکنات میں سے تھا اور پھر کراچی آنے کے بعد شجاع بھائی صرف پچیس دن زندہ رہے۔

میں اور تانیا دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر روئے۔

شجاع بھائی نے کیسا عشق کیا تھا' ہم بہنوں کے ساتھ کہ اپنی زندگی ہم پر سے وار دی تھی۔

وہ انتہائی کمزوری اور بیماری کی حالت میں ہم بہنوں کی خاطر محبت کرتے رہے اور ایسی پیاری بھابی جس نے موت سے قریب ہوتے ہوئے شخص کا ہر طرح سے بھرپور ساتھ دیا اور اپنے نام کے ساتھ بیوگی کا داغ لگایا' واقعی پوجنے کے لائق تھی۔

ہمارا خیال تھا کہ عدت کے بعد لیلیٰ بھابی مشرقی پاکستان چلی جائیں گی۔ ان کے والدین اپنے خطوط میں ایسا ہی کچھ لکھ بھی رہے تھے جو صحیح بھی تھا۔ مگر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک دن لیلیٰ بھابی امی کے قدموں میں جھکی آنسوؤں کی جھڑی میں کہہ رہی تھیں۔

"میں اپنی بقیہ زندگی آپ کے چرنوں میں گزارنا چاہتی ہوں' کیونکہ یہاں مجھے شجاع کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔"

تب امی نے تڑپ کر لیلیٰ بھابی کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

یہ لیلیٰ بھابی کا عشق تھا' جو شوہر سے جدا ہو جانے کے بعد بھی قائم و دائم تھا۔

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے ہیں۔ شجاع بھائی ہم سب کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں اور لیلیٰ بھابی ہمارے لیے کتنی مقدس اور محترم ہیں اس کا ذکر کرنے سے ہم قاصر ہیں۔

❀❀❀

بدتمیز

"اگر غصہ جنون کی شاہراہ عبور کرے تو وہ ہیجان کا سگنل توڑتا ہوا دیوانگی کے پُل پر چڑھ جاتا ہے' اوپر......اور اوپر......!

تب کوئی بات سوچنے اور سمجھنے کی اور کوئی حس محسوس کرنے کی باقی نہیں رہتی۔" رابعہ آپا نے کہا۔ وہ یاس زدہ لہجے میں ہاتھ مل رہی تھیں۔

تب اُس نے پہلو بدل کر اپنی نظریں دیوار پر لگی ہوئی ان چڑیوں پر ٹکا دیں' جو میخوں سے لگائی گئی تھیں مگر ان کے چہرے اور پروں میں زندگی کی بشاشت کا احساس ہوتا تھا۔

"افسوس تو ایک بہت چھوٹا لفظ جو میرے دلی صدمے کا اظہار نہیں کر سکتا' مگر میں یہ بات دل سے کہہ رہی ہوں' کہ جس دن میری زبان نے تمہیں برا بھلا کہا' اُس دن سے میری بیٹی کی زندگی مزید پریشان کن ہو گئی ہے۔ سن رہی ہوں ناں تم۔"

شائستہ اب بڑی توجہ سے ٹی وی کا خبرنامہ دیکھ رہی تھی جس میں نہروں کی صفائی کا پروگرام دکھایا جا رہا تھا' اس پروگرام کو مزید خوبصورت بنانے کے لیئے انہوں نے دو چار ڈھول بجانے والے بھی کھڑے کر لئے تھے۔ یہ ہیں ہماری خبریں' اس کی کوفت بڑھ رہی تھی۔

"شائستہ' میں تمہاری ماں کے برابر ہوں' اور آج ایک ماں اپنی بیٹی سے معافی مانگنے آئی ہے۔" رابعہ آپا کے لہجے میں رقت در آئی۔

"پلیز رابعہ آپا......ایسی بات نہ کہیں۔" اُس نے اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا۔ ایسے لہجے ساعتوں کو دکھ دیتے تھے۔

"غلطیاں بڑوں سے بھی ہو جاتی ہیں' تو کیا چھوٹے ان کو معاف نہیں کرتے۔" رابعہ آپا' اب اس کے برابر صوفے پر آ بیٹھی تھیں۔

"آپ یقین کیجئے' اب میں وہ سب باتیں بھلا بیٹھی ہوں۔"

"تو پھر' پہلے کی طرح' میرے پاس کیوں نہیں آتی ہو۔" انہوں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیئے۔

"آؤں گی' کسی دن' فاروق کے ساتھ۔" وہ دھیمے سے مسکرائی۔

"تمہیں میری قسم کہ تم ضرور آؤ گی۔" وہ انتہائی لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

"ہاں آپا...... میں ضرور آؤنگی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"یوں کرو کہ تم لوگ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھالو۔"

"ارے آپا' اس کی تکلیف آپ نہ کریں' ہم لوگ آ جائیں گے کسی دن' یا جس دن شازیہ آئی ہوگی۔ اُسی دن آ جائیں گے؟" شائستہ نے ان کے آگے کولڈ ڈرنکس رکھتے ہوئے کہا۔ یوں بھی' اب وہ ان تمام باتوں کو بھول جانا چاہتی تھی۔

"شازیہ تو دو ماہ سے گھر بیٹھی ہوئی ہے' پتا نہیں' اب دانیال کا کیا پروگرام ہے' اُسے لے کر جاتا بھی ہے یا نہیں۔"

"آپ نے دانیال سے بات کی......!"

"وہ آتا کہاں ہے......؟ جو بات کروں گی......؟"

"میرا مطلب ہے کہ' آپ نے اس سے فون پر بات کی' کہ اب وہ شازیہ کو لینے کب آئے گا......" شائستہ نے پوچھا۔

"پتہ نہیں اس کا موڈ اس قدر آف کیوں ہے' میری آواز سن کر ہی فون بند کر دیتا ہے۔"

"میں کل فاروق کو دانیال کے آفس بھیجتی ہوں کہ اُسے سمجھائے کہ شازیہ کو اپنے گھر لے کر جائے......!"

"ارے میری بچی' سدا بھاگوان رہے' مجھے معلوم تھا' کہ شازیہ کیلئے تو کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی' ورنہ میری بہوئیں تو اس کو اجڑا دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔"

"کسی کے دکھ' دوسرے کیلئے سکھ کے باعث تو نہیں ہوتے۔" وہ گہرے سے لہجے میں بولی۔

"ارے اب ایسا ہی ہو رہا ہے' دوسروں کے غم اپنی خوشیاں بن گئے ہیں' میری اپنی بھاوجیں کس کس طرح میری جان جلاتی ہیں بتا نہیں سکتی۔" ان کا لہجہ آزردگی لئے ہوئے تھا۔

"میں آپ کا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔"

"اچھا تو پھر کل تم آ رہی ہو ناں' موسم بھی اچھا ہے' ہلکی ہلکی سی برسات نے اچھی خاصی خنکی پیدا کر دی ہے۔" رابعہ آپا اُٹھتے ہوئے ہو۔

"ٹھیک ہے میں آؤنگی۔" شائستہ اُنھیں چھوڑنے باہر لابی تک آئی۔

رابعہ آپا کے جانے کے بعد' وہ شام اس کے ذہن میں گھوم گئی' اس دن بھی تو موسم بھیگا بھیگا سا اور وہ حسب عادت گاڑی فراٹے سے چلا رہی تھی۔

جب وہ گھر سے نکلی تو اُس وقت بارش ہو رہی تھی۔ موسم بہار کی اس بارش نے فضاء کو دھندلا سا دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کی اسٹریٹ لائٹس روشن ہو چکی تھیں۔ اونچے اونچے کھجور پر چار پتوں کے ڈیزائن والے بلب ایک سحر انگیز سا تاثر پیدا کر رہے تھے۔ اُس کا موڈ خود بخود اچھا سا ہو گیا...... اُس کے ذہن میں رات کو فون پر کہے ہوئے فاروق کے جملے گونجنے لگے۔

"شائستہ! تم سے دور رہ کر مجھے احساس ہو گیا ہے' ساری کی ساری غلطی میری تھی' تمہیں چھوڑ کر یوں دوسرے شہر میں جانا' اور مسلسل تم سے الگ رہنا' کوئی اچھی بات نہیں' میں بہت جلد تمہارے پاس آ رہا ہوں۔" اور وہ سوائے ہنکارہ بھرنے کے کچھ نہیں بول سکی تھی۔ ہوں...... اچھا...... جی...... کے سوا...... اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

اور اب اُسے احساس ہو رہا تھا' کہ فاروق کے بغیر اُس کے دن اور رات کیسے سونے سے بیتتے تھے۔

آفس سے گھر اور گھر سے آفس نے اُسے ایک مشین بنا کر رکھ دیا تھا۔

اور اب سب سے زیادہ خوش کن احساس یہ تھا...... کہ فاروق اُس سے محبت کرتا ہے' ورنہ تو یہ غم ہی اُسے مارے جاتا تھا کہ فاروق نے اس سے شادی اُس کی پُرکشش تنخواہ' خوبصورت فلیٹ اور شاندار گاڑی کو دیکھ کر کی تھی۔

بھیا' بھابی نے بھی غلط ہی کہا تھا کہ فاروق ایک شاطر انسان ہے' اُس نے تم سے شادی کرنے میں اپنا فائدہ دیکھا' اور جب اُسے یہ فائدہ کم نظر آیا' تو خواہ مخواہ تم سے منہ موڑ کر دوسرے شہر چلا گیا۔

بارش بڑھ گئی تھی' بارش کے قطروں کا دھیما مگر فرحت بخش لمس وہ بن بھیگے ہی اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔

ہم کو احساس تک نہیں ہوتا
ہم کسی کی حیات ہوتے ہیں

گنگناتے ہوئے اس نے کیسٹ لگا دیا۔

مغنیہ بڑے خوبصورت لہجے میں گا رہی تھی۔

پگھل پتھر بھی سکتے ہیں

اُلٹ دریا بھی سکتا ہے
کوئی آوارہ سا پنچھی
پلٹ کر آ بھی سکتا ہے
جو شب کہ......
مجھ پہ ہنستی ہے
وہی شب رو بھی سکتی ہے
محبت ہو بھی سکتی ہے۔

☆☆☆

رابعہ آپا کے گھر کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے‘ اس کے لبوں پر ایک دھیمی سی مُسکان تھی۔ رابعہ آپا سے اُس کی رشتہ داری تو کوئی خاص نہ تھی‘ ہاں دوستی عرصہ دراز سے تھی۔ اُن کی بیٹی شازی کی شادی بھی اُس نے اپنی ایک کولیگ کے توسط سے کروائی تھی‘ ورنہ رابعہ آپا تو شازی کے لئے خاصی پریشان رہا کرتی تھیں۔

رابعہ آپا سن کر خوش ہونگی کہ فاروق آنے والا ہے۔ وہ یہ سوچتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہوئی‘ آج وہ بہت دنوں بعد آئی تھی۔

”اچھا ہوا تم آ گئیں شائستہ......“ رابعہ آپا دیکھتے ہی بولیں۔

”آپا‘ میں آپ کو بہت دنوں سے یاد کر رہی تھی۔“

”اچھا“ وہ ہنسیں۔ انکی ہنسی عجیب سی لگی۔

”یاد تو میں بھی بہت کر رہی تھی۔“ انہوں نے کہا۔

”بس آپا! مصروفیت کسی طرح جان ہی نہیں چھوڑ رہی تھی‘ ورنہ کب کی آ چکی ہوتی۔ ارے واہ شازی بھی آئی ہے ہیلو......“ وہ اس کو دیکھ کر بولی۔

”شائستہ آج سچ سچ بتانا‘ کب کی برائی کا بدلہ دیا ہے تو نے۔“ رابعہ آپا کا لہجہ اکل کھرا سا ہو گیا۔

”برائی کا بدلہ......“ اب وہ متحیر سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

”خود تو تم اپنے گھر میں بس نہیں سکیں‘ شازی کی شادی بھی جان کر تم نے ایسے گھرانے میں کرادی‘ جہاں اس کا جینا حرام رہتا ہے...... دانیال جیسا داماد خدا دشمن کو نہ دے‘ تم نے خوب پہنایا نبھایا‘ میری اکلوتی بچی کو ذلیل لوگوں میں دے دیا۔“

”یہ میں نے کیا کیا ہے۔؟“ اب وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی؟

”اور کیا‘ تم نے تو کروائی ہے شازی کی شادی‘ یاد ہے کہ دانیال کی کیسی کیسی تعریفیں تم کرتی تھیں‘ جو اس میں ایک بھی نہیں ہے‘ آج شادی کو صرف چھ ماہ ہوئے ہیں اور وہ بارہ دفعہ گھر بیٹھ چکی ہے‘ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے‘ کہ میں تمہاری باتوں میں آ گئی‘ ورنہ کمی نہیں تھی شازی کیلئے رشتوں کی‘ ایک سے ایک اچھے رشتے آ رہے تھے اُس کے‘ مگر تم جیسی نگوڑی تھیں‘ ایسا ہی چاہتی تھیں‘ کہ دوسروں کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو‘ تمہیں فاروق چھوڑ کر چلتا بنا ہے‘ اب ایسی دوسری مثالیں بھی نظر آئیں‘ دیکھ تو شازی بھی گھر میں بیٹھ گئی۔“

رابعہ آپا کیا کہہ رہی تھیں‘ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ رابعہ آپا کی جھاڑ جاری تھی‘ مگر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا جیسے قوتِ گویائی بھی سلب ہو گئی ہو۔

وہ خاموش کھڑی سنتی رہی‘ ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں زہر گھول رہا تھا۔

ان کے لہجے میں سفاکی بھی تھی اور افسردگی بھی...... اور آج وہ شاید اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں...... جب ہی ان کا لہجہ سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔

اُس نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا‘ شازیہ لاپروائی سے ٹی وی پر کوئی مووی دیکھ رہی تھی۔ رابعہ آپا کی ساس پوری توجہ کے ساتھ اپنا سوئٹر بن رہی تھیں۔

وہ بھاگنے کے انداز میں مڑی اور پیچھے دیکھے بغیر اپنی گاڑی تک آئی‘ اور اب اس کی گاڑی تیزی سے فراٹے بھر رہی تھی۔ اور اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے‘ موسم کی تمام تر خوبصورتی ہوا ہو چکی تھی‘ تیز و تند جملے اس کے ذہن میں سنگ باری کر رہے تھے۔

یہی رابعہ آپا تھیں‘ جو ایک نظر دانیال کو دیکھ کر‘ اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں‘ کہ اپنی دوست کے دیور سے شازی کی شادی کروا دوں۔

”آپا‘ ابھی وہ شادی نہیں کرنا چاہتا‘ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا ہے‘ لا ابالی بھی زیادہ ہے۔“ اُس نے بارہا سمجھایا بھی تھا۔

”شادی سے پہلے سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ ان کا یہ یقین تھا۔

”وہ شاہ خرچ بھی ہے اور اس کی تنخواہ بھی کچھ اتنی زیادہ نہیں۔“

”پیسہ بیوی کی قسمت کا ہوتا ہے اور اولاد شوہر کے نصیب سے......!“

”رابعہ آپا‘ دانیال میری سہیلی کا دیور ہے‘ یوں تو وہ بظاہر بہت اچھا ہے‘ مگر اس کی عادتوں کے بارے میں‘ میں زیادہ جانتی نہیں ہوں۔“

''شائستہ اگر تم اس لڑکے کی شادی شازی سے کروانے کے لیئے کچھ کر نہیں سکتیں تو یہ دوسری بات ہے' یوں بھی شازی کوئی تمہاری سگی بھانجی ہے' اگر سگی ہوتی تو میں دیکھتی' یہ سب باتیں کہنے کی مجھے کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔'' انہوں نے اپنے آنسو تک بہا دیئے تھے۔

دانیال مزاج کا تیز تھا' ادھر شازی بھی کم نہیں تھی' یہی وجہ تھی کہ ان کے ہاں ہر وقت لڑائیاں ہوتی تھیں' ان کو آپس میں لڑنے کیلئے بھی بڑی باتوں کی ضرورت نہیں پڑی تھی' چھوٹی سے چھوٹی بات بھی لڑائی کیلئے پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔

''شاز' میرا آفٹر شیو کہاں گیا......؟'' وہ پوچھتا۔

''مجھے کیا پتا......؟''

''بھئی' میں یہاں ڈریسنگ ٹیبل پر چھوڑ گیا تھا۔''

''یہ یہاں رکھنے کی جگہ ہے کیا......؟''

''پھر کہاں رکھ دیا تم نے' دفتر کو دیر ہو رہی ہے جلدی بتاؤ۔''

''مجھے کیا پتہ' رکھ گئی ہو گی ماسی کہیں؟''

''تم دیکھ کر دے دو بھئی' اُٹھ جاؤ بستر سے''......!

''سر میں درد ہے؟ ہر وقت تمہاری چیزیں نہیں ڈھونڈ سکتی۔''

''پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے' کام چور کہیں کی' ہڈ حرام......!''

''ٹھیک ہے' میں جا رہی ہوں امی کے ہاں...... جب عقل ٹھکانے آئے' تب آ کر لے جانا' ورنہ سڑتے رہنا اس چھوٹے سے ڈربہ نما فلیٹ میں' اُونہہ......'' وہ پرس اُٹھا کر باہر نکلتی' کسی آتے ہوئے رکشا کو ہاتھ دے کر' دانیال کے جانے سے پہلے ہی اپنے گھر پہنچ جاتی۔

ایسی ہی بے شمار لڑائیوں کی روداد رابعہ آپا نے اُسے سنائی تھی۔

مگر آج جس لہجے میں انہوں نے اُس سے بات کی تھی' وہ خاصا تحقیر بھرا تھا۔

اچھا بھلا موڈ' تہس نہس ہو کر رہ گیا تھا' گھر آ کر وہ بستر پر ڈھے سی گئی' فاروق کے چلے جانے سے' اس کی کتنی جگ ہنسائی ہوتی تھی۔ رابعہ آپا نے اُسے کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا۔

بھابیاں ڈھکے چھپے انداز میں اکثر اس سے کہہ دیا کرتی تھیں کہ شوہر کو نبھانا آسان کام نہیں ہوتا' ہر مرد شوہر بن کر ایک اڑیل گھوڑا بن جاتا ہے' جس کو رام کرنا کوئی اتنا آسان نہیں ہوتا۔

شائد میرا فیصلہ ہی غلط تھا' ورنہ آفس میں زبیر بھی اُس سے شادی کرنے کا خواہاں تھا' اُس کی سوچیں اُسے کچوکے دے رہی تھیں۔

جو ذلت نصیب میں ہو' وہ ملتی ضرور ہے' اگر میں زبیر سے شادی کرتی۔ وہ بھی فاروق جیسا

ہو جاتا۔ میرے مقدر میں یہ رسوائیاں لکھی تھیں' تو ملنی تو ضرور تھیں' اب آنسو ایک پرنالے کی صورت میں بہہ رہے تھے' اور ہچکیوں نے سارے جسم کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

کال بیل کی آواز نے بھی اُسکے تسلسل کو نہیں توڑا' وہ یونہی تڑپ تڑپ کر روتی رہی' آج رابعہ آپا کے لہجے نے اُسے پاتال میں لا پھینکا تھا' ان کے جملے اُسے کوڑوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔

اب کوئی آنے والا دروازے پر مسلسل دستک بھی دے رہا تھا' جب یہ دستک تواتر سے جاری رہی تو وہ چوکنا سی ہوئی' آنسو پونچھتے ہوئے جب دروازہ کھولا تو فاروق پریشان سا کھڑا تھا' اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا' اور شائستہ اپنی خوشی اور غم کی کیفیتوں پر قابو نہ رکھتے ہوئے ایکدم بے ہوش ہو کر گر ہی پڑی۔ فاروق اُسے بازوؤں میں تھام کر اندر لے آیا۔

''کیا ہوا؟ شائستہ!......'' وہ اُسے ہوش میں لا کر پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں' آپ کے جانے پر' لوگ جیسی باتیں بناتے ہیں' وہ ابھی تک برداشت نہیں کر پاتی ہوں۔''

''معلوم تو ہو' کس نے کیا کہا ہے؟'' وہ متفکر سا پوچھ رہا تھا۔

''ہر کسی نے کچھ نہ کچھ کہا ہے...... ہر شخص نے اپنے انداز سے ایک کہانی ترتیب دی ہے۔ جانے سے پہلے' کم از کم آپ کو بھی یہ سوچنا چاہیے تھا' کہ اس معاشرے میں ایسی عورتوں کو لوگ کن نظروں سے دیکھتے ہیں' جو نہ صحیح طرح سے بسی ہوتی ہیں' اور نہ ہی وہ اجڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

ایسے لوگ کسی قدر بیوہ اور مطلقہ سے ہمدردی کر سکتے ہیں مگر' مجھ جیسی عورتوں سے نہیں' جنہیں خود یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان پر الزام کیا ہے......؟''

''بس دماغ خراب ہو گیا تھا میرا' اس وجہ سے چلا گیا تھا۔'' وہ محجوب سا ہو کر بولا۔

''یہ سوچے بغیر آپ چلے گئے کہ میرا کیا ہو گا......؟''

''ہاں زیادتی ہوئی ہے تمہارے ساتھ' بس' میرے ذہن میں نجانے یہ بات کیوں آ گئی تھی کہ تم نے اپنا ابارشن جان بوجھ کر کروایا تھا۔

''کیا میں سیڑھیوں سے بھی جان بوجھ کر گری تھی؟'' شائستہ نے پوچھا۔

''میرا خیال تھا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔''

''پھر اب میری سچائی پر یقین کیسے آ گیا' ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنی کوکھ خود ہی اجاڑی ہو......'' شائستہ کا لہجہ گلوگیر سا ہو گیا۔

''نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا' میرے ذہن میں یہ خیال نصرت نے ڈالا تھا۔ وہی نصرت جو

ہمارے آفس میں کام کرتی تھی' اور مجھ سے شادی کرنے کی خواہاں تھی۔''

''تو کیا نصرت نے اعتراف کر لیا' جو تم یوں واپس آ گئے ہو......'' شائستہ کی جرح جاری تھی۔

''نہیں بھئی۔ میرے دل نے مجھے خود سمجھا دیا ہے' مجھے تمہاری باتوں پر یقین ہے' میں بدگمان ہو گیا تھا' اس لئے تو یہ چھ مہینے کا بن باس کاٹ کر آیا ہوں۔'' وہ اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''مجھ سے نہیں پوچھیں گے آپ' کہ میں نے یہ وقت کیسے گزارا ہے اور آج رابعہ آپا نے مجھے کیا کچھ کہہ دیا ہے......'' تب آنسوؤں کی ہمراہی میں وہ آج کی ایک ایک بات اُسے سناتی چلی گئی۔

''پلیز شائستہ' مجھے معاف کر دینا' اب میں آ گیا ہوں' میں خود جاؤں گا رابعہ آپا کے پاس' اور انہیں بتاؤں گا کہ شائستہ جیسی بیوی قسمت والوں کو ملا کرتی ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں جانے کی۔ انہوں نے مجھے بے حد ذلیل کیا ہے۔ کوئی اس طرح بات کرتا ہے کسی سے جس طرح انہوں نے مجھ سے کی۔''

''جب بندہ پریشان ہو' تو اس کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دے پاتا اور ایسے میں زبان فاسد مواد ہی بہاتی ہے۔ وہ شازی کی طرف سے پریشان تو ہیں ناں۔'' وہ اُسے رسان سے سمجھا رہا تھا۔

''مگر اس میں میرا کیا قصور......؟ کیا میں نے انہیں بتایا نہیں تھا۔ کہ میں دانیال کو نہیں جانتی' کیا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بیٹی کس مزاج کی ہے۔ اس کے باوجود...... دوسروں کو الزام دینا کوئی اچھی بات ہے کیا۔''

''جان...... دوسروں کو الزام دینا سب سے آسان کام ہوتا ہے' اسی لئے زیادہ تر لوگ یہی کام کرتے ہیں۔'' فاروق اُسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

''مگر میں نے تو آپ کو کوئی الزام نہیں دیا' وہ گھر جہاں سے ہم نے اپنی نئی زندگی کی ابتداء کی تھی' اُسے چھوڑ کر بھی نہیں گئی۔ اور......''

''بس' اب ان دنوں کی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' اُس نے بات کاٹتے ہوئے' پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا......!

اور پھر واقعی ان دونوں نے اس موضوع پر بات نہیں کی۔

شائستہ اور فاروق کے آفس قریب قریب ہی تھے' دونوں ساتھ جاتے اور ساتھ ہی واپس آتے' فاروق اس کا حد سے زیادہ خیال رکھ رہا تھا۔

تب ایک شب بھابی نے' فاروق کا والہانہ انداز دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنے چاہنے والے شوہر کم کم ہی دکھائی دیتے ہیں شائستہ تم تو بڑی لکی ہو۔''

اور وہ من ہی من میں مسکرا رہی تھی کہ لوگوں کے نظریات کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔ ورنہ یہی بھابی کیسی کیسی مثالیں دے کر اس کے ذہن کو ڈسٹرب کیا کرتی تھیں۔

اُدھر رابعہ آپا کی شازی کے ہاں ہر وقت کی لڑائیاں تھیں۔ جب دیکھو شازیہ لڑ جھگڑ کر میکے جا بیٹھی تھی۔ بہن بھائی سب سمجھا سمجھا کر اُسے سسرال چھوڑ آتے اور کچھ عرصے بعد پھر وہی جھگڑے سر اُٹھاتے۔

اس کی آفس کولیگ مسز بیگ اگر کبھی شازیہ کی راستہ میں کوئی بات اُسے سناتی' تو وہ انتہائی غیر دلچسپی سے سنتی۔ یا اُٹھ کے چل دیتی۔

فاروق اُسے بتائے بغیر' ایک دفعہ رابعہ آپا کے پاس ہو آئے تھے' بقول ان کے' کہ سب کے مزاج بھی صاف کر آئے تھے۔ رابعہ آپا نے فاروق سے کہا تھا کہ شائستہ کو لے کر گھر آئے' مگر یہ بات سن کر ہی اُس نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

''سنئے' یہ بات میں آپ سے آخری بار کہہ رہی ہوں' کہ آپ مجھے اس گھر میں جانے کیلئے نہیں کہیں گے' جہاں مجھے ذلیل کیا گیا۔''

''میری جان باتوں کو بڑھاتے نہیں ہیں۔''

''میں نہیں بڑھا رہی ہوں۔''

''تو پھر ناراضگی بھی ختم کر دو۔''

''ختم کر دی ہے۔''

''اب آپا' اتنی محبت سے تمہیں بلا رہی ہیں' تو پھر......''

''میں نے کہہ دیا ناں' کہ اب میں ان سے کسی قسم کا کوئی بھی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی......'' فاروق نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔

مگر آج اچانک ہی' بغیر بتائے' بغیر کسی اطلاع کے رابعہ آپا اس کے فلیٹ پر آ گئی تھیں' اور اس سے معافی تک مانگ بیٹھی تھیں۔

اور وہ اپنا تمام تر غصہ بھول کر' شازیہ کیلئے پریشان ہو گئی تھی۔

فاروق جب باہر سے آیا' تو اس نے پہلی بات یہی کی۔

''دانیال کا آفس' آپ کے آفس کے قریب ہی ہے' آپ اس کے پاس جا کر کیوں نہیں سمجھاتے ہیں' کہ اپنی بیوی کے ساتھ سکون سے رہنا سیکھے۔''

''میں کیوں کہوں' میں اس کا ایڈوائزر رہوں؟''

''رابعہ آپا اتنی پریشان ہیں' آپ کو جانا چاہئے ناں۔''

''اوہ یہ بات ہے۔'' گھڑی کی چوتھائی میں فاروق کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔

''آج رابعہ آپا آئی تھیں' ہمارے گھر......؟''

''ہاں۔''

''تمہاری دوستی ہوگئی ان سے......'' وہ متبسم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''ہاں ہوگئی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''اب تو تم پریشان ہو رہی ہوگی شازیہ کے لئے۔'' وہ ہنسا۔

''ظاہر ہے' وہ میری بھانجی ہے' اس کی شادی اس لئے تو نہیں ہوئی' کہ رابعہ آپا اس کے دکھ دیکھیں۔''

''تم اپنی آپا سے کہو کہ اپنی بیٹی کو سمجھائیں' دانیال سے میری ملاقات ہوتی رہتی ہے' اس معاملے میں اس کا قصور نہیں ہے۔''

''کیا مطلب ہے......؟'' اب حیران ہونے کی باری اُس کی تھی!

''اس کا کہنا ہے کہ اس لڑکی میں ذرہ بھر لچک نہیں ہے' جو وہ چاہتا ہے' وہ کسی صورت مان کر نہیں دیتی' ایک مرتبہ ان کی دوستی دو ماہ تک صرف اس وجہ سے رہی کہ دانیال اپنے دفتر کے کام سے دو ماہ کیلئے دوسرے شہر گیا ہوا تھا' اور جیسے ہی وہ آیا' وہ ایک ہفتے بعد ہی لڑ بھڑ کر اپنے گھر جا بیٹھی۔''

''رابعہ آپا کو سمجھانا چاہیئے' اس کی غلطیوں کا احساس دلانا چاہیئے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''شاید وہ ان ماؤں میں سے ہیں' جنہیں اپنی بیٹی کی کوئی خامی دکھائی نہیں دیتی...... وہ ہر اچھے اقدام کی توقع اپنے داماد سے چاہتی ہیں۔''

''یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' وہ پریشان سی ہوگئی۔

''کیا کریں اب پچھتر فی صد گھر لڑکیوں کے انکی مائیں اجاڑ رہی ہیں۔'' فاروق کہہ رہا تھا۔

''یہ تو نادانی کی بات ہے۔''

''وہ اسے اپنی عقل مندی سمجھتی ہیں' تو کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''میں سمجھا دوں گی' شازیہ کو اپنے فیصلے خود کرے' سوچ سمجھ کر۔''

مگر جب وہ دونوں رابعہ آپا کے ہاں پہنچے' تو شازیہ نے رو رو کر دانیال کی زیادتیاں سنا

ڈالیں۔

''میں نے دانیال سے کہا تھا کہ تمہارے گھر والوں نے میری کوکھ باندھ دی ہے۔

وہ تمہیں تو گھر میں باندھ کر نہیں رکھ سکے' کوکھ باندھ دیں گے! وہ دہاڑ کر بولا تھا۔

ہونہہ...... مجھے کیوں باندھیں گے......؟

ہر وقت واہی تباہی جو گھومتی ہو۔

یہ خواہ مخواہ کا بہتان ہے...... کہاں گھومتی ہوں میں!

میں تو جب بھی فون کرتا ہوں' کہیں نہ کہیں گئی ہوتی ہو۔

میں سب جانتی ہوں' یہ سب باتیں جڑی ہوں گی۔ تمہاری مطلقہ بہن نے' مجھے معلوم ہے کہ شہلا باجی کی عادت کیسی ہے' ہر وقت ہر ایک کی جاسوسی میں لگی رہتی ہیں' ایک شام میں نہا کر آئی تو کہنے لگیں' آ گئیں پڑوسن کے پاس سے' وہی رہتی ہیں ہر وقت میری ٹوہ میں' میں نے انہیں جتایا' تو وہ چیختے ہوئے بولا۔

کہ میں کسی ایک شام کی بات نہیں کر رہا' میں تو جب بھی گھر فون کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں مٹرگشت پر نکلی ہیں' گھر میں تو تمہارا تلوا ٹکتا ہی نہیں ہے۔

ظاہر ہے زچ ہو کر' میں نے یہی کہنا تھا۔

اچھا' میری مرضی' پھر' تمہیں اس سے کیا؟

پھر کیا' یونہی رہنا' بے مہاری' ایسی عورتوں کو اللہ اولاد کبھی نہیں دیتا۔ اور مجھے لگتا ہے کہ تم بھی یونہی بے نیل و مرام سی رہو گی۔ اجڑی اور سوکھی کوکھ لے کر...... وہ بددعائیں بھی دیتا رہا...... کوستا رہا......'' اب شازیہ بے طرح رو رہی تھی' رابعہ آپا' اس کی باتیں سن کر اس سے زیادہ آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ دانیال بے حد بدتمیز انسان ہے۔

''شازیہ اب یہ سب باتیں ختم کرو' میاں بیوی کا جھگڑا ہوتا ہے' تو کسی کو تو صلح کی پہل کرنی ہوگی۔'' شائستہ نے اُسے سمجھایا۔

''میں اتنی بے غیرت نہیں ہوں' کہ خود سے اُس کے پاس چلی جاؤں۔'' وہ تکبر سے بولی۔

''ہاں' ہاں' کمی نہیں ہے' کھانے کی' پینے کی' میری لاڈوں پلی بیٹی ہے۔'' رابعہ آپا' بیانات کے ساتھ آنسو بھی بہا رہی تھیں۔

''آپا پلیز آپ اس معاملے میں مت بولیے' شازیہ کو اپنے گھر میں جانے دیجئے' میاں بیوی کے رشتے میں انا کا کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہئے' یوں بھی پہل تو کسی نہ کسی کو کرنی ہوگی۔ اب اگر دانیال ضد میں آ رہا ہے تو یہ پہل شازیہ ہی کیوں نہ کرے۔''

"شائستہ باجی! آپ دانیال کو نہیں جانتیں' بے حد بدفطرت۔" میں چلی جاؤں گی تو بعد میں مجھ سے کہے گا۔ آ گئیں' تمہاری اماں سے رکھا نہیں گیا۔ خرچ برداشت نہیں ہوا' دھکیل دیا پھر انہوں نے تمہیں میرے گھر' وہ اس قدر مجھے ذلیل کریں گے' اشتعال دلائیں گے کہ توبہ بھلی۔"

"پلیز' شازیہ! اگر تم اپنا گھر بسانا چاہتی ہو' تو اچھی اچھی باتیں یاد کرو' تم بھی اس سے یہ وعدہ کر لو' کہ آئندہ کوئی ایسی بات نہیں ہونے دوگی' جو اُس کو ناپسند ہو' اور میں اُسے بھی سمجھاؤں گی کہ ایسا ہی وعدہ وہ بھی تم سے کرے۔

اور سب سے اہم بات یہ کہ اختلاف ہونے کے باوجود' تم ناراض ہو کر اپنے میکے نہیں آؤ گی۔ کہ اب اصل گھر تمہارا وہی ہے۔" شائستہ کسی شفیق استاد کی طرح اُسے سمجھا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے باجی! مگر آپ لوگ مجھے چھوڑ کر آئیے گا' میں خود سے نہیں جاؤنگی۔" شازیہ پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ہوا ہی تھا۔

"میں تو کہتی ہوں' کہ تم کورٹ کے کاغذ پر' اس سے شرطیں لکھوا لینا' ہم سیدھے سادے لوگ تھے' شادی کے وقت دانیال سے کچھ لکھوایا ہی نہیں۔" اب رابعہ آپا کا ذہن دوسری باتیں سوچ رہا تھا۔

"پلیز آپا' اس طرح کی باتیں کسی بھی کامیاب زندگی کی ضمانت نہیں ہیں' دل کے کاغذ پر جو رقم ہو' وہ زیادہ بہتر ہے۔ یوں بھی میاں بیوی کا رشتہ تمام تر شرطوں سے ماورئی ہوتا ہے۔"

"مجھے نہیں لگتا' کہ ان دونوں کی لڑائیاں کبھی رک سکیں گی۔ دونوں کو ہی ایک دوسرے سے ہمہ وقت شکائتیں رہتی ہیں۔ دونوں ہی بدتمیز ہیں نہ یہ اپنی غلطی مانتی ہے اور نہ وہ۔" شازی کی بڑی بہن نے پہلی دفعہ اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"میاں بیوی دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کدورت نہیں رکھتے' اب کے تم جا کر سب سے پہلے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لینا' دانیال بھی کرے گا' پھر دل صاف ہونے کے بعد کبھی لڑنا ہی نہیں......" شائستہ اُسے بڑے پیار سے سمجھا رہی تھی۔

"باجی کوشش ضرور کرونگی' مگر دانیال ایسی ٹیڑھی لکیر ہے کہ آپ لوگ سوچ نہیں سکتے۔"

"ہر مرد ٹیڑھی لکیر ہوتا ہے' سانچے میں ڈھلے ہوئے نیک اور عمدہ شوہر کس کو ملتے ہیں۔" وہ ہنسی۔

ماحول قدرے تبدیل ہو گیا تھا' کھانا بھی سب نے خوب مزے لے کر کھایا' آج شائستہ کو دلی سکون اور طمانیت کا احساس ہو رہا تھا کہ اس گھرانے میں وہ آنے کی عرصے سے عادی تھی' اور رابعہ آپا بھی اس سے بڑے چاؤ سے ملتی تھیں۔

"شازی کل بلیک سوٹ پہننا' جو تم نے میرے ساتھ بوتیک سے خریدا تھا۔"

"وہ تو کب کا ٹائیں ٹائیں فش ہو چکا ہے۔" وہ ہنسی۔

"اچھا' وہ ڈارک پنک جارجٹ کا سوٹ' میرے بعد تم لائی تھیں' جس پر گہری جامنی امبرائنڈری ہوئی ہے۔"

"ہاں' وہ ابھی نہیں پہنا' بلکہ الماری میں نیچے دب گیا' اس وجہ سے نہیں پہن سکتی تھی۔" وہ ہنسی۔

اس کے ساتھ میچنگ جیولری اور مناسب میک اپ بھی اب شائستہ راز داری سے اس کے کانوں میں کہہ رہی تھی۔

"آپ چاہتی ہیں کہ میں چوتھی کی دلہن کی طرح تیار ہو کر جاؤں۔"

"کیا مضائقہ ہے' شوہر کیلئے اپنے آپ کو سجانا' سنوارنا' کوئی گناہ تو نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' فرسٹ کلاس تیار ہو جاؤنگی' مگر آپ لوگ چھوڑ کر آئیں گے۔"

"او کے' تم گھبراؤ نہیں' آخر اپنے گھر میں جا رہی ہو۔" شائستہ نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔

شائستہ اور فاروق اُسے چھوڑ کر گھر واپس آ گئے تھے' بظاہر دانیال نے ان سب کا سواگت انتہائی خوش دلی سے کیا تھا۔ ان دونوں کو چائے پر رکنے کیلئے بھی کہا تھا' مگر وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے تھے۔

"دانیال! میں تم سے اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی چاہتی ہوں۔" شازیہ نے اپنے بیڈ روم میں آ کر' سب سے پہلی بات یہی کی۔

"شازیہ! کیا ہماری ساری زندگی یونہی معافی تلافی میں گزرے گی؟" دانیال بڑے حزن و ملال سے کہہ رہا تھا۔

"آج مجھے اعتراف کرنے دو' تا کہ میرا دل و دماغ کبھی اس نہج پر سوچ تک نہ سکے۔" شازیہ کا لہجہ بھی گلوگیر ہو گیا۔

"کہو تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" وہ خالی الذھن سے انداز میں اس کی جانب دیکھ کر بولا۔

"دانیال تم مجھے معاف کر دینا' کہ میں جان بوجھ کر تمہارے رشتہ داروں کی تقریبات میں جانا پسند نہیں کرتی۔ میں نے تمہاری آپا کی شادی کی سالگرہ میں درد کا جو بہانہ بنایا تھا وہ جعلی تھا۔"

"مگر تم...... تم تو مچھلی کی طرح پلنگ پر تڑپ رہی تھیں۔" وہ حیرت سے بولا۔

"میں کالج میں بہترین اداکارہ کا میڈل حاصل کر چکی ہوں نا۔"

''اوہ یہ بات ہے۔'' دانیال نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اور اس شام کو جو میں چکر کھا کر گری تھی' جب آپ میرے بنا اپنے دوستوں کے ساتھ سوات جا رہے تھے' وہ بھی ڈھکوسلا تھا۔

اور جب میں نے رو رو کر آپ کو بتایا تھا' کہ میرا پرس کوئی اچکا چھین کر چلتا بنا' وہ بھی سب جھوٹ تھا' دراصل آپ سے میں نے پانچ ہزار مانگے تھے' اور آپ نے دیئے نہیں تھے۔ تب آپ سے پیسے اینٹھنے کیلئے میں نے یہ ڈرامہ رچایا تھا......'' اوہ یہ بات تھی اُس نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

''اور ایک دن جب آپ کو دفتر سے روکنے کیلئے میں نے اپنے آپ پر 104 بخار چڑھا لیا تھا' وہ بھی غلط تھا۔ مجھے کوئی بخار وخار نہیں تھا۔'' وہ ہنسی۔

''مگر تمہارا بخار تو تھرمامیٹر سے میں نے خود چیک کیا تھا۔''

''ہاں ضرور کیا تھا' مگر جب آپ تھرمامیٹر لینے گئے تھے۔ میں نے گرما گرم چائے کا مگ فوراً پی لیا تھا' ظاہر ہے کہ جب گرم منہ تھرمامیٹر لگایا جائے گا تو ٹمپریچر تو آنا ہی تھا۔ وہ پھر ہنسی۔ شکر تو میں نے کیا کہ کہیں 200 یا 250 درجے بخار ہوتا تو؟''

''اور میں بے وقوف بنا' تمہارے ٹھنڈے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتا رہا تھا۔'' وہ بولا۔

''اور وہ جو میرے پیر میں موچ آئی تھی' اور میں ایک ہفتے تک بستر سے نیچے نہیں اتری تھی۔ وہ بھی جعلی تھی۔''

''اور وہ پیر پر چڑھی پٹیاں......؟'' حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں......!

''میری ایک دوست ڈاکٹر بھی ہے۔ اُس نے ایسی پٹیوں کا شکنجہ سا بنا کر دے دیا تھا۔ جب آپ آنے والے ہوتے۔ اس کے اندر میں اپنا پیر ڈال لیا کرتی تھی۔''

''اف خدایا' ان دنوں میں کس قدر پریشان رہا تھا' تمہیں پکڑ کر واش روم تک چھوڑ کر آتا تھا' گود میں لے کر زینہ اتارتا تھا' چڑھتا تھا۔'' دانیال نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور کتنی ہی دیر وہ ساکت وصامت سا بیٹھا رہا۔

''سنیے...... اب آپ بھی اعتراف کر لیجئے' تاکہ ہم اپنی زندگی کی ہر غلطی اور ناراضگی سے دور رہ کر زندگی گزاریں۔ اُس نے اُس کے شانے سے سر ٹکا کر لاڈ سے کہا۔

''میں نے تو صرف ایک ہی غلطی کی ہے' مگر بے حد بھیانک غلطی......'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''میں آپ کو معاف کر دونگی......'' وہ ہنسی!

''تم معاف بھی کر دو...... مگر میں پھر بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا...... ہرگز معاف

نہیں کر سکتا۔ میری غلطی کوئی اتنی معمولی نہیں ہے' بہت فاش غلطی ہے۔''

''آخر ایسی کیا غلطی ہے۔'' شازیہ حیران تھی۔ شائد یہ دوسری شادی کر چکے ہیں۔ اور آج اس کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ ڈر رہے تھے۔

''کیا میرے علاوہ' کوئی دوسری عورت بھی آپکی زندگی میں آ چکی ہے۔'' اس نے لرزتے لہجے میں پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔''

''پھر آپ کو میری قسم' سچ سچ بتایئے' کہ آپ سے کیا غلطی ہوئی ہے۔'' اس نے دانیال کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر پوچھا۔

''تم سے شادی کرنے کی غلطی......'' وہ نادم سا کہہ رہا تھا۔

اور شازیہ اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی' اس کے اس اعتراف نے تو اس کا دل ہی کرچی کرچی کر کے رکھ دیا ہے......!

کاش وہ ایسا کڑوا سچ اُس سے نہ کہتا...... ایسی تذلیل تو اُس کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ دانیال کا یہ انگارہ بھرا جملہ وہ نہ اپنی ماں کو بتا سکتی تھی اور نہ ہی شائستہ باجی کو۔

❁❁❁

کرچیاں

ان دنوں اتنی مہنگائی کی مار نہیں تھی۔ اور نہ ہی اتنی ہر چیز میں آگ لگی تھی۔ مگر پھر بھی وہ شادی کے پانچ سال بعد تک بمشکل چھ ہزار روپے جمع کر پائی تھی۔

کتنی مشکلوں سے جمع ہوئے تھے...... یہ پیسے' یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

بہن کی شادی ہوئی تو دل پر پتھر رکھ کر صرف اس کو پچاس روپے دیئے...... ورنہ کتنا دل چاہ رہا تھا کہ اس کو ایک پیڈسٹل فین ہی دے دے۔

کیونکہ جس گھر وہ جا رہی تھی...... وہاں لائٹ تو تھی مگر کمرے میں چھت پر پنکھے نہیں لگے تھے۔

مگر اس نے تو اپنے لیے نئے کپڑے بھی نہیں بنائے تھے۔ اپنی شادی کے استعمال شدہ سوٹ ہی چلا لئے تھے...... جن پر بنے ہوئے جھوٹے کام بھی سیاہ پڑ چکے تھے...... مگر ان میں سہاگ کی خوشبو تھی...... ایک دل آویز مہک تھی جو اس کو مسحور کر دیتی تھی...... اس لیے وہ اُس کو اچھے لگتے تھے اس کے پہلے بھتیجے کی خوشی ہوئی تو صرف دس روپے وہ اس کے ہاتھ پر رکھ آئی......

حالانکہ اس کی بڑی ہتک ہوئی تھی...... بھاوج نے وہ نوٹ سب کے سامنے نچا کر کہا تھا بھئی یہ رقم پھوپھی کی طرف سے آئی ہے۔ مگر وہ نظر بچا کر باہر نکل گئی تھی۔

اس کی شادی خاصی کسمپرسی میں ہوئی تھی...... غریب ماں باپ کے ہاں کھانے کے ہی لالے تھے...... جہیز کہاں سے دیتے...... سونے کا ایک تار بھی اس کو نہ ملا تھا......!

ہکا سا لاکٹ کا سیٹ بَری میں چڑھا تھا۔ جس کو ہر وقت پہنے رکھتی تھی۔

اُس کا میاں نہ صرف ذہین تھا بلکہ محنتی بھی بہت تھا...... ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی استعداد بھی بڑھا رہا تھا تا کہ آئندہ ترقی کے چانسز اس کو بھی مل سکیں! وہ چھ ہزار جمع کر کے بہت خوش تھی۔

''سنیئے......! سونے کی چھ چوڑیاں آ جائیں گی نا......'' اُس نے وہ پیسے میاں کے سامنے دھرتے ہوئے خوشی سے کہا......! (ان دنوں آٹھ سو روپے تولہ سونا تھا)

آج اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ چوڑیوں سے کھنکتے ہوئے بازو کتنے خوب صورت لگتے

ہیں...... یہ سوچ ہی اس کے من میں کلی کھلا رہی تھی۔

''نجو......! ایک بات کہوں......!''

''ہوں......!''

''بُرا تو نہیں مانو گی......'' رشید نے افسردگی سے کہا۔

''ہاں...... ہاں...... کہو...... کیا بات ہے۔'' اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے جھوم کر کہا۔

رشید اس کی یہ کیفیت دیکھ کر کہتے کہتے رُک سا گیا......!

''بولو...... نا......'' وہ لاڈ سے بولی۔!

''کیا کہوں......'' اُسے خفت ہو رہی تھی۔!

''جان...... میں آج تمہاری کسی بھی بات کا بُرا نہیں مان سکتی۔''

''اچھا......!''

''ہاں...... اور کیا......'' وہ کھلکھلائی......!

''سنو...... مجھے روزانہ دفتر جانے میں' پھر شام کو کالج جانے میں بسوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے...... دیر بھی ہوتی ہے...... ٹائم بھی ضائع ہوتا ہے اور صلواتیں الگ سنتا ہوں۔

اگر تم کہو تو میں ان پیسوں سے سکوٹر خرید لوں! ٹائم کی بھی بچت ہو گی اور میں ایک آدھ ٹیوشن بھی پکڑ لوں گا...... تم سے وعدہ کہ میں تمہیں چوڑیاں ضرور بنوا کر دے دوں گا۔''

''جی......'' وہ ہکا بکا رہ گئی...... اس کے گلے میں پڑے ہوئے بازو بے جان ہو کر لٹک گئے......!

انگ انگ ناچتا وجود ڈھے کر رہ گیا۔!

''اگر تمہارا دل نہیں چاہ رہا تو رہنے دو......'' رشید اس کو خاموش دیکھ کر ناراضگی سے بولا......!

''ارے نہیں...... میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کیا ان پیسوں میں موٹر سائیکل آ جائے گی......؟'' اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

''ارے کیوں نہیں آئے گی...... میں نے تو کل ہی ریٹ معلوم کر لیے تھے...... پانچ ہزار چار سو کی بالکل نئی مل رہی ہے۔ چھ سو روپے تمہارے پھر بھی بچ رہے ہیں۔''

''یہ کرنا کہ بقیہ پیسوں میں دو نئے جوڑے تم بنا لو اور دو میں بنا لیتا ہوں۔''

''بھئی نئی اسکوٹر پر کہیں گھومنے جائیں گے تو لشکارے تو مارتے جائیں گے نا......!'' وہ

ہنسا......!

واہ...... کیا مزا آئے گا...... ایک ٹھوکر سے بائیک اسٹارٹ کروں گا...... تم میرے پیچھے تیار ہو کر بیٹھنا...... ایک بازو میرے کندھے پر...... اور میری کمر میں حمائل کرنا......'' تب وہ مارے خوشی کے کھلکھلا اُٹھا...... اور وہ اس کی خوشی دیکھ کر خود بھی مسکرا دی...... ایک اطاعت آمیز مسکراہٹ۔

فرمانبردار مسکراہٹ......! جو بیویوں کی معراج ہوا کرتی ہے......!

دس سال بعد اس نے چودہ ہزار روپے کی بچت کی......! کس قدر تو سلائیاں کی تھیں...... بُنائی الگ تھی...... ورنہ بچوں کے خرچ بڑھنے سے تو بچت کا تو سوال بھی نہیں پیدا ہوتا پیٹرول اور اسکوٹر کی ٹوٹ پھوٹ کے خرچے ہی الگ تھے۔ مگر ان دنوں خوشی کی خاص بات یہ تھی کہ راشد کی ترقی آفیسر گریڈ میں ہوگئی تھی۔

وہ اللہ کی بے حد شکر گزار تھی۔ دفتر کی طرف سے ایک صاف ستھرا سا فلیٹ بھی مل گیا تھا۔ زندگی اب قرینے سے گزرے گی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ چار چوڑیاں ضرور بنائے گی۔ آخر وہ ایک آفیسر کی بیوی ہے...... لوگوں میں ملنا ملانا بھی ہوگیا ہے چودہ ہزار میں چار چوڑیاں تو آ ہی جائیں گی۔ چوڑیاں اُسے بے حد پسند تھیں......!

ایک عورت کا تصور بنا چوڑیوں کے وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ جیسے کسی مرد کے داڑھی مونچھ نہ آئے تو وہ سب سے چھپتا پھرتا ہے۔

ایسے ہی وہ ننگے بازو سب سے چھپائے پھرتے پھرتے تھک چکی تھی۔!

ایک دن پھر وہ خوشی سے سرشار تھی' کھانے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔!

اپنے آپ کو بھی خوب سنوارا تھا۔

اللہ راشد کتنا خوش ہوگا جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں نے چودہ ہزار روپے چوڑیوں کے لیے جمع کر لیے ہیں۔ بیچارے کسقدر مجرم سے رہتے تھے کہ انہوں نے میری چوڑیاں نہیں بنائیں۔

بیچارے...... بناتے بھی کیسے......؟

بچوں کی تعلیم' بیماری پر خرچہ ہی اتنا ہوتا تھا کہ وہ غریب کیا کرتے......!

اسکوٹر کی آواز پر اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ ''آج اتنی دیر کیسے ہوگئی۔؟''

پہلے ٹائر پنکچر ہوا...... بعد میں ٹنکی سے پیٹرول لیک کرنے لگا...... ٹنکی ویلڈ کرانے گیا تو دیر ہوگئی......!''

''آیئے کھانا کھا لیجئے......'' دسترخوان پر اس نے کھانا چن دیا......!

''کوئی آ رہا ہے کیا......؟''

''نہیں۔! ہم جا رہے ہیں......!''

''کہاں۔؟''

''بازار......!''

''اچھا۔'' وہ چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔

اس سے جب زیادہ صبر نہیں ہوا تو کھانے کے دوران ہی اُٹھ کر' پیسے اٹھا لائی اور اس کے سامنے رکھ دیئے۔

''ہمارے ہیں۔'' وہ فخر سے بولی۔!

''کہاں سے آئے۔؟''

''بھئی میں نے بچت کی ہے۔!''

''اچھا...... کیسے کر لیتی ہو......'' وہ خوش دلی سے مسکرایا......!

''بس کر لیتی ہوں......'' وہ اترائی۔

''بڑی سلیقہ مند ہو یار......'' اس نے سگریٹ کا سارا دھواں خوش ہو کر اس کے منہ پر چھوڑا۔

! اور وہ کھلکھلا اُٹھی......!

''چلئے نا بازار......'' وہ اٹھلائی......!

''نجو......!''

''جی......!''

''ایک بات کہوں......؟''

''کہیئے...... بندی ہمہ تن گوش ہے......'' وہ ہنسی۔ ''جب سے میں آفیسر ہوا ہوں...... بڑے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔''

''ارے مسائل تو سرے ختم ہوگئے......!''

''نہیں نجو......! مسائل تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔''

''پھر ان سے کیا گھبرانا......'' وہ کچھ سہم کر بولی......!

''ارے گھبرا کون رہا ہے' میں تو اپنا ایک مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسا مسئلہ......؟''

''جب سے میں آفیسر ہوا ہوں' اسکوٹر پر بیٹھ کر دفتر جاتا ہوں تو بہت شرم آتی۔''

''شرم کیسی...... اپنی سواری ہے...... بسوں کے پیچھے تو نہیں بھاگتے......!''

''افوہ...... یہ بات نہیں ہے بھئی......!''

''پھر کیا بات ہے......؟''

''بھئی جب میں اسکوٹر پر بیٹھ کر جاتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ کتے پر بیٹھ کر بھونکتا ہوا آیا ہوں۔''

''ہش...... کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ......؟ ان لوگوں کو دیکھئے جن کے پاس اپنی سواری نہیں ہے۔''

''ان کو کیوں دیکھوں......'' وہ غصے سے بولا......!

''کیا حرج ہے......؟''

''بھئی میں ایک آفیسر ہوں...... میرے اپنے دفتر میں کلرک بادشاہ گاڑیوں میں آتے ہیں...... اور میں پھٹ پھٹ کرتا پہنچتا ہوں۔ پرانا اسکوٹر پیسے بھی خوب کھاتا ہے اگر بیس ہزار کی کوئی پرانی گاڑی مل جائے تو اس کے بہت فائدے ہیں۔''

''کیا فائدے ہیں۔؟''

''دفتر سے گاڑی رکھنے کے ڈیڑھ سو روپے اضافی پیٹرول کے نام سے ملنے لگیں گے۔''

''مگر میرے پاس تو صرف چودہ ہزار روپے ہیں۔!''

''دو، تین ہزار کا تو یہ اسکوٹر بھی بک جائے گا۔ اور وہ ڈھائی میرے پاس بھی ہیں۔ سچ نجو...... جب میں اسکوٹر پر تمہیں...... دو بچوں اور ایک ٹوکری کو لے کر کہیں جاتا ہوں...... ایمان سے بڑی ذلت محسوس کرتا ہوں......!''

''ابو...... آپ گاڑی خریدیں گے......!''

''ہاں بیٹا......!''

''ہم گاڑی میں بیٹھ کر سیر کیا کریں گے......!''

''بالکل......!''

''امی بھی......!''

''اور کیا...... وہ تو ہمارے ساتھ آگے بیٹھ کر پوری بیگم صاحبہ بن کر...... گھومنے جایا کریں گی......!''

''سچی ابو......!''

اور وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

تب وہ بھی ہنس پڑی...... مگر اس کی ہنسی میں چوڑیوں کی تمام کرچیاں تھیں۔

❀❀❀